

# آخری گناہ کی مہلت

طارق اسماعیل ساگر

Scanned & PDF By: Qamar Abbas

Email:qamarabbas277@gmail.com

## آخری گناہ کی مہلت

نیا ز علی سے زیادہ نیاز مند اور سیدھا سادا بندہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ عمر تو اس کی پچاس سے اوپر ہی ہو گئی۔ مگر صحت ایسی کہ جوان دیکھ کر شرماتے تھے۔ اُسے اس گاؤں میں آٹے پانچ چھ سال ہی گزرے تھے لیکن اپنے اخلاق اور خدا ترس طبیعت کے سبب گاؤں کے بچے بڑے سب ہی نیاز علی کے گردیدہ تھے۔ اپنے گھر ہی کے ایک کونے میں اُس نے کریمانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ ہفتے میں ایک دن وہ شہر جاتا اور دکان کے لیے سامان لے آتا۔

اس کی ایمان داری تھی یا پھر طہناز طبیعت کہ دیکھتے ہی دیکھتے نزدیک و دور کے دیہاتوں میں اس کی دکان نے خاصی شہرت پالی تھی۔ لوگ قریبی دیہاتوں سے ”نیاز دی ہٹی“ پر سامان لینے آیا کرتے نیڑے منافع ہی اتنا کم رکھا تھا کہ کوئی اور اتنے کم منافع پر دکان چلا ہی نہ سکتا۔

شاید اس کا سبب اس کا اکیلا ہونا رہا ہو۔

نیاز کا کوئی خاندان، گھر بار، مائی باپ، بیوی بچے کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کسی نے کبھی جاننے کی کوشش کی تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ لوگ اس کے متعلق خود ہی اندازہ قائم کر لیتے۔ کوئی کہتا اس کی منگیتر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کی بے وفائی کا اثر نیاز نے اتنی شدت سے قبول کیا کہ دوبارہ کبھی عورت کے نزدیک نہ پھٹکا۔ کوئی اس کی بیوی کے مرجانے کی کہانی سناتا۔ حقیقت کیا تھی؟ اس کا علم



نیاز علی کو تھا یا پھر خدا کی ذات کو۔

آہستہ آہستہ لوگوں نے اس کی ذات میں دل چسپی لینا ہی چھوڑ دی۔ اس مرتبہ جب وہ شہر گیا تو پانچ چھ روز کے بعد واپس لوٹا۔ گاؤں بھر میں پھر چرمیگوٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن نیاز نے اپنے گاہکوں کو بتایا کہ وہ دراصل دمڑی شاہ کے عرس پر چلا گیا تھا۔ اس نے کوئی منت مان رکھی تھی جسے پوری کرنا چاہتا تھا۔ شہر سے واپس لوٹے اُسے دوسرا دن تھا۔ جب لوگوں نے پہلی مرتبہ پولیس کا ایک ٹرک اور ایک جیپ اس طرف آتے دیکھی۔ اس سے پہلے گاؤں میں اول تو پولیس آتی ہی نہیں تھی۔ اگر تھانے والوں کو کوئی شخص مطلوب ہوتا تو نمبردار کو اطلاع بھیج دی جاتی اور پولیس کے دو تین سپاہی اس کے ڈیرے پر آکر متعلقہ شخص کو تھانے لے جاتے۔

اتنی تعداد میں پولیس کو دیکھ کر گاؤں والے دہشت زدہ ہو گئے۔ نمبردار جو کسی کام سے کچھ ہی جا رہا تھا۔ سہم کر ٹرک گیا۔ جیپ اس کے مکان کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ جب کہ ٹرک سے اترنے والے پولیس کے جوانوں نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

”کیا بات ہے انسپکٹر صاحب؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ نمبردار نے ہمت کر کے انسپکٹر سے دریافت کیا۔

”نبی خان مجھے افسوس ہے آج اس گاؤں کی پرانی ریت ٹوٹ رہی ہے لیکر میں مجبور ہوں۔ ہمیں ایک خطرناک مفور قاتل کو گرفتار کرنا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”نیاز علی“ انسپکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟“ نمبردار کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”ہاں؟“ انسپکٹر نے کہا۔ ”لیکن ایک بات خیال رکھنا کہ پولیس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش پر میرا دماغ خراب بھی ہو سکتا ہے۔“



کسی اور موقع پر اگر تھانیدار اس لمحے میں بات کرتا تو نبی خان اس کی تسلی کروا کر ہی واپس لوٹا تا وہ کوئی ایسا گرا پڑا نمبر دار نہیں تھا۔ سو ڈیڑھ سو مربع زمین کا مالک تھا اور غیر داری بھی پشت در پشت اُن کے خاندان کو منتقل ہوتی آرہی تھی۔ لیکن پولیس کی تعداد اور انسپکٹر کے رویے نے اسے خاموش رہنے ہی کو مصیبت جلتے پر مجبور کر دیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔ ضرور تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ غصے سے کھولتے ہوئے نمبر دار نے انسپکٹر سے کہا۔

دونوں پانچ مسلح سپاہیوں کے ساتھ نیاز علی کو دکان پر پہنچے۔ نیاز علی نے پولیس کو اس طرف آتے دیکھ کر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ سب لوگ دکان کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

”اتنا جلوس ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی تھانیدار!“ نیاز علی نے کہا۔ ”میں آج شام تک خود ہی پیش ہو جاتا۔ کیونکہ میرا کام اب ختم ہو گیا ہے۔ پولیس کبھی میری گرد کو بھی نہ چھو سکتی۔ تم جانتے ہو میں پولیس کے اس جلوس سے ڈرنے والا نہیں لیکن میں اب خون خرابہ نہیں چاہتا۔“

نیاز علی کے سامنے انسپکٹر لیول سر جھکائے کھڑا تھا۔ جیسے وہ خود مجرم ہو۔ ”نمبر دار صاحب! اس گاؤں میں پولیس آنے کا مجھے افسوس ہے لیکن سب لوگ جانتے ہیں۔ میں نے یہاں کیسی زندگی گزاری ہے۔ میں اس کھیل کو آج شام کو ختم کر دیتا۔ لیکن یہ لوگ کارگزاری دکھانے کے شوق میں صبح ہی کو چلے آئے۔ بہر حال مجھے افسوس ہے اور میں آپ سے اور سارے گاؤں سے معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے نمبر دار نبی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”نیاز علی تم...“ نمبر دار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا

”نہیں نمبر دار صاحب! یہ میرا آخری بہروپ تھا۔ میرا نام بہاول خان ہے۔ باقی سب کچھ آپ کو پولیس والے بتا دیں گے۔“



اتنے میں گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ نیاز علی کے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میاں جی میرا مکان اور دکان آپ کی ملکیت ہے۔ اگر زندہ رہا تو شاید واپس آجاؤں۔“

”ہم تلاشی لیں گے انہیں پکڑنے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔  
”شوق سے“ نیاز علی بولا۔

مولوی صاحب اور نمبردار ایک ٹک اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ انپکٹر کے اشارے پر پولیس کے ایک جوان نے نیاز علی کو ہتھکڑی پہنادی اور باقی لوگ اس کے مکان اور دکان کی تلاشی لینے لگے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ خالی ہاتھ باہر آگئے۔ وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی جو پولیس کے لیے باعث دلچسپی ہوتی۔

گاؤں کے لوگ اب وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ نیاز علی دراصل مفرد بہاول خان ہے۔ وہ لوگ اسے اب بھی بے گناہ اور وہی سیدھا سادا دکاندار ہی جان رہے تھے۔

بہاول خان میں تمہیں پیر چن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔“  
انپکٹر نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد نیاز علی پولیس کی معیت میں گاؤں سے چلا گیا۔  
میں اس واقعے کے اگلے روز گاؤں پہنچا۔

میں اس گاؤں کا رہنے والا تو نہیں تھا۔ لیکن یہاں ہماری کچھ زمین تھی جس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کبھی کبھی یہاں آجاتا۔ میری نیاز علی سے کچھ زیادہ ہی دوستی تھی اور اس کا سبب وہ لوگ داستانیں تھیں جو وہ مجھے اکثرایت گئے تک سنایا کرتا۔ نیاز علی نے مجھے ہمیشہ بیٹوں کی طرح جانا۔ ایک آدھ مرتبہ وہ ہمارے شہر والے خرمیں بھی آیا تھا۔ میرے والد صاحب جو اکثر بیمار رہتے تھے۔ اس سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ مجھے کئی دفعہ دوبارہ ملاقات کے لیے کہہ چکے تھے۔

گاؤں پہنچ کر جب مجھے علم ہوا کہ نیاز علی تو ایک مفرد قاتل تھا۔ جسے پولیس چن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ہے تو میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ یہاں کوئی بھی اُسے قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔

میں جب بھی گاؤں آتا۔ دو تین روز گزار کر ہی جایا کرتا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے ایک رات بھی کانٹوں کی سیج پر گزار دی۔ اگلے ہی روز میں مولوی صاحب کو مل کر رخصت ہو گیا۔ وہ رخصت مولوی صاحب نے پُر زور تھاناکا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو اُس سے ملاقات کر کے اصلیت جاننے کی کوشش کروں۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ سب نیاز علی کے لیے آخری حد تک قانون کی جنگ لڑیں گے۔

مولوی صاحب سے چونکہ اُس کی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے ان کا یہ اصرار رہا کہ میں پولیس ریماڈ کے دوران ہی اُس سے ملاقات کروں۔

میرے والد ریماڈ پولیس آفیسر تھے اور مولوی صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنے سابقہ اثر و رسوخ سے کام لے کر میری اور نیاز علی کی ملاقات کا اہتمام کرادیں گے۔ وہ نہ بھی کہتے تو بھی میں نیاز علی سے ضرور ملتا۔

میں انہیں مطمئن کر کے واپس لوٹ آیا۔ اتنی جلدی گاؤں سے واپس لوٹنے پر والد صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے سبب دریافت کیا تو میں نے انہیں تازہ واقعے سے آگاہ کر دیا۔

والد صاحب نے اپنے ذہن پر زور دے کر بتایا کہ بہاول خان نامی ایک شخص واقعی مفرد رہا ہے۔ اُس کا نام انہوں نے کسی مٹھانے میں سُنا تھا۔ لیکن اُس کی کوئی تصویر پولیس کے ریکارڈ میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اُسے پہچانتے نہیں ہیں۔

میں نے کہا اول تو وہ کوئی اشتہاری نہیں۔ اگر ہے تو ضرور اس کا کوئی سبب ہوگا۔



آفری  
میرے باپ نے

گاؤں پہنچ کر جب مجھے علم ہوا کہ نیاز علی تو ایک مفرور قاتل تھا۔ جسے پولیس چن شاہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی ہے تو میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ یہاں کوئی بھی اُسے قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔

میں جب بھی گاؤں آتا۔ دو تین روز گزار کر ہی جایا کرتا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے ایک رات بھی کانٹوں کی سیج پر گزار دی۔ اگلے ہی روز میں مولوی صاحب کو مل کر رخصت ہو گیا۔ وہ رخصت مولوی صاحب نے پُر زور تقاضا کیا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو اُس سے ملاقات کر کے اصلیت جاننے کی کوشش کروں۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ سب نیاز علی کے لیے آخری حد تک قانون کی جنگ لڑیں گے۔

مولوی صاحب سے چونکہ اُس کی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے ان کا یہ اصرار رہا کہ میں پولیس ریٹائرڈ کے دوران ہی اُس سے ملاقات کروں۔

میرے والد ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھے اور مولوی صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنے سابقہ اثر و رسوخ سے کام لے کر میری اور نیاز علی کی ملاقات کا اہتمام کرادیں گے۔ وہ نہ بھی کہتے تو بھی میں نیاز علی سے ضرور ملتا۔

میں انہیں مطمئن کر کے واپس لوٹ آیا۔ اتنی جلدی گاؤں سے واپس لوٹنے پر والد صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے سبب دریافت کیا تو میں نے انہیں تازہ واقعے سے آگاہ کر دیا۔

والد صاحب نے اپنے ذہن پر زور دے کر بتایا کہ بہاول خان نامی ایک شخص واقعی مفرور رہا ہے۔ اُس کا نام انہوں نے کسی جھٹانے میں سنا تھا۔ لیکن اُس کی کوئی تصویر پولیس کے ریکارڈ میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اُسے پہچانتے نہیں ہیں۔

میں نے کہا اوّل تو وہ کوئی اشتہاری نہیں۔ اگر ہے تو ضرور اس کا کوئی سبب ہوگا۔



جو میں ضرور جان کر رہوں گا۔

والد صاحب نے پولیس والوں کی طرح پہلے تو مجھے ایسے اشتہاری سے دیکھ رہے تھے کی نصیحت کی لیکن بالآخر میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ دوران ریمانڈ انہوں نے مجھے نیاز سے ملنے کی اجازت نہ دی۔ جب اس کا پولیس ریمانڈ ختم ہو گیا اور اسے جیل بھیج دیا گیا تو میں اس سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ والد صاحب کا کوئی دوست تھا۔ اس نے مجھے خصوصی ملاقات کی اجازت دے دی۔ میں جب جیل کی کوشٹری میں اس سے ملنے پہنچا تو اچانک مجھے وہاں دیکھ کر نیاز علی حیرت زدہ رہ گیا۔

”تم یہاں؟“ — نیاز علی نے کہا۔ ”بیٹا! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا یہ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تم جیسے پڑھے لکھے نوجوان آئیں“

”یہ نہ کہو چاچا نیاز علی! تم جہاں بھی ہوتے میں تمہیں وہاں ضرور ملنے آتا۔“ ہم کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ واقعی وہی بہاول خان اشتہاری ہے جس کے کارناموں سے پولیس کے فائل بھرے پڑے ہیں۔

”ہاں بیٹا! میں ہوں تو وہی بہاول خان لیکن جو کچھ پولیس کی فائلوں میں میرے متعلق لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ شاید وہ اپنا کھویا ہوا ماضی تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے اپنی کہانی بھی سنادی جو میں اسی کی زبانی آپ کو سناتا دیتا ہوں۔

میرا نام بہاول خان ہے۔ ایک پسماندہ علاقے سے میرا تعلق ہے۔ میرا باپ اپنے زمانے کا مانا ہوا ڈکیت تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے ہم بھارت کی طرف ایک سرحدی علاقے میں رہتے تھے اور پاکستان کے قیام پر ادھر بھی سرحد پر ہی ایک اور گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ تب میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ لیکن شاید ہوش سنبھالنے پر ہی

میرے باپ نے مجھے اپنے فن میں تاک کرنا شروع کر دیا تھا۔

نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ میرا باپ بڑا اصول پرست ڈاکو تھا۔ اس نے انگریزوں کی قید کاٹی تھی۔ مجھے کہتے نگا بیٹا! ادھر لوگ پہلے ہی ٹٹ لٹا کر آئے ہیں۔ ان بے چاروں کو اور کیا ٹوٹا۔ اب ادھر سے ہی مال لایا کریں گے۔ میں یہاں آپ کو بتا دوں کہ میرا باپ جانوروں کی چوری میں استاد مانا جاتا تھا۔ اس نے کبھی معمولی جانور کو ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس زمانے میں سینکڑوں روپے سے کم لگے گھوڑی نہیں کھولتا تھا۔ میرے والد کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ کھوجی اس کا ”کھرا“ نہیں اٹھاتے تھے۔ اول تو وہ اپنا کھرا نہیں چھوڑتا تھا اگر ایسا ہو بھی جاتا تو کوئی کھوجی اپنے گاؤں کی حد سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ عموماً وہ لوگوں کو گمراہ کر کے ”کھرا“ اٹھاتے ہوئے پکے راستے تک آجاتے پھر کہہ دیتے کہ اس سے آگے نشان نہیں ملتا۔

ہم نے سرحد پار چوریاں شروع کیں اور جلد ہی میرے باپ کا نام ادھر ادھر دونوں طرف گونجنے لگا۔ ہم باپ بیٹا چاند کی ڈھلتی راتوں میں سرحد عبور کرتے اور جو کچھ ہاتھ لگا ادھر لے آتے۔ ان دنوں گائے بھینسیں کی چوری عام تھی۔

پولیس والے متعدد مرتبہ میرے والد کو گرفتار کر کے لے گئے۔ لیکن اس نے جیتے جی کبھی کوئی چوری نہیں دی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری عمر بمشکل پندرہ سولہ برس تھی۔ جب پہلی مرتبہ پولیس نے مجھے گرفتار کیا۔ میرے باپ نے مجھے کہا:

”بیٹا! تو پہلی تفتیش پر جا رہا ہے۔ مردہ کی حالات کا مقابلہ کرنا۔ پولیس کو بتا دینا کہ تو بہرام خان کا بیٹا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”چاچا! میرے جیتے جی تجھے کوئی طعنہ نہیں دے گا۔“

”میرا پندرہ دن کا ریمانڈ تھا۔ پہلا ریمانڈ، پہلی تفتیش۔ تھانے میں داخل ہوتے ہی پولیس والے شکاری کتوں کی طرح مجھ پر پل پڑے، لیکن پہلی ”پھینٹی“ سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کا واسطہ کسی ایسے غیر سے نہیں بہرام خان کے



بیٹے بہاول خان سے ہے۔ انہوں نے مجھے پندرہ دن سوئی پر لٹکائے رکھا۔ دن رات میں تین تین چار چار مرتبہ مجھے تفتیش کے لیے لے جایا جاتا۔ کوئی ایسا غیر انسانی ضربہ نہیں تھا جو پولیس نے مجھ پر نہ آزمایا ہو۔

جیب ریمانڈ ختم ہوا تو تھانیدار نے میری پیٹھ پر پٹھکی دے کر کہا۔ ”واقعی تو بہرام خان کا بیٹا ہے۔“

پولیس والوں نے ایک ریمانڈ کے خاتمے پر جب مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے دوسرا ریمانڈ مانگا تو مجسٹریٹ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور پولیس کو شرم دلانے کے انداز میں کہا: ”پندرہ سال کی عمر کے اس بچے سے اگر تم لوگ پندرہ دن میں کچھ برآمد نہیں کر سکتے۔ تو پندرہ سال میں بھی کچھ برآمد نہیں کر سکو گے۔“

اُس نے میرا ریمانڈ دینے سے انکار کر دیا اور جو ڈیشنل ریمانڈ پر مجھے جیل بھیج دیا۔ جیل والوں نے میرا استقبال ایسے کیا جیسے میں کوئی بہت بڑا لیڈر ہوں۔ اس جیل کے در دیوار کی میرے باپ سے اچھی خاصی آشنائی تھی۔ عدالت کے باہر میرا باپ میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اُس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا: ”بیٹا تو نے میرا سرخسرے بلند کر دیا ہے۔ ساری برابری کو تجھ پر مان ہے۔“

جیل میں پہلے ہی روز اُس نے ایک وکیل کے ساتھ میری ملاقات کرائی اور اگلے روز میری ضمانت ہو گئی۔ کیونکہ پولیس مجھ سے کچھ برآمد نہیں کر سکی تھی۔ ایک رات میں نے جیل کے ہسپتال میں بھی گزار دی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

اب میرا نام بھی میرے باپ کے نام کے ساتھ گونجنے لگا تھا۔ ادھر سے زیادہ ہماری شہرت سرحد کے اُس طرف تھی۔ بھارت کے سرحدی علاقے میں جہاں ہمارا قیام تھا۔ دیہاتوں کا بچہ بچہ ہمیں جاننے لگا تھا۔

میری ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھی۔ بس میں تھا یا باپ ہم نے اپنے گاؤں میں اچھی خاصی زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ پیداوار کوئی خاص نہیں ہوتی تھی یعنی نام کی ہی زمین تھی۔ لیکن بظاہر ہمارا یہی ذریعہ آمدن تھا جو سرکار کے کاغذات میں درج

عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ اُس کے اقتدار کا سورج بلند ہو رہا تھا۔ میں اب بیس بائیس سال کا گھبر و جوان تھا اور ہمارے علاقے کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور سرکاری افسران ہماری مٹھی میں تھے۔ الیکشن کے زمانے میں ہمارے گھر پر لمبی لمبی کاریں اور جلیپیں آکر کھڑی رہتی تھیں۔ ہمارے نزدیک دیہاتوں میں میرے والد کی مرضی کے بغیر کوئی ووٹ نہیں ڈالتا تھا۔ اس کا سبب اُس کا خوف نہیں بلکہ خدا ترسی تھی۔

وقت نے پٹا کھایا اور میرے باپ کو موجودہ کام پہلے سے بہتر نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنے ملک میں چوری کبھی نہیں کی تھی۔ سرحد پار سے مال لایا کرتے تھے۔ باڈر پر سختی شروع ہو گئی۔ ہمارے تین چار مقابلے دو تین مہینوں میں ہو چکے تھے۔ خطرات اب بہت بڑھ گئے تھے۔

شاید قدرت نے والد کو کسی ہندو کی گولی سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا تھا کہ اچانک الیکشن آ گئے۔ یہ الیکشن طویل مارشل لاء کے بعد آئے تھے۔ ہمارے علاقے کی ایک ممتاز شخصیت نے والد سے رابطہ کر کے درخواست کی کہ ہم اس کے لیے کام کریں۔ بطور پیشگی اُس نے نوٹوں کا بریف کیس ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں کے مصداق ہمیں یہ کام زیادہ آسان لگا۔ ایک جیب مل گئی تھی۔ میں اس جیب پر اسلحہ بردار محافظوں کے ساتھ نوابوں کی طرح گھومنا اور اپنے اُمیدوار کے لیے کنوینینس کرتا رہتا۔ دو تین روز کے وقفے سے نوٹوں کے بدل ہمارے پاس پہنچ جاتے۔

چنن شاہ سے میرا تعارف یہیں ہوا۔ وہ ہمارے ممبر کا خاص آدمی اور اپنے



چھلانگ لگا دی۔ اُس کی گردن والد کے قابو میں آگئی، لیکن دوسرے نے میرے باپ کے سر میں یکے بعد دیگرے پستول کی چھ گولیاں اتار کر اپنے ساتھی کو مرنے سے بچا لیا۔

اس حملے میں میرا سبلی سمیت چار آدمی مارے گئے۔ باقی شدید زخمی ہوئے حملہ چونکہ طے شدہ منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا اور مخالف امیدوار دو روز پہلے ہی پولیس کی ملی بھگت سے ایک معمولی کیس میں جیل پہنچ چکا تھا۔ اس کا کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ تین چار حملہ آوروں نے گرفتاری دے دی اور کیس چلنے لگا۔

میں نے اپنے باپ کی لاش قبر میں اتارتے ہوئے قسم کھائی تھی کہ میں اُس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ خواہ اس کی کتنی ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔ میرے باپ نے مجھے تربیت ہی تھی کہ چور چیشہ اکیلا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ میں نے اُس کی تربیت کا پہلا اصول چنن شاہ پر اعتبار کر کے توڑا۔

چنن شاہ میرا دوست بن گیا۔ وہ بھی ہماری دنیا کا باشندہ تھا۔ لیکن کام ذرا الگ قسم کے کرتا تھا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اُس کا بڑا دھندہ عورتوں کو ورغلا کر اغوا کرنا اور کسی دوسرے علاقے میں لے جا کر فروخت کر دینا تھا۔ لیکن اُس نے میری طبیعت کو جانتے ہوئے مجھے کبھی اس بات کی خبر نہیں دی اور یہی کہا کہ وہ ہم کلنگ ہی کرتا ہے۔

جس شخص نے میرے باپ کو مارا تھا اُسے علم تھا کہ اس علاقے میں سوائے میرے کوئی اور اُس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے میری طرف دو تین مرتبہ صلح کا پیغام بھیجا اور منہ مانگی قیمت بھی اس صلح کی ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن میں نے اسے دھتکار دیا۔ کچھ عرصہ بعد الیکشن ہونے والے تھے اور مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔

چنن شاہ بڑا حرامی انسان تھا۔ وقت آنے پر وہ ہر پروپ اپنانے کو تیار ہوتا میرے ساتھ وہ صرف اس لیے لگا تھا کہ میرے علاوہ اور کوئی اُسے مخالف کے انتقام سے

علاقے کا مانا ہوا غنڈہ تھا۔ چنن شاہ جس قسم کے جرائم کرتا تھا۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ وہ دس جماعت پاس تھا اور میں نے خدا جاتے پانچویں تک بھی تعلیم کیسے حاصل کر لی تھی۔ چنن شاہ کو خاص طور سے ہمارے ساتھ کر دیا گیا۔ جس امیدوار کے حق میں ہم انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ وہ پہلی بار اسمبلی کا انتخاب لڑ رہا تھا۔ بندہ دولت مند تھا اور جس کے خلاف وہ لڑ رہا تھا وہ اس علاقے کا پرانا ممبر اسمبلی اور مانا ہوا غنڈہ تھا۔

انتخابات ہوئے۔ دونوں طرف سے دھاندلیاں کی گئیں۔ ہمارا پلڑہ بھاری رہا۔ اور ہمارا امیدوار جیت گیا۔ مخالف امیدوار کی یہ پشتی سیٹ تھی۔ اس کی ہمارے کے لیے ہی نہیں، بلکہ اس سارے علاقے کے لیے چونکا دینے والی تھی ہمارے امیدوار نے جیت کی خوشی میں جلوس نکالا اور مخالف کے گھر کے سامنے فائرنگ کی گئی۔

ہارنے والے امیدوار نے فی الوقت خاموشی کو ہی مصلحت جانا لیکن وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ جس روز ہمارے ممبر اسمبلی نے حلف برداری کی تقریب میں جانا تھا۔ وہی دن مخالف نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے منتخب کر رکھا تھا فاتح ممبر اسمبلی، میرا والد اور دو باڈی گارڈ ایک جیب میں تھے جبکہ دوسری کار میں اور لوگ بیٹھے تھے۔ جیسے ہی جیب ان لوگوں کی گھات میں آئی۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ میرا باپ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ اسے ابھی ایک گولی ہی لگی تھی کہ اُس نے جیب سے چھلانگ لگا دی اور دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ حملہ آوروں کو علم تھا کہ اگر ہرام خان زندہ بچ گیا تو ایک ایک کو چن چن کر مار ڈالے گا۔

مخالف کے للکارنے پر دو مسلح آدمیوں نے میرے والد کا تعاقب کیا اور جائے وقوعہ سے تقریباً ایک فرلانگ دُور میرے باپ کو گھیر لیا۔ نہتا اور زخمی ہونے کے باوجود میرے باپ نے بڑی کی موت مرنے کے بجائے ان میں سے ایک پر



بچا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذریعے میں نے جدید ہتھیار حاصل کیے تھے۔ چن شاہ کی علاقہ غیر میں واقفیت تھی اور ہمارا پروگرام تھا کہ وارات کے بعد وہیں جا کر پناہ لیں گے۔

ایک روز وہ موقع آ ہی گیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ غمینی انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ الیکشن مہم جاری تھی۔ ہمارا دشمن نزدیکی گاؤں میں جلسہ کر کے رات گئے واپس لوٹ رہا تھا۔ میں اور چن شاہ اس کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی شکار ہمارے جال میں پھنسا ہم نے اس پر جہنم کا دھانڈا کھول دیا۔ اس کے ساتھ باڈی گارڈز سے بھری ہوئی جیب موجود تھی۔ لیکن میں نے ان لوگوں کے اوپر گریبنڈوں کی بارش کر دی تھی۔ یوں بھی کرائے کے گوریے ایسے موقع پر کہاں کام آتے ہیں۔ انہوں نے جان بچانے میں ہی عاقبت جانی۔ امیدوار اس کے دو ساتھی مارے گئے۔ جب ان کی موت کا یقین ہو گیا تو ہم نے راہ فرار اختیار کی۔ بندوبست پہلے سے کیا ہوا تھا۔ گھوڑیاں تیار تھیں۔ راستے کا انتخاب ہو چکا تھا۔ رقم اچھی خاصی میرے پاس تھی۔

دوسرے دن ہم محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ یہاں چن شاہ کی واقفیت کام آئی اور ہم نے ڈیرے لگا لیے۔ تین ماہ تک ہم ان لوگوں کے نمان رہے۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔ بالآخر ہم نے اس علاقے کو خیر باد کہا اور اپنا روپ اور نام بدل کر دوسرے صوبے کی طرف نکل گئے۔

میرے باپ نے کم عمری میں ہی میرا رشتہ چھو بھی کے گھر طے کر دیا تھا جو ایک بڑے شہر میں رہتی تھی۔ ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ ایک جگہ کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ پھر میں چن شاہ کو بتائے بغیر ایک دن اپنی چھو بھی کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”چھو بھی گھبرا نہ جانا“ میں نے کہا۔ ”میں صرف اپنا فرض پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میرے باپ کی شدید خواہش تھی کہ میری شادی صغرا سے ہو۔ میری پوزیشن ہمارے

سامنے ہے۔ اگر تم انکار کر دو گی تو بھی میں تمہارا فیصلہ قبول کروں گا۔ لیکن میں روز قیامت اپنے باپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔“

”تو میرے مرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے؟“ چھو بھی نے میری بلا میں لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ہو یا بُرا۔ بیٹیوں کی قسمت کے فیصلے آسمانوں پر لکھے جاتے ہیں۔ صغرا تیری امانت سے تو اُسے لے جا۔“

تیسرے روز ایک سادہ سی تقریب میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ چن شاہ نے ہر کام میں سکے بھائیوں کی طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری شادی ہوئی اور چن شاہ کے مشورے پر ہم کراچی چلے آئے۔ کراچی لوگوں کا سمندر ہے۔ اس سمندر نے ہمیں بھی ہرب کر لیا۔ میں نے اپنا نام نیاز علی رکھ لیا تھا۔ اسی نام کا شناختی کارڈ بنالیا تھا۔ یہیں ہم ایک مکان میں رہنے لگے۔ باہر والا کمرہ چن شاہ کے پاس تھا۔ اندر دو کمرے ہمارے پاس تھے۔ زندگی گزرنے لگی۔

خزانوں کے تو کنوئیں بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ وہی ہوا۔ دو تیر مہینوں بعد پریشہم ہونے لگے۔ اس دوران صغرا مجھ پر مسلسل دباؤ ڈالتی رہی کہ میں کوئی چھوٹا موٹا کام کروں اور پرانی زندگی کو جھول جاؤں لیکن جو چکا مجھے لگ گیا تھا۔ اس نے مجھے کوئی ”چھوٹا موٹا“ کام نہ کرنے دیا۔ میں نے تو کبھی معمولی چوری نہیں کی تھی۔

چن شاہ بڑا کانیا آدمی تھا۔ وہ میرے حالات کا جائزہ لیتا رہا ایک روز کہنے لگا ”بھائی صاحب کب تک زندگی یوں گزاریں گے۔ کوئی ہاتھ مارنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ میں تیار ہوں۔ لیکن شہر کے کام ہم لوگ نہیں جانتے ہم تو مردوں والے کام ہی کر سکتے ہیں۔ چن شاہ نے کہا اچھا میں باہر نکلتا ہوں کوئی پرانی واقفیت مل جائے پھر بات بنے گی۔

”جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں“ میں نے اُسے کہا۔ چن شاہ چلا گیا۔ اُس کی واسپی تیسرے روز ہوئی۔ لیکن اکیلے نہیں ایک نوجوان لڑکی اُس کے ساتھ تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟



چن شاہ نے مجھے آنکھ سے بیہودہ سا اشارہ کیا۔ مجھے طیش آگیا۔ اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے وہ مجھے اشارہ کرتا باہر نکل گیا۔

”بہاول خان؟“ چن شاہ نے کہا۔ ”یہ تمہارا گاہن نہیں۔ کراچی شہر ہے۔ ہم دونوں مفور قاتل ہیں۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو اور میری بات غور سے سنو۔ زیادہ ہوشیاری دکھائی تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔“

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ خود کو اتنا بے بس اور محجور محسوس کیا تھا۔ خدا جانے صغراں سے شادی کے بعد میں کچھ بزدل سا کیوں ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور واپس آگیا۔ دوسرے دن چن شاہ اس لڑکی کو لے گیا اور اگلے ہی روز واپس لوٹ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔

دو روز ہم ایک دوسرے سے کچھ کچھ رہے۔ تیسرے دن اس نے کہا۔ ”بہاول! میں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی یہ ٹھنڈا کام نہیں کروں گا۔“ میں خوش ہو گیا۔

اس دوران صغراں ہماری باتیں چھپ چھپ کر سننی رہتی تھی۔ اس نے مجھے متعدد مرتبہ کہا کہ میں چن شاہ سے جان چھڑاؤں۔ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک ہی جواب دیا: ”صغراں میں بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔“

دو تین روز بعد چن شاہ کہیں گیا اور واپس لوٹا تو بہت خوش تھا کہنے لگا ”بہاول کام بن گیا۔ تمہاری مرضی کا کام ہے۔“

وہ اپنے کسی پرانے ساتھی کے ساتھ ڈاکے کا منصوبہ بنا آیا تھا۔ بڑی خطرہ رقم ہاتھ لگنے والی تھی۔ منصوبہ کچھ یوں تھا کہ میں حیدر آباد شہر میں ایک دین پر حملہ کر کے اس میں موجود بینک کرنسی پر قبضہ کرنا تھا۔ اس دین کا ڈرائیور ہمارا ہی ساتھی تھا جو ہماری مدد کرتا۔ منصوبے کے مطابق مجھے دو اور ساتھیوں کے ساتھ حملہ کرنا اور کرنسی والے تھیلوں پر قبضہ کرنا تھا۔ چن شاہ کا ریلے قریب موجود ہو گا۔ ہمیں اس کا ریلے بیٹھ کر فرار ہونا تھا۔

منصوبے کے مطابق صغراں سے دو روز بعد واپس لوٹنے کا بہانہ کر کے ہم چلے گئے۔ حیدر آباد میں اس نے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کروادی۔

صبح ہم نے واردات کرنی تھی۔ رات کو ہوٹل کے ایک کمرے میں جہاں میں اس کا ساتھی قیام پذیر تھے۔ پولیس نے ریڈ کر دی۔ ہم دونوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ تھانے جا کر علم ہوا کہ ان کا تیسرا ساتھی جو پولیس کو پہلے ہی مطلوب تھا کہیں دوپہر کو گرفتار ہو گیا تھا اور اس نے ڈاکہ مارنے کا اعتراف کر کے ہمیں گرفتار کروا دیا ہے۔ آج مجھے اپنے مرحوم باپ کی وہ بات شدت سے یاد آئی کہ چور ہمیشہ اکیلا ہی کامیاب ہوتا ہے۔ یہ شہری لوگ تھے۔ پولیس نے دو دو چھتر مارے اور چالو ہو گئے۔ میں نے الکار کر دیا اور کہا کہ میں انہیں جاننا اور جس شخص کو میرے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ آج ہی میرا واقف بنا ہے۔ پولیس والے مجھے تین روز تک مارتے رہے۔ لیکن مجھ سے کیا اگلا تے۔

سات دن کا ریاناڈ تھا۔ اس دوران انہوں نے اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ میں نے پنجاب میں اپنی چھوٹی کے گھر کا پتہ لکھوا دیا۔ پھر بھی کو میرے سینے نام کا علم تھا۔ خدا جانے وہاں کوئی گیا نہیں۔ پولیس نے مجھے جیل بھیج دیا۔ مجھ پر ان لوگوں نے آوارہ گردی کا مقدمہ قائم کیا تھا۔ ضمانت کے لیے کہے کہنا۔ کراچی خط لکھتے ڈرتا تھا۔ ایک فکر یہ بھی کھائے جا رہی تھی کہ صغراں کا کیا بنے گا۔ پھر دل کو تسلی دے لیتا کہ چن شاہ وہاں ہے۔

چھ ماہ بعد مجھے جیل سے رہائی ملی۔ مانگ مانگ کر کراچی پہنچا تو صغراں اور چن شاہ کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ خدا جانے دونوں کہاں غائب ہو گئے۔ ہمسایوں نے بتایا کہ چن شاہ انہیں پنجاب کا کہہ گیا ہے۔ گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے تالا توڑ کر اندر دیکھا۔ گھر کا مکمل صفایا ہو چکا تھا۔

”یا اللہ دونوں کہاں گئے؟“

بڑی مشکل سے کرایہ اکٹھا کیا اور میں پنجاب پہنچ گیا۔ پھر بھی کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ صغراں یہاں نہیں آئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ چن شاہ کی



کارستانی ہے۔ میں نے پھوپھی سے کچھ پیسے لیے اور وہاں سے چل دیا۔ جلیہ بالکل بدل گیا تھا اور اب میں بکسانی پہچان نہیں جاتا تھا۔ اس دوران گلی گلی کو جہ کو پھوپھی نے دونوں کو تلاش کیا۔ لیکن کوئی نشان نہ ملا۔

میں درندہ بن گیا؟

اب میرے لیے جرم کی کوئی تخصیص نہیں رہ گئی تھی۔ صرف ایک کام کیا کہ ہر واردات کیلئے کی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں بھٹکتا رہا۔ پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران ملک کے کونے کونے میں جرائم پیشہ لوگ میرے واقف بن چکے تھے۔ میرا اپنا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آج اس شہر میں ہوتا تو کل کسی دوسرے شہر میں۔

ایک مرتبہ اسی طرح میں ایک شہر کے بازار حُسن سے گزر رہا تھا۔ جب ایک دلال مجھ سے ٹکرا گیا۔ میرے لیے اب یہ دنیا اجنبی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک کوٹھے پر لے گیا۔ جہاں زندگی کا سب سے زیادہ وحشتناک منظر میرا منتظر تھا۔ میرے سامنے بہت سی لڑکیاں تھیں۔ جن میں صغرا بھی تھی۔

صغرا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ دیوانہ وار ایک طرف بھاگی۔ میں نے پک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”صغرا تم یہاں؟“ میرے منہ سے کشتل نکلا۔

”بہادر خدا کے لیے میرا نام نہ پکارو۔ مجھے نہ چھوؤ۔ میں مری جی ہوں“ خدا جانے وہ کیا کیا کہتی رہی۔ ہم دونوں ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ دلال مطمئن ہو کر چلا گیا۔ میرے اصرار کرنے پر صغرا نے رو کر مجھے بتایا کہ چنن شاہ نے اسے میری موت کی خبر دی تھی اور بتایا کہ میں حیدر آباد کسی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوں اور اب پولیس یہاں ریڈ کرنے والی ہے۔ وہ مجھے گھر لے جانے کے بہانے کار میں بٹھا کر لے گیا اور کراچی میں ہی اپنے ایک اڈے پر پہنچا دیا۔ جہاں مجھے علم ہوا کہ وہ تو عورتوں کا پرائانا

دال ہے۔ اور ایک عرصے سے عورتوں کو اغوا کر کے فروخت کرنے کا دھندہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد صغرا کی کہانی ان بد نصیب لڑکیوں سے ملتی جلتی تھی، جو بالآخر ظلم و تشدد کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے ایسے اڈوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ صغرا نے یہ بھی بتایا کہ اس نے تین مرتبہ خودکشی کی ہے لیکن یہ لوگ اسے مرنے بھی نہیں دیتے۔

”صغرا میرے ساتھ چلو۔“ میں نے اسے کہا

پہلے تو وہ نہ نہ کرتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا: ”بہادر یہاں صرف بہادری سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بڑے با اثر لوگ ہیں۔ تم کل دوپہر کو فلاں جگہ پر آنا۔ میں وہاں ایک ڈاکٹر کے پاس دوائی لینے کے بہانے جاتی ہوں۔ وہاں سے ہم نکل جائیں گے۔“ میں بادل خواستہ واپس آ گیا۔

رات میں نے کانٹوں کی سیخ پر گزار دی۔ اگلے روز میں طے شدہ منصوبے کے مطابق اس جگہ پہنچ گیا لیکن صغرا کو نہ آتا تھا نہ آئی۔ شام تک میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بیقرار ہو کر اسی اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ صغرا نے رات کو ہی خواب آور گولیوں کی ساری شیشی نکل کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کی لاش لاوارث سمجھ کر کبڈی والے لے گئے ہیں۔ اس خبر نے مجھ پر بھاری گرا دی۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ اس حالت میں صغرا کبھی میرے ساتھ نہیں جاسکتی تھی۔ اب میری زندگی کا ایک ہی سن تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں ان لوگوں کو چن چن کر ماروں جنہوں نے میری صغرا کو اور مجھے جیتے جی مار ڈالا تھا۔

میں اس مشن کی تکمیل کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔

ایک ہفتے کے دوران میں نے دس قتل کیے۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح صغرا کی بربادی میں حصہ لیا تھا۔ چنن شاہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں اسے تلاش کرتا رہا۔

پولیس میرے پیچھے پیچھے اور میں اس کے آگے آگے بھاگا پھر رہا تھا۔ میں نے اب



## کفارہ بیٹی کا

اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ یوں اور عدالتوں سے واسطہ پڑے۔ اگر کبھی واسطہ پڑ ہی جائے تو پھر گھبراہٹیں نہیں۔ عدل و انصاف اور جزا و سزا کی اس دُنیا کو بڑے غور سے دیکھیں۔ یہ بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز دُنیا ہے۔ اگر آپ کو افسانے یا سچی کہانی لکھنے کا شوق ہے تو یہ دُنیا کہانیوں کی زرخیز زمین ہے۔ آپ کو ناقابل یقین حد تک سچی کہانیاں ملیں گی۔ آپ کو ایسے ایسے ڈرامے ملیں گے۔ جنہیں آپ اس حدیث کے پیش نظر نہیں لکھیں گے کہ لوگ انہیں افسانہ نہ سمجھ بیٹھیں۔

عدل و انصاف کی اس دُنیا کے ساتھ میرا تعلق کچھ زیادہ ہی گہرا رہا ہے۔ ایک روز ایک ہول کو رٹ میں کسی کام سے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ایک جوان عورت بیان دے رہی تھی۔ عدالتوں میں بیان ہی لیے دیئے جاتے ہیں۔ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ مجھے ریڈر سے کام تھا۔ ریڈر کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ کسی بھی عدالت کے ریڈر کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں میرے کانوں میں بیان دینے والی عورت کے یہ الفاظ پڑے۔

”میرا خاوند بے قصور ہے۔ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ دھوکہ دینے کا مجرم میرا باپ ہے اور میری ماں بھی اُس مجرم میں شریک ہے۔ میں نے اپنے خاوند کو خود کہا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ اُس نے کر لی۔ میرے باپ نے پہلے میرے خاوند کو دھوکہ دیا۔ اب اس نے میرے خاوند سے پیسے ہٹورنے کے لیے اس کے مفاد مقدمہ دائر کر دیا ہے۔“

جرائم سے توبہ کر کے دکان کھول لی تھی۔ بس ایک آخری گناہ کی مہلت کے لیے خدا سے دُعا مانگتا کہ کسی طرح چنن شاہ مل جائے اور اس مردود سے دُنیا کو پاک کروں۔ میں نے حلیہ بدل لیا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ دل کے سکون کے لیے کبھی کبھی اللہ والوں کے پاس بھی ہوا آتا۔ آخر قدرت نے میری دُعا کو قبول کیا اور حرامی چنن شاہ کو میرے ہاتھوں اس کے انجام تک پہنچانے کے اسباب پیدا کیے۔

ایک روز یونہی ایک بزرگ کی نزدیکی گاؤں میں آمد کی خبر سن کر وہاں پہنچ گیا منزل مراد یہاں میرے ہاتھ لگ گئی۔

اس بزرگ کے غلیفوں میں چنن شاہ بھی موجود تھا۔ اُس نے اپنا بھیس بدل لیا تھا اور فقیروں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ لوگ اسے بابا چنن شاہ کے نام سے پکارتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس حرامی نے اب یہ روپ دھار کر اپنا دھندہ شروع کیا ہے۔ میں اُس کے پیچھے لگا رہا۔ اُس کے ٹھکانے کا علم مجھے ہو گیا تھا۔ جہاں میں نے ایک روز اُس کے مریدوں کے سامنے اُسے کتے کی موت مار ڈالا۔ میں نے اُسے کھڑی سے قتل کیا تھا۔ اس دوران میں چلا چلا کر کہتا رہا کہ میں صغرا کا انتقام ہوں۔ میں بہاول خان ہولہ میں بہرام خان کا بیٹا ہوں۔ میری غیرت سے کھیلنے والے درندے کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ میں وہاں سے نکل گیا۔ سیدھا اپنے گاؤں گیا۔ باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ قانونی دستاویزات مکمل کر کے اپنی ساری زمین اپنی چھوٹی کے بیٹوں کو منتقل کر دی اور یہاں آ گیا۔ پولیس ساری زندگی مجھے تلاش نہ کر پاتی۔ لیکن جب زندگی کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہ گیا۔ پھر جی کر کیا کرنا ہے۔ میں نے خدا سے ایک آخری گناہ کی مہلت مانگی تھی جو مل گئی۔ اب میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے سرخرو ہو کر اُس کے دربار میں پہنچوں گا۔



میں اس عورت کے بیان کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے کام کو بھول گیا۔ لیکن اس کا بیان یہیں پر ختم ہو گیا اور جج نے مخالفت پارٹی کے وکیل سے کہا کہ جرح الگ پیشی پر ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا مقدمہ شروع ہو گیا۔ ریڈر نے مجھے دیکھا اُسے معلوم تھا کہ میں کس کام سے آیا ہوں۔ اُس نے مجھے کہا کہ وہ ابھی مصروف ہے کیونکہ دوسرا کیس شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے میں کم و بیش ایک گھنٹے بعد آؤں۔

گھنٹے بعد میں دوبارہ گیا تو ریڈر فارغ ہو چکا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کہانیوں کی تلاش میرا خطبہ ہے۔ میں نے ریڈر سے کہا کہ میرا کام بعد میں کرنا۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ وہ جو سانونی اور موٹی ٹی عورت بیان دے رہی تھی اُس کا کیا کیس ہے؟ ریڈر نے اور عدالت کے دوسرے اہلکاروں کے لیے کوئی بھی کیس عجیب و غریب نہیں ہوتا۔ کسی کو مزائے موت سنا دی جائے تو بھی یہ لوگ کچھ بھی محسوس نہیں کرتے سوائے اس کے کہ ایک کیس ختم ہوا۔ اس ریڈر نے مجھے بے رخی سے کہا کہ یہاں تو یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تم اپنی بات کرو۔ میں اُس کے نیچے پر گیا۔ تب اس نے اس کیس کے متعلق مجھے دو چار موٹی موٹی باتیں بتا دیں اور اس لڑکی کے خاوند اور اس کے باپ کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

میرا خط مجھے اس شہر کے اُس محلے میں لے گیا۔ جہاں اس عورت کا خاوند رہتا تھا۔ وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اپنا تعارف اور اپنا مدعا اُس کے سامنے رکھا تو وہ کچھ ڈر سا گیا۔ اُسے شک تھا کہ میں مخالفت پارٹی یا شاید پولیس یا کچری کا آدمی ہوں۔

کسی کے سینے سے

راز نکالنا یا کسی کو اپنے زیر اثر لانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی دیر میں یہ جوان سال اور خوب رو آدمی مجھے اپنا ہمدرد اور مخلص دوست سمجھنے لگا۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ میں نے اُس کے ساتھ دلی ہمدردی کی تھی اور میرے دل میں کوئی دھوکا اور فریب نہیں تھا۔ میں نے اُسے تیار کر لیا کہ وہ اس کیس کے متعلق

مجھے کچھ بتائے جو اُس کے سسر نے اُس کے خلاف دائر کر رکھا ہے۔ وہ چونکہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس لیے اُس نے کہا کہ میں اس کیس کا سارا پس منظر سنا تو دیتا ہوں لیکن آپ لکھ نہیں سکیں گے۔ کیونکہ کیس کورٹ میں چل رہا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اس قانون سے واقف ہوں۔ آپ صرف کہانی سنا دیں اور میں یہ اُس وقت لکھوں گا۔ جب کیس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اُس نے مجھے گھر بٹھا کر تمام کہانی سنا دی، جس کی تصدیق میں نے اپنے ذرائع سے اُس کے سسر کے محلے سے بھی کی۔ سول کے کیسوں کے جنہیں دیوانی مقدمات کہا جاتا ہے فیصلے برسوں میں ہو کرتے ہیں۔ اس کیس کا فیصلہ دو سال میں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو دو تین تین مہینے لمبی تاریخیں ملتی ہیں۔

کہانی سنانے سے پہلے میں آپ کو ایک اور بات بتا دوں۔ کوئی واقعہ جب ایک قانونی کیس کی صورت میں عدالت میں جاتا ہے تو اُس کی شکل و صورت ہی بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور سچ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوتے ہیں کہ اس واقعے کے کردار بھی چکر جاتے ہیں۔ اس شخص نے جسے میں کہانی سنانے کی خاطر افضل کہوں گا، جو داستان سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

افضل دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب اس کا باپ ٹرک کے ایک حادثے میں مر گیا۔ اس کا بڑا بھائی پہلے ہی بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ افضل اپنی ماں کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ ماں بڑی سلجھی ہوئی عورت ہو کر تھی۔ مگر پہلے جوان بیٹے کی وفات پھر خاوند کی اچانک موت نے اُسے ذہنی طور پر انبار مل بنا دیا۔ وہ اب افضل کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ لیکن اُس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ وہ اُسے باہر نکلنے سے بھی منع کرتی تھی۔ وہ باہر چلا جاتا تو دروازے میں بیٹھی رہتی۔ موت ایک مستقل خوف بن کر اُس کے دماغ پر سوار ہو گئی اور وہ ذہنی مرضی بن گئی۔ اُسے ایسی چپ لگی جیسے وہ گونگی ہو گئی ہو۔ افضل کی جذباتی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف بڑوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دوسری طرف ماں پاگل ہو گئی۔ کوئی عزیز رشتہ دار



بھی نہ تھا۔ جو تھے وہ ۱۹۴۷ء کے قبل عام کی نذر ہو گئے تھے اور جو یہاں پہنچے وہ بچانے کسان کسان پکھڑ گئے تھے۔ افضل کی عمر ابھی سولہ سال نہیں ہوئی تھی۔ اس کچی عمر میں اُس نے رونے دھونے اور مایوس ہونے کے بجائے اپنے آپ میں یہ عزم پیدا کر لیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو گا۔ اُس کی ماں اس حد تک مزدور نارمل رہی کہ افضل کے لیے ہانڈی روٹی ڈال دیتی اور اُس کے کپڑے دھو دیتی۔ اس کے سوا وہ حقیقی زندگی سے بالکل نا تعلق تھی۔

افضل کے سکول کا ہیڈ ماسٹر اُس کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے۔ ایک تو اس کی فیس معاف کر دادی، دوسرا کم یہ کیا کہ تین چار روپے پیسے والے آدمیوں سے کہہ کر اُس کے لیے معقول ماہانہ وظیفے کا انتظام کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو افضل اور اُس کی ماں اس ملک کے بھکاریوں کی تعداد میں دو کا اضافہ کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتے اس ہیڈ ماسٹر کی اخلاقی توجہ و اخلاقی بھی اتنی تھی کہ افضل نے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔ اُسے باقاعدہ وظیفہ دینے والوں نے کہا کہ وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ یہاں پر نہ توڑے۔ کالج میں داخل ہو جائے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اب یہ وظیفہ اُس کے لیے ناکافی تھا۔ اُس نے چار پانچ لڑکوں کی ٹیوشن رکھ لی اور صحیح معنوں میں پیٹ پر پتھر باندھ لیا۔ ماں جو پہلے ذہنی مریض تھی۔ اب جہانی طور پر بھی علیل رہنے لگی۔ افضل نے اُس کے علاج معالجے میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

افضل نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ یہ فتح و کامرانی کی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماں کے قدموں میں جنت ہے میرا مستقبل میری کوششوں سے نہیں، بلکہ میری ماں کی دعاؤں نے بنایا ہے۔ اس دور میں کون کسی کی اس طرح مدد کرتا ہے جس طرح میرے ہیڈ ماسٹر صاحب اور اُن تین چار فرشتہ سیرت انسانوں نے کی۔ میں نے باپ اور بڑے بھائی کی موت کو اللہ کی مرضی جان کر قبول کیا۔ میں نے کئی بار ایک وقت کا فاقہ کر کے ماں کا علاج معالجہ کر دیا۔ پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس کی ذات باری نے میری محنت اور خدمت قبول کی۔

اگر میرا باپ جائیداد اور روپیہ پیسہ چھوڑ کر مرنے لگتا تو میں آج ایک آوارہ آدمی ہوتا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ کم مائیگی اور محنت میں جولنت ہے وہ عیش و عشرت میں نہیں۔ افضل نے اپنے خیالات کو اور اپنی زندگی کو ایک عزم کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اُس نے نیم فاقہ کشی کی حالت میں زندگی کے چار سال گزارے اور بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ ماں علاج معالجے کے باوجود زندہ لاش بن چکی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو جو روگ لگا لیا تھا۔ وہ اُسے کھا گیا۔

اللہ نے اس پر یہ کرم بھی کیا کہ اُسے ایک بہت بڑی پرائیویٹ فرم میں اچھی ملازمت مل گئی۔ وہاں بھی اُس نے خلوص، دیانت داری اور محنت سے کام کیا۔ جن کے نتیجے میں ایک سال بعد اُسے سیلز پرائج میں بڑی اچھی تنخواہ پر لگایا گیا۔ اُس کی ماں جو اس زندگی سے رشتہ توڑ چکی تھی۔ افضل سے کہا کرتی تھی کہ اب میں اُس دن کے لیے زندہ رہوں گی جیب تمہاری دامن گھرائے گی۔ میں تم دونوں کے ہاتھوں رخصت ہوں گی۔ لیکن ماں اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکی۔ ایک صبح افضل جاگا اور جیب ماں کو جگانے لگا تو اُس کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ وہ نیند میں بڑی پرسکون موت مر چکی تھی۔

افضل کہتا ہے کہ یہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ دکھ اُسے یہ تھا کہ اُس کی ماں اُس کی دامن کو دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ افضل کو ہر حال میں اب زندگی کے ساتھی کی ضرورت تھی۔ اُس کی مالی اور موشل پوزیشن خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ کمپنی نے اُسے سکڑ بھی لے دیا تھا۔ کیونکہ اُس کا کام سیلز پوزیشن سے متعلق تھا۔ وہی افضل جسے محلے والے پہچانتے سے بھی انکار کر دیا کرتے تھے۔ اب اس کی طرف توجہ دینے لگے۔ دو گھروں کی توجہ کا تو وہ خاص مرکز بن گیا۔ کیونکہ ان گھروں میں جوان لڑکیاں تھیں۔ جن کے لیے اچھے رشتے درکار تھے۔ افضل سے بڑھ کر اور اچھا رشتہ کون سا ہو سکتا تھا، آمدنی معقول، اکیلا لڑکا، مکان اپنا اور دامن کی دس سالہ سند، لیکن افضل میں ایسی جھجک اور شرم تھی کہ چاہتے ہوئے بھی وہ رشتے کا لفظ زبان



پر نہیں لاتا تھا۔

ہمارے معاشرے میں یہ رواج ہے کہ لڑکی والے خود لڑکے والوں سے رشتے کی بات نہیں کرتے۔ لڑکے والوں کو لڑکی کے والدین کے پاس جانا پڑتا ہے۔ افضل میں اتنی ہمت نہیں تھی اور وہ ان طور طریقوں سے واقف بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں ایک عورت اُس کا یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے آگئی۔ وہ رشتے کروانے والی پیشہ ور عورت تھی۔ اس نے سب سے پہلے افضل پر یہ جادو چلایا کہ اُس کی ماں کی سگی بہن بن گئی، حالانکہ افضل نے اُس عورت کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن اس عورت کی زبان میں ایسا اثر تھا کہ افضل نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے لیے رشتہ ڈھونڈے۔

اس عورت نے سب سے پہلے تو ان دو گھرانوں کے خلاف زہر لگا جن کی افضل پر نظر تھی۔ اُس نے افضل کو خبردار کیا کہ ان دونوں گھرانوں کی لڑکیاں صحیح نہیں اور ان کے چال چلن بھی مشکوک ہیں۔

”میں تمہارے لیے آٹھ لڑکوں کے نمبر کاٹ کر ایک رشتہ پکا کر آئی ہوں“ رشتہ کروانے والی مائی نے کہا۔ ”تم انگوٹھی چھلا اور دو چار جوڑے کپڑے تیار کر لو پھر میں شادی کا دن مقرر کر دوں گی۔“

افضل خوش ہوا کہ اُس کا ایک پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اُس نے مائی کو پچیس روپے پیش کیے۔ مائی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ میں کسی لالچ سے نہیں آئی۔ میں تو تمہاری ماں کی روح کو راضی کرنے آئی ہوں۔ افضل نے کہا کہ شادی ایک ہی بار کرنی ہوتی ہے مجھے لڑکی دکھا دو۔ افضل کو دراصل اپنے دوستوں کا یہ مشورہ یاد آ گیا تھا کہ تم اکیلے ہو، کہیں سے رشتے کی پیش کش ہو تو لڑکی دیکھ بغیر قبول نہ کرنا۔

”افضل بیٹا! مائی نے کہا: ”وہ بڑے شریف اور پردہ دار لوگ ہیں۔ اگر میں نے انہیں کہا کہ لڑکا لڑکی دیکھنا چاہتا ہے تو وہ بگڑ جائیں گے۔ کہیں گے کہ لڑکا اچھے چال چلن کا نہیں۔“

افضل چپ ہو گیا۔ دوسرے دن اُس نے دفتر میں اپنے دوستوں کے ساتھ

ات کی۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح بھی ہو، وہ لڑکی کو منور دیکھ لے۔ لڑکی کے باپ اور اُس کے گھر کو تو وہ دیکھ ہی لے گا۔ لڑکی کو دیکھنا بہت ضروری ہے۔

دو تین دن بعد مائی پھر اُس کے گھر آئی اور اس طرح باتیں کرنے لگی۔ جیسے رشتہ بالکل پکا ہو گیا ہے اور اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ افضل کی کچھ بنائے لیکن افضل نے یہ پر زور شرط مائی کے آگے رکھ دی کہ کسی طرح لڑکی کی جھلک دکھا دو۔ ورنہ میں یہ رشتہ قبول نہیں کروں گا مائی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی کہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ لیکن وہ کوشش کرے گی کہ کسی طرح لڑکی کا چہرہ اُسے دکھا دے۔

تیسرے روز مائی اس وقت افضل کے گھر آئی۔ جب وہ دفتر سے ابھی آیا ہی تھا وہ افضل کو لڑکی والوں کا گھر تو دکھا چکی تھی۔ وہ گھر کسی اور محلے میں تھا۔ مائی نے اُسے کہا کہ تم اُس گھر کے سامنے سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گزرنا۔ میں کسی بہانے سے لڑکی کو دروازے تک لے آؤں گی اور جب تم وہاں سے گزر دو گے تو میں ایک کواڑ کھول دوں گی تمہیں لڑکی نظر آجائے گی۔

مائی کے جانے کے قریباً نصف گھنٹہ بعد افضل گھر سے چل پڑا اور اُس دو منزلہ اور خوبصورت مکان کے قریب پہنچ گیا۔ جو لڑکی کا گھر تھا۔ لڑکی والے امیر کبیر لوگ تھے۔ افضل آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب دروازے کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک کواڑ ذرا سا کھلا۔ اُسے ایک بڑی خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ اُس کے پیچھے مائی گھڑی تھی۔ افضل کو توقع نہیں تھی کہ لڑکی اتنی خوبصورت ہوگی۔ اُس کے قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔ خود افضل خوب برد اور کوشش جم کا جوان آدمی تھا۔ اُس نے لڑکی کے حسن سے متاثر ہو کر لڑکی کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ افضل بھی مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ ہمت ہی خوش تھا۔ وہ اُسی رات لڑکی کے گھر گیا اور اُس کے باپ سے ملا۔ لڑکی کی ماں بھی قریب آکر بیٹھ گئی۔ افضل دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اُس نے لڑکی کے والدین سے کہا کہ شادی جلدی کر دیں۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ وہ تو اُس کے حکم کے منتظر ہیں۔



لگا کر اُس نے اگر تجھے دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے یہ شادی نہ ہو۔  
 ”اس مائی نے مجھے تمہارے گھر کے دروازے میں ایک بڑی خوبصورت  
 لڑکی دکھائی تھی۔“ افضل نے کہا۔ ”اسی لیے میں نے بے صبر ہو کر شادی کی تاریخ بڑی  
 جلدی مقرر کر دالی تھی۔“  
 ”یہ کب کی بات ہے؟“ دلہن نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے کہ میں پہلی مرتبہ شام کے بعد تمہارے والدین سے ملنے تمہارے  
 گھر گیا تھا۔“ افضل نے کہا۔ ”یہ اُسی دن کا واقعہ ہے۔ اُس روز یہ مائی تمہارے گھر  
 میں تھی۔“

دلہن سوچنے لگی۔ بھڑکی دیر سوچ کر اُس نے کہا: ”مجھے یاد آگیا۔ مجھے مائی کا اور  
 اپنے ماں باپ کا یہ دھوکہ بھی معلوم ہو گیا ہے۔ جس دن اوجس وقت کی آپ بات  
 کر رہے ہیں۔ اُس وقت ہمارے محلے کی ایک لڑکی اس مائی کے ساتھ ہمارے گھر آئی  
 تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ لڑکی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ تو مائی نے اسے کہا تھا  
 کہ اڑ چلیں۔ یہ لڑکی ابھی میرے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن مائی اسے اٹھا کر لے گئی۔  
 میرا خیال ہے کہ آپ کو یہی لڑکی دکھائی گئی ہے۔ دلہن پھر سوچ میں پڑ گئی اور آہستہ  
 آہستہ سر ہلانے لگی۔ جیسے اُسے کچھ اور یاد ہو۔ اُس نے کہا: ”مائی اور میری ماں الگ  
 دھڑک کر کھڑے ہو کر رہی تھیں۔ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ میری ماں بھی آپ کو یہ  
 لڑکی دکھانے کی سازش میں شامل تھی۔ میرے ابا جی اتنے شریفانہ انسان ہیں کہ آپ اگر  
 ان پر کوئی الزام عائد کریں گے تو محلے میں کوئی بھی آپ کی بات پر یقین نہیں کرے  
 گا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ میرا باپ کا روبرو آدمی ہے اور اپنا مطلب نکالنا بڑی  
 اچھی طرح جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس سازش میں شامل ہے۔ مجھے اگر پتہ  
 چل جاتا کہ آپ کو کوئی دوسری لڑکی دکھائی جا رہی ہے تو میں بولے بغیر نہ رہتی۔ میرے  
 میں رشتے آئے تھے۔ تینوں کی عورتیں آئیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ اس کے بعد وہ  
 لوٹ کر نہ آئیں۔ میں نے خدا کی اس مرضی کو قبول کر لیا تھا کہ میری شادی کبھی نہیں ہوگی۔

پندرہ بیس دن کے بعد مائی کی زیر ہدایات افضل نے تیاری مکمل کر لی اور  
 بڑی سادگی اور خاموشی سے شادی ہو گئی۔ افضل کے پاؤں زمین پر ٹپکتے ہی نہیں  
 تھے۔ رات کو وہ دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو اُس پر ہیجان طاری تھا۔ اس کے  
 ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس کی دامن سرخ گھڑی بنی بیٹھی تھی۔ افضل نے کانپتے ہاتھوں  
 سے اُس کا گھونگھٹ اٹھایا اور اس کے ساتھ وہ اس طرح بدک کر پیچھے ہٹا جیسے اُس  
 نے سانپ کی پٹاری کا ڈھکنا اٹھا دیا ہو۔ پہلے تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اب  
 اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جو مائی نے اُسے دکھائی تھی۔ اس  
 دلہن کا رنگ بیماروں کی طرح پھیکا اور سانولا تھا۔ افضل نے آگے بڑھ کر غصے سے  
 دلہن کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اُس کا چہرہ عورت کا چہرہ لگتا ہی نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا  
 جیسے کسی مرد نے دلہن کا ہر وہ پ دھار لیا ہو۔ دلہن دُلی پٹی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے  
 آنسو بہ رہے تھے۔ افضل نے اُس سے پوچھا: ”کون ہو تم؟ اور مجھے یہ دھوکہ کس  
 تمہارے باپ نے دیا ہے یا تم بھی اس میں شامل ہو؟“  
 لڑکی جواب دینے کے بجائے پلنگ سے اٹھی اور افضل کے پاؤں میں بیٹھ  
 گئی۔ اب وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

”میں کسی دھوکے میں شریک نہیں ہوں۔“ لڑکی نے کہا: ”مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہارا  
 رشتہ طے ہو گیا ہے پھر مجھے شادی کی تاریخ بتائی گئی۔ آپ میرے سر پر قرآن رکھ دیں  
 تاکہ آپ کو یہ شک نہ رہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“

”اچھو“ افضل نے کہا: ”پلنگ پر بیٹھو اور مجھے یہ ساما فراڈ سمجھاؤ۔“

”مجھے جب بتایا گیا کہ کسی نے میرا رشتہ قبول کر لیا ہے۔ تو خدا کی قسم، میں بہت  
 پریشان ہوئی۔“ دلہن نے کہا۔ ”اگر مجھے اپنے ماں باپ کا ڈرنہ ہوتا اور میں پردے  
 میں نہ ہوتی تو میں یہ ضرور کہتی کہ جس کے ساتھ میرا رشتہ پکا ہو گیا ہے۔ اسے کہو کہ  
 شادی کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے مجھے دیکھ لے۔ میں نے رشتہ کر دانے والی مائی  
 سے کہا تھا کہ کوئی ایسا انتظام کر دو کہ میرا ہونے والا خاوند مجھے دیکھ لے لیکن مائی نے



اسی لیے میں نے اپنے آپ کو عبادت و وظائف اور تلاوت قرآن میں ڈال دیا تھا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ باقی زندگی اللہ کی یاد میں گزار دوں گی۔ میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا۔ معلوم نہیں خدا نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے۔

افضل کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی اُسے اتنا غصہ آتا کہ وہ اپنی مٹھیاں بیلچہ لیتا۔ کبھی یہ ارادہ اُسے آگ بگولہ کر دیتا کہ وہ ابھی مائی کو جا کر قتل کر دے۔

”میں آپ سے نہیں کہوں گی میں جیسی تیری بھی ہوں۔ مجھے قبول کر لیں،“ دہن نے کہا۔ آپ خوبصورت جوان ہیں۔ میں آپ کے قابل نہیں۔ آپ کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔

اس کے بعد آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ مجھے طلاق دے دیں اور گھر سے نکال دیں۔ میرے ماں باپ کی یہی سزا ہے۔ اگر آپ اپنی اس بدچلتی کو قبول کرتے ہیں تو میں اس گھر میں آپ کی بیوی نہیں بلکہ ایک نوکرانی کی حیثیت سے پڑی رہوں گی۔

آپ میرے والدین اور مائی کی سزا مجھے دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ لیں کہ آپ مجھ سے گناہ کو سزا دیں گے۔

افضل نے مجھے اُس رات کی بات سنا تے ہوئے کہا: ”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے کیسے کیسے دکھ بھیلے ہیں۔ میرے حالات نے مجھے لڑکپن میں ہی جوان کر دیا تھا۔

میرے ساتھ کچھ لوگوں نے بہت بڑی نیکی کی تھی۔ کسی کی نیکی کی جو قدر میرے دل میں تھی وہ شاید کسی اور کے دل میں نہیں ہو سکتی تھی۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اب اس لڑکی کی باتیں سنیں تو میرا غصہ تو ٹھنڈا نہ ہوا۔ لیکن دہن کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے طلاق نہیں دوں گا اور اُسے گھر سے بھی نہیں نکالوں گا اور کوشش کروں گا کہ اُس کے ماں باپ کی سزا اُسے نہ ملے۔

دہن گھٹے ہوئے ذہن کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے افضل کا رویہ دیکھ کر اور اُس کا فیصلہ سن کر ایک بار پھر اُسے کہا کہ وہ ایسا ایثار نہ کرے جو اسے ساری عمر کی خوشیوں سے محروم کر دے۔ افضل نے اُسے کہا کہ وہ رشتہ کرانے والی مائی سے اور

اُس کے باپ سے انتقام لے گا۔ لیکن اُسے اپنی بیوی بنا کر رکھے گا۔

دہن گھٹے ہوئے ذہن کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے افضل کا رویہ دیکھ کر اور اُس کا فیصلہ سن کر ایک بار پھر اُسے کہا کہ وہ ایسا ایثار نہ کرے جو اسے ساری عمر کی خوشیوں سے محروم کر دے۔ افضل نے اُسے کہا کہ وہ رشتہ کرانے والی مائی سے اور

اُس کے باپ سے انتقام لے گا۔ لیکن اُسے اپنی بیوی بنا کر رکھے گا۔

افضل نے سوچا کہ یہ لڑکی اگر قبول صورت نہیں اور اگر یہ ہڈیوں کا کھڑکھڑاتا ڈھانچہ ہے تو یہ اس کا قصور نہیں۔ اسے خدا نے ایسا بنایا ہے لیکن اُسے جب یہ خیال آتا کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے تو اُسے آگ لگ جاتی۔ اُس نے رات ذہنی کشمکش کی کیفیت میں گزار دی۔ اُس نے ولیمے کا انتظام بہت ہی محدود کیا تھا۔ دہن کے

ماں باپ اور دو بیٹھائیوں کو جو دہن سے چھوٹے تھے اور چار پانچ قریبی دوستوں کو مدعو کیا تھا۔

دوسرے دن یہ سب مہمان آئے تو افضل نے اپنے سرسرو کو الگ کر کے کہا: ”آپ خوش ہوں گے کہ آپ کا فراڈ کامیاب ہے۔ اب میرا انتقام دیکھنا۔ یہ بھی کامیاب ہو گا۔“

سرسرو نے کھپانا ساہوکر اپنی صفائی میں کچھ کہا۔ افضل نے اپنی ساس سے بھی یہی کہا۔ پھر اُس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ دوستوں نے اسی وقت افضل کے سرسرو کو گھیر لیا۔ کوئی کہتا کہ اسے پولیس کے حوالے کرو۔

اور کوئی کہتا تھا کہ اس کے خلاف دھوکہ دہی کا مقدمہ دائر کرو۔ لیکن افضل کی کمزوری یہ تھی کہ اُس نے نکاح میں اس دہن کو قبول کیا اور نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اُسے کوئی اور لڑکی دکھائی گئی تھی۔

بہر حال دعوت ولیمہ بد مزگی کی نذر ہو گئی۔ رواج کے مطابق دہن کو اپنے میکے جانا تھا۔ دہن کی ماں نے افضل کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور اُسے کہا کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو اتنا زلیخہ دیا ہے۔ جتنا کوئی دوستیوں کو بھی نہیں دیتا۔ ساس نے یہ بھی کہا کہ وہ چالیس پینتالیس ہزار روپیہ نقد بھی دے دیں گے۔ اس کے عوض افضل انہیں بدنام نہ کرے اور اُن کی بیٹی کو قبول کر لے۔

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سرسرو کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سرسرو کو درمیان

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سرسرو کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سرسرو کو درمیان

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سرسرو کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سرسرو کو درمیان

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سرسرو کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سرسرو کو درمیان

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سرسرو کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سرسرو کو درمیان

افضل نے اپنے دوستوں سے صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق افضل اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر اپنے سرسرو کے محلے میں چلا گیا۔ وہ کسی مسجد کے امام اور چھ سات معززین کو ساتھ لے آیا۔ اُس نے سرسرو کو درمیان



بٹھا کر بتایا کہ اس شخص نے اُس کے ساتھ کیا دھوکہ کیا ہے؟  
سب نے کہا کہ رشتہ کرانے والی مائی کو پکڑا جائے۔

”وہ غریب عورت ہے۔“ افضل نے کہا۔ ”رشتے کرانا اُس کا ذریعہ معاش ہے۔  
آپ ایک غریب عورت کو ہی کیوں پکڑتے ہیں؟ میرے شوہر اور اس کو کیوں نہیں  
پکڑتے۔ جنہوں نے اس مائی سے مجھے دھوکہ دلایا؟ اس لیے کہ یہ شریف اور پارہ  
سار بنے پھرتے ہیں؟ ایک غریب عورت سے یہ جرم اس امیر آدمی نے کرایا۔ جس نے مجھے  
زیور اور چالیس پنا لیس ہزار روپیہ نقد پر خریدنا چاہا۔“

یہ کہہ کر افضل دوسرے کمرے میں چلا گیا اور اپنی دامن کا وہ تمام زیور اٹھا لایا  
جو دامن کو ماں باپ نے دیا تھا۔ اُس نے زیور اپنے شوہر کی جھولی میں ڈالتے ہوئے  
کہا کہ اُس کی دامن وہ زیور پہنے گی جو اُس نے خود اُس کے لیے بنایا ہے۔ اُس نے سب  
کو یہ بھی بتایا کہ اُس کی ساس نے اُسے چالیس پنا لیس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا  
ہے۔ لیکن وہ اس رقم کو قبول نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے اپنا فیصلہ سناتے  
ہوئے کہا کہ وہ اُن کی بیٹی کو طلاق نہیں دے گا، اُسے آیا دکرے گا۔ اُس نے یہ اعلان  
بھی کیا کہ اُس کی دامن اپنے میکے کبھی نہیں جائے گی۔

یہ محفل برخاست ہو گئی۔ شام کو افضل اور اُس کے دوست رشتہ کرانے والی  
مائی کے گھر چلے گئے۔ اُس کا خاوند محنت مزدوری کرنے والا شریف آدمی تھا۔ افضل  
نے مائی سے کہا کہ وہ اُسے پولیس کے حوالے کرے گا۔ ایک دوست نے کہا کہ  
پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس کی ایک ٹانگ توڑ دیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ  
اس سے ہم ایسا انتقام لیں گے کہ اسے جو دیکھے گا وہ کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔

مائی نے انہیں بتایا کہ دامن کے ماں باپ نے اُسے یہ رشتہ افضل کے ساتھ کرانے  
کا ایک ہزار روپیہ معاوضہ دیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس نے افضل کو جو لڑکی  
دکھائی تھی اُسے وہ دھوکہ دے افضل کی دامن کے گھر لے گئی اور اُسے باتوں باتوں  
میں دروازے میں لے جا کر کھڑا کیا تھا۔ مائی نے افضل اور اُس کے دوستوں

کے در سے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ یہ لوگ اُسے خطرناک دھمکیاں دے کر گئے۔  
افضل عجیب سی زندگی گزارنے لگا۔ اُس نے اپنی بیوی کو کبھی طعنہ نہ دیا کہ  
اُس کے ماں باپ نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اُس کے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا  
رہا۔ اتنا اچھا کہ بیوی نے اُسے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی پسند کی کسی لڑکی کے ساتھ  
شادی کر لے اور وہ دونوں کی خدمت کرے گی۔ افضل کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا  
کہ وہ کیا کرے۔ ایک یہ بیوی تھی جس کے ساتھ اُسے ہمدردی تھی۔ دوسرے یہ دھوکہ  
مٹا جو اُسے دیا گیا اور تیسرے اپنی پسند کی بیوی اُس کے ذہن پر سوار تھی۔

وہ پریشان رہنے لگا۔ اُسے پریشان دیکھ کر اُس کی بیوی اتنی پریشان ہو جاتی  
کہ وہ رو پڑتی۔ افضل اُسے بہلا تو لیتا لیکن بیوی کو یہ احساس ذہنی اذیت میں ڈالے  
رکھتا کہ وہ اس خوب رو اور جوان آدمی کی پسند کی بیوی نہیں اور اس کے ساتھ اُس کے ماں  
باپ نے دھوکہ کیا ہے۔

اُدھر افضل کے دوستوں نے مائی کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ کوئی نہ کوئی دوست  
اُس کے گھر جا کر اسے دھمکیاں دے آتا۔ دوستوں نے یہی سکیم بنائی تھی کہ اسے پریشان  
کرتے رہو اور اس پر خوف طاری کیے رکھو۔

شادی کے پانچویں چھٹے مہینے کا ذکر ہے کہ وہی لڑکی جو مائی نے افضل کو دکھائی  
تھی۔ افضل کی بیوی سے ملنے آگئی۔ افضل دفتر سے آگیا۔ لڑکی نے جسے میں فرضی نام  
عرفانہ دے دیتا ہوں، افضل سے پردہ نہ کیا۔

”یہی وہ لڑکی ہے نا، جو آپ کو دکھائی گئی تھی؟“ افضل کی بیوی نے  
اُس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ افضل نے کہا، ”یہی تھی۔“

”مجھے آج آپ کی بیوی سے پتہ چلا ہے کہ آپ کو میری جھلک دکھا کر دھوکہ  
دیا گیا تھا۔“ عرفانہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا، ”وہ مائی بہت چالاک اور مکار ہے۔ یہ  
(افضل کی بیوی) میری سہیلی ہے۔ میں اس کے پاس جاتی رہتی تھی۔ اُس روز مائی ہمارے



میں مجھے غلط نہ سمجھا۔ میں واقعی دوستی کا قائل نہیں۔ میں تمہیں اپنے گھر میں قیدی کر رکھنا چاہتا ہوں۔

عرفانہ ایک سخت سنجیدہ ہو گئی۔ اُس کا سر جھک گیا۔ جب اُس نے سر اٹھایا تو اس کے کانوں میں ہنسی ہوئی تھی۔

”میں آپ کے جذبات کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ عرفانہ نے کہا: ”لیکن میں برداشت نہیں کر سکوں گی کہ میری اتنی عزیز سہیلی کو طلاق ہو جائے۔ کیا آپ اُسے ملحق دے دیں گے؟“

”نہیں؟“ افضل نے کہا: ”یہ اوجھی حرکت مجھے کرنی ہوتی تو میں ازواجِ زندگی کی پہلی رات ہی کر گزرتا۔ تمہاری سہیلی نے تمہیں بتایا ہو گا کہ میں اُسے فیصلہ دے چکا ہوں کہ میں اُسے آباد کروں گا۔ وہ بے قصور ہے۔ اُسے خدا نے جس شکل و صورت میں پیدا کیا۔ وہ خدا کا معاملہ ہے۔ میں اُسے رد نہیں کر سکتا۔ یہ گناہ ہے۔ دوسرا گناہ یہ بھی ہو گا کہ میں اس کے مال باپ کی سزا سے دوں۔ یہ تو میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ میں اپنی پسند کی شادی کروں۔ لیکن میں نہیں مانتا۔“

”یہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔“ عرفانہ نے کہا: ”اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اُسے کسی پڑوس نے نہیں ملا۔ وہ ہمیں تنہائی میں بیٹھے کاموں سے کچل چکی ہے۔“

عرفانہ کے چلے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد افضل کی بیوی آگئی۔ افضل نے اسے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے جا کر اپنے پاس بیٹھا لیا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ ایسی حرکت کیوں کرتی ہے۔ جس سے اُس کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اُس کی بیوی نے ہنس کر کہا کہ وہ پڑوس کے بلائے پر ہی گئی تھی۔

”میری بات غور سے سنو راشدہ؟“ افضل نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”میں تسلیم کرتا ہوں کہ عرفانہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔“

راشدہ جو مسکرا رہی تھی۔ اس طرح سنجیدہ ہو گئی جیسے کسی نے جلتے دیے کو پھونک

گھرائی اور میری امی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ جانے لگی تو مانی نے مجھے کہا کہ چلو تمہیں تمہاری سہیلی کے گھر لے چلوں۔ میں ادھر ہی جا رہی ہوں۔ میں اس کے ساتھ چلی گئی۔ وہ اس کی امی کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر مجھے کہنے لگی کہ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ اُس نے مجھے دروازے میں روک لیا۔ ادھر سے آپ آگئے۔ مانی نے کہا کہ اس کے ساتھ رشتہ طے ہوا ہے۔ میں آپ کو دیکھ کر مسکرائی کیونکہ آپ میری سہیلی کے خاوند بننے والے تھے۔

عرفانہ افضل کے دل میں پہلے ہی اتری ہوئی تھی۔ افضل نے اس کے ساتھ ایسی خوشگوار بے تکلفی باتوں کی حد تک پیدا کر لی کہ عرفانہ شام تک وہیں بیٹھی رہی۔ اگر شام کو اس کی ماں اسے لینے نہ آجاتی تو شاید وہ کچھ اور دیر وہیں بیٹھی رہتی۔ اس کے بعد عرفانہ تیسرے چوتھے روز افضل کے گھر بظاہر اُس کی بیوی سے ملنے کے لیے آنے لگی۔ وہ اُس وقت آتی تھی۔ جب افضل دفتر سے گھر آچکا ہوتا تھا۔ باتوں کی حد تک ان کی بے تکلفی خاصی بڑھ گئی۔

افضل نے دیکھا کہ دو مرتبہ ایسے ہوا کہ عرفانہ آئی تو تھوڑی دیر بعد افضل کی بیوی یہ کہہ کر باہر نکل گئی کہ پڑوس نے بلایا تھا۔ میں ذرا اُس کی بات سن آؤں۔ اس کی غیر حاضری میں افضل اور عرفانہ نے اپنے اپنے دل کھول کر ایک دوسرے کے آگے رکھ دیئے۔ ایک روز عرفانہ نے اُسے کہا کہ اُسے بہت شرمندگی ہے کہ جو دھوکہ افضل کو دیا گیا۔ اس میں اُسے استغاثہ کیا گیا ہے۔ وہ واقعی شرمسار ہوتی تھی۔ ایک روز عرفانہ نے کہا کہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ وہ افضل کو اس جرم کا جرم ادا کرے۔

”لیکن میں جو جرم نامہ تم پر عائد کروں گا۔ وہ تم ادا نہیں کر سکو گی۔“ افضل نے کہا۔ ”یہی بہت ہے کہ تم آجاتی ہو اور میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔“

”آپ جرم نامہ بتائیں۔“ عرفانہ نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔ ”شاید میں ادا کر سکوں۔“

”وہ جرم نامہ تم ہو۔۔۔ تم۔۔۔ مجھ۔۔۔ افضل نے نشی سہ مسکراہٹ سے کہا:



ماروسی ہو۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے دھوکہ دیں۔“ راشدہ نے بھرپور آواز میں کہا۔ ”جس طرح آپ نے مجھے دل و جان سے قبول کیا ہے۔ اس کا ردینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کو اس سے بھی زیادہ خوبصورت مردینے کی قسم کھا چکی ہوں۔“

”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں عرفانہ کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کروں؟“ افضل نے ایسی آواز میں کہا جس میں کچھ غصہ بھی تھا۔ ”وہ کسی کی کواری بیٹی ہے اور تمہارے اعتماد پر میرے گھراؤ ہے۔“

”میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے اعتماد پر ہمیشہ کے لیے آپ کے گھر میں آجائے۔“ راشدہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ عرفانہ آپ کو بہت اچھی لگتی ہے۔ اور وہ بھی آپ کو چاہتی ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ مجھے پڑوس نے نہیں بلایا تھا۔ میں آپ دونوں کو تنہائی میں چھوڑ کر دانستہ چلی گئی تھی۔ خدا قسم اس سے مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے۔ جس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ اپنے جذبات میرے لیے قربان کر رہے ہیں۔ میں اپنا آپ، آپ پر قربان کر دوں گی۔“ راشدہ بولتے بولتے چپ ہو گئی اور اس کے چہرے پر خون کی لالی آگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر افضل کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جذبات سے لرزتی ہوئی بلند آواز سے بولی۔ ”آپ کے ساتھ جو دھوکہ ہوا ہے۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ میں آپ کی دوسری شادی کروا کے دم لوں گی۔ آپ کی شادی عرفانہ کے ساتھ ہوگی۔“

وہ بہت دیر ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ جن میں جذباتیت تھی اور حقیقت بھی افضل اتنا سمجھ گیا کہ راشدہ کے انداز میں احتجاج اور غصہ نہیں لیکن افضل کا کردار کچھ ایسا تھا کہ وہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ دوسری شادی کرے یا نہ کرے۔ تین چار روز بعد وہ مائی آئی۔ جس نے افضل اور راشدہ کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اس نے افضل کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بہت روئی۔

”خدا کے لیے مجھے وہ سزا دے دو جو تم دینا چاہتے ہو یا اپنے دوستوں سے کہو کہ

میرا بیٹا چھوڑ دیں۔“ مائی نے روتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کوئی نہ کوئی دوست میرے گھر آکر بے ڈر ادھکا جاتا ہے۔ میں جہاں جاتی ہوں وہاں تمہارے دوستوں کے بکھیرے ہوئے کانٹے میرے دامن کو آتے ہیں۔ پیٹ پالنے کے لیے میں نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن تمہارے دوستوں نے مجھے ہر محلے میں اتنا بدم کردیا ہے کہ کسی گھر میں کوئی میری بات نہیں سنتا۔ اس سے بہتر ہے کہ مجھے زہر دے کر مار ڈالو۔“

”یہ تو سب نے دیکھا تھا کہ تم نے میرا رشتہ کس طرح کر دیا ہے۔“ افضل نے کہا۔ اس میں میرے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔“

دراصل افضل کے دوست اس مائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر اڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اتنے عینے گزر جانے کے باوجود ایسی کسی دھکی پر عمل نہ کیا جو وہ اسے دیتے تھے۔ وہ شرارتی سے لڑکے تھے۔ کبھی مائی کے گھر چلے جاتے کبھی اُسے راستے میں روک لیتے۔ مائی جس علاقے میں گھومتی پھرتی تھی۔ وہاں انہوں نے مائی کی یہ کڑوت سب کو بتا دی۔ اس طرح وہ مائی کے لیے مسلسل دہشت اور سوائی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اب مائی تنگ آکر افضل کے قدموں میں آن گئی۔ افضل تو چپ رہا راشدہ بول پڑی۔

”مائی ایک کام کرو۔“ راشدہ نے کہا، ”میں تمہاری خلاصی کر دیتی ہوں۔ تم عرفانہ کا رشتہ افضل صاحب کے لیے پکا کر دو۔“

مائی اسے مذاق سمجھی۔ افضل تو خاموش رہا لیکن راشدہ نے مائی کو قائل کر لیا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی ہے۔ تب افضل نے راشدہ سے کہا کہ وہ ایسی حرکت نہ کرے لیکن راشدہ جو منہ سے نکال چکی تھی۔ اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔

اس روز کے بعد مائی افضل کے گھر آتی رہی۔ لیکن جو بھی بات چیت ہوتی وہ راشدہ کے ساتھ ہوتی۔ افضل کو ان کی بہت سی باتوں کا علم ہو نہ ہو سکا۔ اسے یہ علم ضرور ہوا کہ راشدہ اپنے ماں باپ کے گھر کبھی نہ گئی۔



ایک روز عرفانہ کا باپ افضل کے دفتر میں جا کر اُسے ملا اور اُسے کہا کہ رشتے کر دینے والی مائی افضل کے لیے عرفانہ کا رشتہ مانگ رہی ہے۔ عرفانہ کا باپ حیران تھا کہ افضل کی بیوی یہ رشتہ کروا رہی تھی۔

”میری ایک بات بڑے غور سے سُننا۔“ افضل نے عرفانہ کے باپ سے کہا۔ ”میں آپ کی بیٹی کا رشتہ چاہتا ہوں لیکن میں راشدہ کو طلاق نہیں دوں گا۔ میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ کی بیٹی میرے گھر آ کر ایک منٹ کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کرے گی کہ اس گھر میں اُس کی سوکن بھی موجود ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میری بیوی کے ماں باپ نے میرے ساتھ کیا دھوکا کیا تھا۔“

”ہاں! ہاں!“ عرفانہ کے باپ نے کہا۔ ”عرفانہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ راشدہ بہت نیک لڑکی ہے۔ میں دل میں کوئی تسلی لے کر ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر یہ گھر تمہارا نہ ہوتا تو میں اپنی بیٹی کو کسی کی سوکن بنا کر نہ بھیجتا۔ میری ایک مجبوری بھی ہے جو میں تم جیسے بھلے مانس کے سامنے بیان کر سکتا ہوں۔ میری چھ بیٹیاں ہیں۔ بیٹیا ایک ہی ہے۔ جس کی عمر ابھی آٹھ سال ہے۔ میں تو ایک بیٹی کو بیاہنے کے قابل نہیں کہاں میری چھ بیٹیاں، میرے اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ کوئی تم جیسا مل جائے جو کسی قسم کا مطالبہ نہ کرے۔ اس طرح میری ایک بیٹی تو بیاہی جائے گی۔ عرفانہ چوبیس سال کی ہو گئی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اسے گھر بٹھائے رکھوں گا، عرفانہ کے بعد دو اور لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی باپ کی خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ کچی جہاں جائے سکھی ہے۔ یہی ڈر لگتا ہے کہ تمہاری پہلی بیوی موجود ہے۔ میری بیٹی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔“

افضل نے اُسے تسلی دلا سہ دیا لیکن درپردہ جو تسلیاں راشدہ عرفانہ کی ماں کو شے چکی تھی۔ وہ کام کر گئیں اور ایک روز نہایت خاموشی اور سادگی سے عرفانہ اور افضل کی شادی ہو گئی۔ افضل نے مجھے بتایا کہ راشدہ کو اُس نے اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ افضل نے ایسی کوئی حرکت نہ کی جس سے راشدہ کو یہ شک ہو تا کہ افضل اب عرفانہ ہی

کا پورہ کر گیا ہے۔

ابھی بیس روز ہی بمشکل گزرے ہوں گے کہ افضل کے دفتر میں سول کورٹ کا سمن آگیا۔ راشدہ کے باپ نے افضل کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ اُس نے بیوی کی اجازت لیے بغیر اور عائلی قوانین میں دیئے ہوئے قانونی طریقے کے خلاف دوسری شادی کر لی ہے۔ افضل نے سمن کی تعمیل کی اور مقررہ تاریخ پر عدالت میں چلا گیا۔ اُس نے ایک وکیل کر لیا۔ جیسا کہ دیوانی عدالتوں میں ہوتا ہے۔ پانچ چھ مہینے لا ابتدائی اور رسمی کارروائیوں ہی میں گزر گئے۔ پھر ایک روز راشدہ کے باپ کی گواہی ہوئی۔

افضل کے وکیل نے اُس پر جرح کی۔ اس جرح میں اس نے صرف اس نکتے کو سامنے رکھا کہ اس شخص نے ایک خوبصورت لڑکی افضل کو دکھا کر اپنی بد صورت بیٹی کے ساتھ بیاہ دیا۔ وکیل نے راشدہ کے باپ کی یہ حالت کر دی کہ اُس کی زبان ہلکانے ل۔ وکیل نے عدالت سے درخواست کی کہ یہ کیس آگے چلنا ہی نہیں چاہیے۔ راشدہ کو عدالت میں طلب کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ اپنے خاوند کی دوسری شادی پر ناراض ہے یا راضی ہے۔

راشدہ کے باپ کے وکیل نے افضل کے وکیل کا یہ موقف نامنظور کر دیا اور عدالت کا یہ حکم نامہ لے لیا کہ وہ اپنے تمام گواہ پہلے پیش کرے گلا اس طرح مقدمہ لگتا چلا گیا۔ کبھی ایک آدھ گواہی ہو جاتی۔ کبھی صرف تاریخ مل جاتی۔ ڈیڑھ پونے دو سال بعد راشدہ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔

راشدہ نے جو بیان دیا وہ بہت ہی طویل تھا حالانکہ افضل کے وکیل نے اُسے ایک مختصر بیان بتایا تھا۔ افضل نے مجھے بتایا کہ کورٹ میں کھڑے ہو کر راشدہ کی حالت ہو گئی تھی کہ جیسے وہ آگ کا ایک شعلہ ہے اور جو بھی اُس کے قریب گیا وہ جل کر اڑھ ہو جائے گا۔

راشدہ نے اپنے ماں باپ کو خوب ننگا کیا اور کہا کہ اُس کی ایک خوبصورت بیٹی کو



اس دھوکہ میں استعمال کیا گیا۔ اُس نے رشتہ کروانے والی مافی کا نام بھی لیا۔ اُس نے عدالت کو بتایا کہ اُسے اپنے ماں باپ سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ شادی کے بعد اُس نے اپنے ماں باپ کی صورت اس عدالت میں دیکھی ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے بتایا کہ افضل نے کس طرح اُسے اپنی پناہ میں لیا اور کبھی فریب کاری طعنے تک نہیں دیا بلکہ بیوی کے پورے حقوق دیے۔ راشدہ نے کہا کہ قانون پہلی بیوی کی اجازت کی بات کرتا ہے میں نے اپنے خاوند کی شادی اپنے ہاتھوں کروائی ہے۔

اس طرح احتجاجی اور جو شیلے انداز میں میان دے کر راشدہ نے عدالت میں سناٹا طاری کر دیا۔ کیس تو یہیں پر ختم ہو گیا تھا۔ لیکن افضل کے وکیل نے مکمل شہادت پیش کرنا بہتر سمجھا۔ مافی کو پیش کیا گیا۔ عرفانہ بھی گواہی دینے آئی اور محلے کے تین اور آدمیوں کی گواہی ہوئی۔ آخر عدالت نے افضل کو بری کر دیا۔

## آہ، ذات انسان کی

ہمارا کنبہ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ اس وقت میری عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ مجھ سے بڑی ایک بہن تھی۔ جس کی اُس وقت عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی تھا جو شاید چھ سات سال کا تھا۔ میرا اپ گاہوں کے ان لوگوں میں سے تھا جو دیہات میں امیر کبیر زمینداروں اور گاؤں کے چوہدریوں کی خدمت اور غلامی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ میرا باپ ایک جاگیردار کا خاص بھتیجی تھا۔ خاص آدمی کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی کوئی چار سو بیسی اور فراڈ میرے باپ کے ہاتھوں کرایا جاتا تھا۔ اس طرح میرا باپ بہت چالاک اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ ہمیں اُسی جاگیردار کے گھر سے کھانا دانہ ملتا تھا۔ یہ جاگیردار بہت بڑا جاگیردار نہیں تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں اونچے درجے کا زمیندار تھا۔ لیکن پکا بد معاش اور بے ایمان آدمی تھا۔ اُس سے کسی کی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ اُسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ اکثر شراب پیتا اور ان کی عورتوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا۔

۱۹۴۷ء میں ایسا انقلاب آیا کہ میرا پورا کنبہ مشرقی پنجاب کے جہنم سے صاف بچ کر نکل آیا اور اس جاگیردار کا سارا خاندان مارا گیا۔ سکھوں نے اس کا چوبارہ جلا ڈالا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دو تین سکھ عورتوں کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی اور سکھ اس کے ذاتی دشمن بن گئے تھے۔ انہوں نے اس شخص سے پورا پورا انتقام لیا۔ میرا باپ بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے جو استاد ی ان بڑے چوہدریوں



سے سیکھی تھی۔ وہ اُس نے پاکستان میں آکر استعمال کی۔ اس کے نتیجے میں اُس نے ایک قصبے میں کسی ہندو کا چھوڑا ہوا خاصا بڑا مکان جو دو منزلہ تھا، اپنے نام الاٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ قصبے کے بازار میں اُس نے دو دوکانیں بھی الاٹ کروا لیں جو بعد میں کرائے پر دے دیں۔ اس مکان میں گھر کا تمام سامان اور فرنیچر وغیرہ موجود تھا۔ یہ کسی امیر ہندو کا مکان تھا جو سب کچھ چھوڑ کر اپنے کنبے کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ ہم نے اس قسم کا مکان اور اس قسم کا فرنیچر وغیرہ دیکھا ضرور تھا لیکن یہ ہمارے مالکوں کے گھروں میں ہوتا تھا۔ جس کی ہم صرف جھاڑ پونچھ کیا کرتے تھے۔ اسے استعمال کرنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایسے گھروں میں ہم جوتیاں باہر اتار کر اندر قدم رکھتے تھے۔

خدا نے ہمیں اس سے زیادہ اچھا سامان بمعہ چوبارہ دے دیا۔ لیکن خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہمارا دماغ خراب ہو گیا۔ صاف بات یہ ہے کہ ہماری ذات اُن ذاتوں میں سے ایک تھی۔ جنہیں آج اسلامی ملک میں بھی ”مکین ذات“ کہا جاتا ہے۔ میرے باپ نے کریمانے کی دکان کھول لی تھی۔ اُسے چاہیے تھا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو سکول داخل کروادیتا۔ اس کے بجائے اُس نے ہم دونوں کو دکانداری پر لگا دیا۔ کاغذوں میں میرے باپ نے اپنی ذات کچھ اور لکھوا دی۔ میں اس ذات کا نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ کئی لوگوں نے یہی ذات اپنے ناموں کے ساتھ جوڑ لی ہے۔

سب سے زیادہ دماغ میری بہن کا خراب ہوا۔ خدا نے اُسے شکل و صورت اور جسم اتنا اچھا دیا تھا کہ اچھے کپڑے پہن کر وہ جاگیرداروں کی بیٹی لگتی تھی۔ اس کا رنگ بھی گورا تھا۔ جب شہر میں آکر اچھا مکان، کھانے پینے اور پہننے کو امیروں جیسا ملنے لگا۔ تو اُس کی خوبصورتی اور زیادہ نکھر آئی۔ ایک تو اتنے امیرانہ مکان اور سامان نے اُس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ دوسرا اُس کا شہن اُس کے دماغ پر سوار ہو گیا۔

مجھے کے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں اُس کے پاس آتی تھیں۔ میں نے خود کوئی بار دیکھا کہ وہ لڑکیاں بڑی سلجھی ہوئی باتیں کرتی تھیں۔ وہ ہمیں بڑے اُونچے خاندان کے فرد سمجھتی تھیں۔ میری بہن یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ واقعی اُونچے خاندان کی لڑکی ہے ایسی حرکتیں کرتی تھی جو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بلکہ وہ مذاق بن جاتی تھی۔ ہمارے پاس اگر امیری تھی تو صرف یہ کہ ہمیں دو منزلہ مکان مل گیا تھا اور اس میں امیرانہ سامان موجود تھا۔ آمدنی کے لحاظ سے اگر ہم غریب نہیں تو امیر بھی نہیں تھے۔ عزت سے گزارہ چل رہا تھا لیکن میری بہن یہ ظاہر کرتی تھی کہ ہم بہت امیر لوگ ہیں۔ اپنی اصل ذات کو چھپانے کے لیے وہ جعلی ذات ہر کسی کو بتاتی تھی۔ زیادہ تر وقت سنگھار میز کے بڑے شیشے کے سامنے بیٹھ کر گزارتی اور میک اپ کیے رکھتی تھی۔

میک اپ کرتے رہنا اور بالوں کی مختلف شکلیں بناتے رہنا اس پر ایک نشے کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ ہماری ماں نے غربت کا وقت دیکھا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں رہتی اور گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھی۔ وہ میری بہن کو بھی گھر کے کام کاج میں لگانے کی کوشش کرتی۔ لیکن میری بہن کستی کہ برتن مانجھنے اور جھاڑو وغیرہ کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری بہن اپنے آپ کو شہزادی سمجھتی تھی۔ میرا باپ بھی بیٹی کی ان حرکتوں سے پریشان رہنے لگا تھا۔

میری بہن دوسرے گھروں میں جاتی رہتی تھی۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ وہاں بھی وہ شو بازی ہی کرتی رہتی تھی۔

ہمیں خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ اس قسم کی لڑکیاں بڑی جلدی خراب ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن ہماری بہن کی کہیں سے بھی کوئی شکایت نہ ملی۔ اس کی بجائے یہ پتہ چلا کہ محلے کے دو لڑکوں نے میری بہن پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن میری بہن نے دونوں کو دھتکار دیا تھا۔ وہ دراصل کسی کو پلے باندھتی ہی نہیں تھی۔

میرے والدین کو مشکل اُس وقت پیش آئی۔ جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کی شادی کر دینی چاہیے۔ ساتھ والے محلے میں ہمارے گاؤں کا ایک خاندان آکر آباد ہوا



تھا۔ اُس کی ذات وہی تھی جو ہماری اصلی ذات تھی۔ انہیں بھی مکان مل گیا تھا اور وہ بھی رئیس ہو گئے تھے۔ وہ لوگ اپنے بیٹے کے لیے میری بہن کا رشتہ مانگنے آئے۔ میری ماں نے فوراً ہاں کر دی۔ میرا باپ بھی رضامند تھا۔ لیکن بہن نے اُن لوگوں کے جاتے ہی طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ کہتی تھی کہ میں اتنی گھٹیا ذات کے لوگوں میں نہیں جاؤں گی۔ ماں اسے کہتی تھی کہ ہم بھی اسی گھٹیا ذات کے لوگ ہیں۔ لیکن میری بہن نہیں مان رہی تھی۔ میرا باپ جو مشرقی پنجاب کے اپنے گاؤں میں چار سو بیسی اور برعاشی میں مشہور تھا، ادھر آکر بالکل سیدھا ہو گیا۔ اُس نے آخری چار سو بیسی ہی کی کر دو منزلہ مکان اور دکانیں الاٹ کروالیں اور کاغذوں میں اپنی ذات بدل لی تھی۔

وہ بیٹی کی اس ضد پر بہت پریشان ہوا۔ اپنی عزت کی خاطر ہمیں یہ رشتہ منسوخ کرنا پڑا۔ تین چار مہینے بعد ایک اور اچھے گھر سے رشتے کا پیغام آیا۔ میری بہن نے کہا کہ وہ لڑکے کو دیکھے بغیر ہاں نہیں کرے گی۔ باپ نے اُس پر سختی کی اور دو تین پھڑپھڑ بھی لگا دیے لیکن میری بہن نے یہ رشتہ بھی بھگا دیا۔

ایک عورت کبھی کبھی ہمارے گھر میں آتی تھی۔ وہ رشتے کرانے کا کام بھی کرتی تھی اور اس کی کہیں نوکری بھی لگی ہوتی تھی۔ وہ میری ماں کے ساتھ گپ شپ لگاتی اور میری بہن کے ساتھ علیحدگی میں کھسکھسرتی۔ یہ عورت بد معاش نہیں لگتی تھی بلکہ میری ماں اُسے پسند کرتی تھی۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے اس عورت سے کہا ہے کہ ہماری بیٹی کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کر دے۔ اُس وقت میری بہن کی عمر اکیس سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔

ایک صبح ہم سو کر اٹھے تو بہن کو غائب پایا، تمام کمروں میں دیکھا، وہ کہیں نہ ملی۔ اگلی رات تک بھی وہ نہ آئی تو میری ماں کہنے لگی کہ تھانے اطلاع دی جائے۔ میرے باپ نے کہا کہ تھانے والے کیا کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ جوان اور بالغ لڑکی ہے، اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ وہ دوسری بات یہ کہیں گے کہ کسی پر شک ہے یا کسی کے ساتھ دشمنی ہے تو وہ بتاؤ۔ ہم کیا بتائیں گے؟ تھانے والوں کو یہ پتہ

ہل جائے گا کہ لڑکی کی عادتیں کیسی تھیں۔ بہتر ہے کہ چپ رہا جائے۔ اگر اُسے آنا ہوا تو خجل خراب ہو کر آجائے گی۔

میری ماں کو شک تھا کہ رشتہ کرانے والی جو عورت ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ میری بہن اس کے ذریعے گھر سے بھاگی ہے، لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ عورت بدستور ہمارے گھر آتی رہی۔ وہ تمہیں کھا کر کہتی کہ اُسے میری بہن کے بھاگ جانے کا کچھ علم نہیں۔ ہم رو دھو کر چپ ہو گئے۔

تین چار مہینوں بعد میری ماں کے پیٹ میں درد اٹھا اور تیسرے دن وہ مر گئی۔ بہن ہی نہ چلا کہ اُسے کیا بیماری تھی۔ میرے باپ کو بیٹی کا ہی بہت غم تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری ماں کا صدر ایسا پڑا کہ باپ بھی چار پائی سے لگ گیا۔ کچھ دنوں بعد اُس نے دکان بھی چھوڑ دی۔ کوئی ڈاکٹر اور حکیم نہ چھوڑا لیکن صدے کا علاج کون کر سکتا تھا۔ ایک اور مہینہ گزرا تو باپ بھی چل بسا۔

ہم دو بھائی بے آسرا رہ گئے۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی اور چھوٹا بھائی تیرہ چودہ سال کا تھا۔ چھوٹا بھائی کچھ آوارہ ہو گیا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ باپ بھی سر سے اٹھ گیا ہے تو اُس نے دکان پر بیٹھنا کم کر دیا، بالآخر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور دکان کو نقصان پہنچانے لگا۔

ادھر ہم پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ میرا ایک تایا اور ایک چچا معلوم نہیں کہاں سے جاگ پڑے ایک روز وہ دونوں آئے اور کہنے لگے کہ تمہارے باپ نے یہ جو مکان اور دکانیں الاٹ کرائی تھیں۔ ہم تینوں بھائیوں کے نام ہیں میں نے کہا کہ میرے والدین کی زندگی میں تو انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا باپ بڑا بد معاش آدمی تھا ہم اس سے ڈرتے ادھر نہیں آتے تھے۔ اب ہم اپنا حصہ لینے آئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا چکر چلایا کہ پولیس کو ساتھ لاکر مجھے مکان سے بیدخل کرادیا۔ میں کو ران پڑھ تھا۔ اگر باپ نے کچھ پڑھایا کھایا ہوتا تو میں



کہیں عرضی پرچہ دائر کر کے اپنا حق مضبوط کر لیتا۔ انہوں نے مجھ پر یہ مہربانی کی کہ دو کمروں کا ایک معمولی سا مکان مجھے دے دیا اور کہا کہ دکان کا مال تقسیم ہو گا اور مجھے اپنا حصہ مل جائے گا۔ میں آپ کو یہی بات کیا سناؤں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس ملک میں کس طرح بے انصافی ہوتی ہے۔ پانچ چھ ماہ کے اندر میرے مردہ باپ کے ان پھانیوں نے مجھے کنگال کر دیا اور مجھے اپنا نوکر بنا لیا۔ دکان پر بھی ان کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔

میں تو پہلے ہی غموں اور صدموں کا مارا ہوا تھا۔ بہن معلوم نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ ماں باپ بھی نہ رہے اور ایک روز پتہ چلا کہ چھوٹا بھائی چوری کے الزام میں پکڑا گیا ہے اور حوالات میں ہے۔ میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اُسے ایک روز گرفتار ہونا ہی تھا۔

میرے داغ پر ان صدمات کا ایسا اثر ہوا کہ میری حالت پانچوں جلیبی ہو گئی ایسے محسوس ہوتا تھا کہ میں ہوش میں بھی ہوں اور بے ہوش بھی۔ آنکھوں کے سامنے کبھی کبھی اندھیرا چھا جاتا۔ پھر لوں بھی محسوس کہ میں چلتے چلتے کہیں پہنچ گیا تو مجھے ہوش آئی۔ میں سوچنے لگا کہ میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں۔ ایسے ہی ایک مرتبہ میں اسی بے ہوشی کے عالم میں قصبے سے باہر نکل گیا۔ جب میں اپنے آپ میں آیا تو میں ایک گاؤں میں پہنچا ہوا تھا۔ دو تین آدمی میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے باہر ہی بیٹھا لیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔ انہوں نے جب مجھے بتایا تو میں نے اندازہ کیا کہ میں اپنے گھر سے بارہ تیرہ میل دور نکل آیا ہوں۔

گاؤں کے اور بھی بہت سے آدمی میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ میرے آنسو بہنے لگے۔ وہ سب اچھے لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور پوچھا کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ میں نے انہیں وہ سب کہانی سنا دی جو مجھ پر گزری تھی۔ میں نے انہیں اپنا یہ فیصلہ بھی سنایا کہ میں اب واپس نہیں جاؤں گا۔ وہاں اب میرے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔

مجھے یہ بات بہت پسند آئی۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ باقی عمر خدا کی یاد میں گزار دوں۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ میں ان کے ساتھ مسجد میں رہوں گا۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ اپنے گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ میں نے مسجد کی خدمت شروع کر دی۔ میں مسجد میں جھاڑو دیتا تھا اور وضو کے لیے پانی بھر دیتا تھا۔ پھر میں نے میتوں کو غسل دینے کا کام بھی شروع کر دیا۔ میں دراصل گاؤں میں ہی جانا پڑا تھا۔ میں اپنی اصلیت میں واپس آ گیا تو مجھے سکون مل گیا میں ہر طرح خوش رہنے لگا۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ وہ میری شادی کراویں گے۔ میں اللہ کی عبادت اور مسجد کی خدمت میں اتنا ڈوب گیا تھا کہ میں نے شادی کرنے کی کبھی سوچ ہی نہیں تھی۔

مسجد کی خدمت کرتے تین سال گزر گئے۔ میں ہر طرح خوش تھا۔

اس گاؤں میں دو تین اونچے خاندان بھی رہتے تھے۔ ایک روز ان میں سے ایک گھر کے بڑے چوہدری نے مجھے اپنے ہاں بلایا اور کہا کہ دس گیارہ میل دور ایک گاؤں میں ایک پیغام لے کر جانا اور اس کا جواب وہاں سے لے کر آنا ہے۔ اُس نے مجھے پیغام دیا اور اپنی گھوڑی بھی دے دی۔ میں اُسی وقت روانہ ہو گیا۔

میں جب اس گاؤں میں داخل ہوا تو گاؤں کے باہر ہی سبز لوں کا ایک باغیچہ نظر آیا۔ جس کے گرد جھاڑیوں اور سبزے کی باڑ لگائی گئی تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں اس باڑ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ باغیچے میں مجھے ایک جوان عورت شہلکی نظر آئی۔ اس کی شکل میری بہن سے ملتی جلتی تھی۔ وہ میری بہن نہیں ہو سکتی تھی۔



وہ کسی بڑے جاگیردار کی بیٹی نظر آتی تھی۔ اُس نے بڑے قیمتی کپڑے اور زیور پہن رکھے تھے۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور گھوڑی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ اس عورت نے جب میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ ٹہلٹہلے ٹہلے رک گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تو میری بہن ہی ہے۔

میں نے گھوڑی روکی، کوڈ کر اترا اور بھاگتا ہوا بارٹ کے اندر چلا گیا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ میرے ساتھ لپٹ جائے گی۔ لیکن میں اُس کے قریب پہنچا تو وہ یوں کھڑی مجھے دیکھتی رہی جیسے میں اُس کا نوکر ہوں اور وہ ابھی مجھے کہے گی کہ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔

”تم بشرال ہو؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا اور کہا۔ ”مجھے پہچانا نہیں۔“

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اُس نے بے رُخی سے پوچھا۔

میں نے وہ باتوں کی طرح کھڑکی چادر اور کرتا پہن رکھا تھا۔ میرے سر پر ململ کا صاف اور چمڑے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ میری بہن کو میرا یہ حلیہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے پوچھے بغیر اُسے سنایا کہ میرے ساتھ کیا بیٹی ہے۔ اور میں کس حالت میں ایک گاڈل میں پہنچا تھا اور تین سال سے ایک مسجد اور اس کے مولوی صاحب کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں سب کو اپنی اصلی ذات بتایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہاں تک تم کس طسرح پہنچی تھیں؟“

اُس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا جو دو منزلہ اور بہت عالی شان تھا۔ کہنے لگی۔ ”وہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں کے سب سے بڑے زمیندار کی بیوی ہوں، چٹھ سے یہ دست پوچھنا کہ میں یہاں تک کس طرح پہنچی تھی۔“

اتنے میں تین چار سال کی عمر کا ایک بڑا خوبصورت بچہ دوڑتا ہوا میری بہن کے پاس

آن کھڑا ہوا اور مجھے دیکھنے لگا۔

”یہ میرا پہلا بچہ ہے۔“ میری بہن نے کہا لیکن اُس نے کوئی خوشی کا اظہار نہ کیا۔

میں بچے کو اٹھانے اور پیار کرنے کے لیے بازو پھیلا کر آگے بڑھا تو میری بہن نے آگے ہو کر مجھے روک دیا۔ اُس نے بڑی دھیمی آواز میں ایک ایسی بات کہہ دی جیسے اس نے میرے دل میں چاقو اتار دیا ہو۔

”میں اس بچے کو یہ نہیں بتانا چاہتی کہ تم اس کے ماموں ہو۔“

میں نے بہت صدمے برداشت کیے تھے۔ لیکن اپنی بہن کے یہ الفاظ برداشت کر سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اُس وقت تک بہن نے میرے ساتھ اس طرح باتیں کیں۔ جیسے وہ میرے ساتھ بولنا نہیں چاہتی۔ وہ مجھ پر اپنا رعب جما رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی شو بازی والی عادت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟“ اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ یہاں کے فلاں چوہدری کے لیے ایک پیغام لایا ہوں۔

”جاؤ“ اُس نے کہا۔ ”اپنا کام کرو اور واپس چلے جاؤ۔“

”میں نے تو کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ میں نے کہا: ”تمہاری یہ بات سن کر کہ تم یہاں کے سب سے بڑے چوہدری کی بیوی ہو۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میں تمہارے ہاں لوکر بن کر تمہاری خدمت کرتا رہوں گا۔ مجھے تو یہ بھی خیال آیا تھا کہ میں جب یہ کہوں گا کہ میں تمہارا نوکر بن کر رہوں گا تو تم کوگی کہ تم میرے بھائی ہو۔ میں تمہیں بھائیوں کی طرح رکھوں گی۔ نوکر بنا کر کیوں رکھوں۔“

”میں تمہیں یہاں کسی صورت نہیں رکھ سکتی۔“ اُس نے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم پر کوئی پابندی ہے۔“

”مجھ پر کون پابندی عائد کر سکتا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”یہاں میرا حکم چلتا ہے۔“



میں یہاں کی لکھ ہوں۔

”پھر میں تمہارے پاس کیوں نہیں رہ سکتا؟“

”خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔“ اُس نے کہا۔ ”اگر تم میرے بھائی ہو اور تمہارے دل میں میری محبت ہے تو مجھ پر یہ فہرمانی کرو کہ یہاں کسی کو نہ بتانا کہ میں تمہاری بہن ہوں۔ میں نے یہاں اپنی وہ اونچی ذات بتا رکھی ہے۔ جو ہم نے کاغذوں میں لکھوائی تھی۔ میرے خاوند نے یہاں سب کو یہ بتا رکھا ہے کہ میں شہر کے ایک امیر کبیر گھرانے کی ایک لڑکی ہوں۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے کہ ہم حجاب ہیں اور ہماری اصلیت کیا ہے۔ اگر تم میرے پاس رہے۔ تو ایک نہ ایک روز پردہ اٹھ جائے گا۔ اس میں میری اور میرے خاوند کی بے عزتی ہوگی۔ زیادہ دیر یہاں نہ روکو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“

اس سے زیادہ وہ مجھے اور کیا کہتی۔ میں اگر رکا رہتا تو وہ اپنے مانی یا نوکر کو بلا کر کہتی کہ اس کو دھکے مار کر باہر نکال دو۔ میں نے اُس کے بچے کو بڑے پیار اور غور سے دیکھا اور وہاں سے چل دیا۔ ایک دو قدم اٹھا کر میں رُک گیا اور پیچھے مڑ کر اپنی بہن سے کہا: ”ان دو منزلہ حویلیوں والے زمینداروں کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے۔ میں نے تمہیں اپنا گاؤں بتا دیا ہے۔ مجھے بلا لینا۔“

وہاں سے میں اس گھر گیا۔ جہاں پیغام دینا تھا۔ پیغام دیا۔ وہ بھی کوئی زمیندار تھا۔ اس نے اپنے نوکر سے کہا کہ مجھے کھانا کھلائے۔ میں نوکر کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے کھانے کے دوران اس نوکر سے اپنی بہن کے متعلق پوچھا اُسے یہ نہ بتایا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ نوکر چاکر اور مزار سے اپنے مالکوں کا پردہ نہیں رہنے دیا کرتے۔

”میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی اس چوہدری نے شہر سے نکلوائی تھی۔“ نوکر نے مجھے بتایا: ”تم نے دیکھا یہ کتنی خوبصورت عورت ہے۔ یہ اس چوہدری کا متعلق ہے۔“

اس کے آدمی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ کسی خوبصورت لڑکی کو درغلانے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اس لڑکی کو بتا دیتے ہیں کہ اس کی شادی جاگیر دار کے ساتھ کرانی جائے گی۔ اُسے کسی دھوکے میں نہیں رکھتے۔ چوہدری بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے وہ ایسی دو لڑکیاں گھروں سے نکلوا کر اُن کے ساتھ شادی کر چکا ہے۔ اُن دونوں کی جوانی اور خوبصورتی ڈھل گئی ہے۔ اب یہ تیسری ہے جو اس نے درغلا کر گھر سے نکلوائی ہے۔ سنا ہے کسی امیر اور اونچی ذات کے خاندان کی لڑکی ہے، لیکن ہے بڑی شوباز بہر کسی پر حکم چلاتی ہے۔ چوہدری کی سب سے پہلی بیوی بھی زندہ ہے، جس کے ساتھ اس نے باقاعدہ برادری سے رشتہ مانگ کر شادی کی تھی جس روز چوہدری کی آنکھیں بند ہوئیں۔ پہلی بیوی باقی تینوں بیویوں کو چلتا کرے گی۔

میری حالت بہت بُری ہو رہی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ میں پھر بالکل ہو جاؤں گا۔ میری بہن نے جس طرح مجھے دھتکارا تھا۔ وہ کون سا بھائی برداشت کر سکتا ہے۔ میں کھانا کھا کے وہاں سے چل پڑا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ وہ عورت جو رشتہ کرنے کا کام کرتی اور ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھی۔ میری بہن کو اُسی نے درغلیا اور اس کا دل تک پہنچایا ہو گا۔ کبھی مجھے خوشی ہوتی کہ میری بہن کسی اور غلط جگہ نہیں پہنچ گئی۔ وہاں وہ ساری عمر غراب ہوتی رہتی، لیکن مجھے جب نوکر کی بات یاد آتی تو میں سوچتا کہ میری بہن کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔

دو سال بعد میری بہن اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ یہ مجھے اس طرح پتہ چلا کہ رات بہت لڑ گئی تھی۔ میں مسجد کے صحن میں سویا ہوا تھا۔ کوئی دوڑتا ہوا مسجد میں داخل ہوا اور سیدھا میرے پاس آیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ وہ پانچ چھ سال کا بچہ تھا۔ جو میرے اُس آکر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ میں ڈر گیا کہ یہ کون ہے۔ میں نے اُسے تسلی دی اور کہا۔ اُس نے بتایا کہ چاچا پانچ دن ہوئے اُسے اُس کے گاؤں سے اغوا کیا گیا تھا اور اس کی آنکھیں باندھ کر یہاں لے آئے تھے۔ انہوں نے اسے ایک کمرے میں بند رکھا اور اُسے کھانے پینے کے لیے دیتے رہے۔



”آج رات اس کمرے کی کنڈی کھلی رہ گئی۔ بچے نے مجھے بتایا۔“ میں کمرے سے نکلا۔ صحن میں دو تین آدمی سوئے ہوئے تھے اور باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ میں جب باہر والے دروازے سے نکلنے لگا تو ایک آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ میرے پیچھے دوڑا۔ باقی دو آدمی بھی میرے تعاقب میں آئے۔ آگے یہ مسجد دیکھی تو میں ادھر آگیا ہوں۔۔۔ مجھے ان سے بچاؤ اور مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو۔

میں نے اس سے اس کے گاؤں اور باپ کا نام پوچھا۔ اس کا جواب سن کر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر ہتھوڑا مارا ہو۔ وہ میری بہن کا بیٹا تھا۔ اتنے میں تین آدمی مسجد کے دروازے میں آن کھڑے ہوئے۔ ایک نے وہیں سے نکل کر کہا کہ بچہ ہمارے حوالے کر دو۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ بچہ میرے پاس نہیں یہ خدا کے گھر میں آیا ہے۔ انہوں نے مجھے دھکیا دیں۔ یہ بچہ آخر میرا بھانجا تھا۔ میں مرنے مارنے پر اتر آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ تم میں سے کوئی بھی مسجد کے اندر آیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مولوی صاحب اور بڑے چوہدری صاحب کو ساتھ لے آؤ تو میں بچہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ اس بچے کو اغوا کر کے لائے ہیں۔ ان لوگوں میں اتنی حرمت نہیں ہوتی کہ وہ کسی مقابلے میں ٹھہر سکیں۔ ہماری آوازوں پر کوئی آدمی جاگ اٹھا اور وہ مسجد میں آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ لوگ کسی کا بچہ اغوا کر کے لے آئے ہیں۔ اور بچہ بھاگ کر مسجد میں آگیا ہے۔ اس آدمی نے دو اور آدمی بلا لیے۔ اسی وقت تینوں آدمی بھاگ گئے۔ میں نے بچے کو اپنے ساتھ چٹائے رکھا اور اسے بتایا کہ میں اس کا ماموں ہوں۔ بچے کو ہتھکیاں دے کر سٹلا دیا۔

صبح یہ معاملہ بڑے چوہدری تک پہنچا۔ بچے کو وہ گھر یاد تھا۔ جہاں اسے قید رکھا گیا تھا۔ اس نے وہ مکان دکھا دیا۔ وہاں ایک بد معاش قسم کا آدمی رہتا تھا۔ چوہدری نے اسے پکڑ لیا اور دو آدمیوں سے کہا کہ اسے الٹا لٹکا کر جوتے مار دو۔ پٹائی کے دوران

اس آدمی نے بتایا کہ میری بہن کے گاؤں کے دو آدمی اس بچے کو ایک رات لائے تھے اور وہ کہتے تھے کہ بچے کو ایک رات یہاں رکھنا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے اسے قتل کر کے لاش غائب کرنی پڑے۔

”بچے کو اغوا کرنے کی وجہ یہ ہے۔“ اس نے کہا کہ اس کا باپ جو فلاں گاؤں کا بہت بڑا زمیندار تھا مگر گیا ہے۔ اس کی پہلی بیوی نے باقی تین بیویوں سے کہا کہ وہ سب وہاں سے چلی جائیں اور جائیداد میں حصے کی امید نہ رکھیں۔ دو تو بے اولاد تھیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جائیداد میں سے حصہ نہیں مانگیں گی اور جس روز ان کا کوئی ٹھکانہ بن گیا چلی جائیں گی، لیکن اس بچے کی ماں جو سب سے چھوٹی اور ننھی ہے، اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ میں اپنے بچے کا پورا حصہ لوں گی۔ چوہدری کے پہلی بیوی کے جوان بیٹوں نے اس عورت سے کہا کہ وہ گاؤں سے نہ گئی تو اس کے بچے کو غائب کر لیا جائے گا۔ پھر بھی وہ تین چار دن تک نہ گئی تو اس کے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔ بچے کو میرے گھر میں لانے والے اس گاؤں کے دو بد معاش ہیں۔ انہوں نے بچے کو اغوا کیا اور میرے گھر لا کر چھپا دیا۔ رات کو دروازہ کھلا رہ گیا تو بچہ بھاگ نکلا۔“

چوہدری نے اس کی اور پٹائی کروائی اور کہا کہ میرے گاؤں میں اغوا کے لیے بچے کو چھپایا گیا اور مجھے علم نہیں۔ تب میں نے چوہدری کو بتایا کہ یہ بچہ میرا بھانجا ہے۔

”دیکھ شیدے!“ بڑے چوہدری نے کہا: ”وہ اگر تیری بہن ہے تو اسے یہاں لے آ۔ اسے کوئی انصاف نہیں ملے گا۔ میں اس چوہدری کے بیٹوں اور ان کی ماں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تمہاری بہن اور اس بچے کو غائب کر دیں گے۔“ جائیداد اور وراثت کا معاملہ ہے۔ اس میں بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ہماری بہن کا اس خاندان سے کوئی خونی رشتہ نہیں۔ ان کے خلاف تو پولیس بھی کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔“



میں نے بچے کو مولوی صاحب کے حوالے کیا اور اپنی بہن کے گاؤں چلا گیا  
اُسے میں نے اس حالت میں دیکھا کہ وہ دو منزلہ حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھی  
زار و قطار رو رہی تھی۔ اب اس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے ساتھ نیٹ گئی اور  
بولی کہ ان لوگوں نے میرا بچہ مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ بچہ  
میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ اُسے ساری کہانی سنادی۔

”تم میرے بچے کو اپنے پاس رکھو“ میری بہن نے کہا۔ ”میں ان لوگوں سے  
جائداد کا حصہ لے کر یہاں سے نکلوں گی۔“

وہ نہیں مان رہی تھی۔ میں نے اُسے اُس کے بچے کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ  
میرے ساتھ چلی آئے لیکن وہ وہاں سے ہل نہیں رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا  
تھا۔ جیسے اُسے اپنا بچہ اتنا عزیز نہیں جتنی جائداد۔ میں اُسے سمجھانے کی کوشش  
کر رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں رہی تھی۔ اتنے میں ایک بڑا خوبصورت جوان کمرے میں داخل  
ہوا۔ وہ چوہدری کی پہلی بیوی کا بیٹا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں  
میں نے اسے بتایا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔

”اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ اُس نے کہا۔“ اگر نہیں لے جاؤ گے تو کل  
صبح اس کی لاش لینے آجانا۔ اگر پولیس کو ساتھ لاؤ گے تو تم بھی یہاں سے زندہ  
نہیں نکلو گے۔“

میں آخر اپنی بہن کو وہاں سے نکال لایا اور اسے اپنے گاؤں میں لے آیا۔  
اس کے ساتھ اس کا ایک بڑا بھائی تھا جس میں اس کے زیورات اور کپڑے تھے۔  
اتنی خوبصورت عورت کو دیکھ کر سب حیران ہوتے تھے۔ وہ میرے ساتھ غریبانہ سے  
گھر میں رہنے لگی۔ اُسے یہ رہن سہن بالکل پسند نہ تھا۔ پندرہ بیس روز بعد میں نے  
مولوی صاحب سے کہا کہ میری بہن کی شادی کا بندوبست کریں۔

چھ سات روز بعد مولوی صاحب نے مجھے بتایا کہ گاؤں میں اچھے گھرانوں کے  
دو لڑکے موجود ہیں۔ جنہیں رشتہ چاہیے لیکن دونوں کے بالوں نے ایک سا جواب دیا۔

انہوں نے کہا کہ جو لڑکی یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک بوڑھے کی بیوی بننے جا رہی ہے  
گھر سے نکل آئی تھی۔ اس پر کون اعتبار کرے گا۔ اس کے دل میں تو جائداد کا لالچ

”اصل وجہ یہ ہے رشید“ مولوی صاحب نے کہا: ”تمہاری ذات کا سب  
کہ علم ہے۔ تمہاری بہن اونچی ذات کے خاندان میں کس طرح جاسکتی ہے اگر وہ  
کی چھوٹی ذات کے آدمی کو قبول کر لے تو میں کل نکاح پر تھادوں گا۔“  
میں نے اپنی بہن سے بات کی تو اُس نے کہا۔ ”میں لعنت بھیجتی ہوں چھوٹی  
داؤں پر۔ مجھے اپنے جیسا خاوند مل جائے گا۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میں جتنی خدمت مسجد اور مولوی صاحب کی کرتا تھا، اس  
سے زیادہ خدمت اپنی بہن کی کرنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کا نوکر بنا دیا تھا۔  
گاؤں کے ہر گھر میں جاتی تھی اور اس طرح ہر گھر میں اس کی بے تکلفی پیدا ہو گئی۔

تقریباً دو ماہ گزرے، ایک صبح میں اٹھا تو میری بہن اپنے بچے سمیت غائب  
تھی۔ میں نے بھاگ دوڑ کر اور ادھر ادھر سے پوچھ کر یقین کر لیا کہ اُسے اور اُس  
کے بچے کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح وہ اپنے ماں باپ  
کے گھر سے نکلی تھی۔ اسی طرح میرے گھر سے نکل گئی۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے  
اس کی صورت نہیں دیکھی۔



کول مول دیا۔ جس طرح سرکاری پولیس کا نفرنسوں میں اخباری نمائندوں کو جواب میٹے جاتے ہیں۔ میں نے گفتگو کی کاریگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور پولیس کا نفرنس کو گپ شپ کی محفل بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کہانیاں سننے سنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

## وہ غیرت مند کہلاتے ہیں

ایک دفعہ لاہور سے دو ایک گاؤں میں رات گزارنے کا اتفاق ہوا۔ دیہات کے لوگوں کی تفریح گپ بازی ہوتی ہے۔ شام کے وقت کہیں محفل جمالیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ تبادلہ خیالات کیا کرتے ہیں۔ لیکن دیہات کے لوگ تبادلہ داستان کرتے ہیں۔ باری باری ہر آدمی ایک سنی سنائی کہانی سنانا ہے۔ ان کہانیوں میں اکثر بالکل سچی ہوتی ہیں۔ اس رات جب میں اس گاؤں کا مہمان تھا۔ میرے اعزاز میں میرے گرد اگر محفل جم گئی۔ ٹرانسکریپٹ کے ذریعے فلمی گانے اور سڑکیں بن جانے کی وجہ سے شہروں کی مغرب زدہ تہذیب دیہات میں پہنچ گئی ہے جس نے دیہات کی معصومیت کو ڈس لیا ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ ہیں جنہوں نے دیہات کے روایتی خلوص اور معصومیت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ یہ بوڑھے لوگ ہیں جو اپنے سادہ اور سستے ماضی میں جی رہے ہیں۔

ایک آدمی نے خبر سنائی کہ ساتھ والے گاؤں کی ایک لڑکی اغوا ہو گئی ہے۔ لیکن پتہ چلا ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی بلکہ اپنی مرضی سے ایک آدمی کے ساتھ نکل گئی ہے۔ یہاں سے لڑکیوں کے اغوا، ناجائز تعلقات اور اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ نکل جانے کی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک بوڑھا آدمی جو خاموش بیٹھا تھا، آخر بول پڑا۔

میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ انہیں صغرا کی کہانی سناؤ۔ بیک وقت ہار پانچ آدمیوں نے بوڑھے کی تائید کی۔ ایک نے کہا کہ ایسی عورت کہاں پیدا ہوگی۔ میں نے اس دنیا میں اپنے گناہ بخشوایے ہیں۔ بوڑھے نے کہانی سنائی شروع کر دی۔ دوسرے کبھی اس کی تائید کرتے کبھی تھوڑی سی تصحیح کر دیتے۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کہانی بالکل سچی ہے۔ میں آپ کو یہ کہانی اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔

پندرہ سولہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ کہانی سناتے والے بوڑھے کے سرال گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ پولیس میں اغوا کی رپورٹ دی گئی اور اس آدمی پر شک کا اظہار کیا گیا۔ جس کے ساتھ یہ لڑکی جس کا نام صغرا تھا۔ نکل گئی تھی۔ وہ آدمی تقریباً دس میل دور کے ایک گاؤں کا رہنے والا اپنے خاندان کا نوجوان آدمی تھا۔ اس کا نام ہاشم تھا۔ ان دونوں دیہاتوں کا مشترک تھا۔ صغرا اور ہاشم کی ملاقات شاہ صاحب کے ڈیرے پر اور ان کے بزرگوں کے عرس پر ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے بھی دیکھا کہ لڑکی دو نوکرانیوں کو ساتھ لے کر مینے میں دو تین دفعہ شاہ صاحب کے پاس جاتی تھی۔

یہ محفل جو میرے اعزاز میں سچ گئی تھی، یہ دیہات کا ایک رواج ہے جو ابھی تک قائم ہے۔ کسی گھر میں مہمان چلا جائے تو گاؤں کا ہر آدمی اسے ملنا اور خیریت پوچھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ میرے متعلق ان لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ میں لاہور شہر سے آیا ہوں اور میرا تعلق اخباری دنیا کے ساتھ ہے۔ وہ احترام سے میرے ساتھ ہاتھ ملائے اور یوں جھپک کر بیٹھ جاتے جیسے میں پیروں فقروں کے خاندان کا فرد ہوں۔ پہلے تو کچھ دیر کے لیے یہ محفل پولیس کا نفرنس بنی رہی۔ وہ مجھ سے سیاسی نوعیت کی باتیں پوچھتے تھے جو مجھے بھی معلوم نہیں تھیں۔ میں نے ہر سوال کا جواب اسی طرح



کھڑا کر دیا۔ نکاح نامہ بھی پیش کر دیا۔ نکاح پڑھنے والے مولوی اور نکاح کے گواہوں کو بھی وہاں بلا لیا۔ صغرا نے بیان دیا کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے ہاشم کے ساتھ آئی ہے۔

ہاشم بھی ادنیٰ ذات کا اور روپے پیسے والے زمینداروں کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ مرجھا تھا اور اب اپنے خاندان پر اُسی کی حکومت تھی۔ اپنی برادری کے ساتھ اُس نے اپنے تعلقات اتنے اچھے بنائے تھے کہ ہر کوئی اُس کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ کہانی سنانے والے بوڑھے نے کہا کہ ایک تولڈ کی کا بیان کام کر گیا اور کچھ پیسہ چل گیا اور یہ بھی ہوا کہ ساری برادری ہاشم کی حمایت میں کھڑی ہو گئی۔ پولیس نے اپنا کام وہیں ختم کر دیا۔

دیہات میں اپنی عزت سے اتنی آسانی سے لوگ دست بردار نہیں ہوا کرتے غریب لوگ بھی نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انتقامی کارروائیوں پر اتر آتے ہیں اور باقی عمر جیلوں میں گزار دیتے ہیں۔ صغرا کا باپ برادری کے دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر ہاشم کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ ہماری عزت واپس کر دے، لیکن ہاشم کی پوری برادری اکٹھی ہو گئی۔ سب نے کہا کہ قانونی کارروائی ہو چکی ہے۔ اگر تم لوگ دھمکیاں اور رعب دینے آئے ہو تو اپنی لڑکی کو ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔ صغرا کا باپ سمجھ گیا کہ یہاں وال نہیں گلے گی۔

ہاشم کی برادری میں آدمی بھی زیادہ تھے اور پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ دیہات میں یہی دو چیزیں طاقت کہلاتی ہیں۔ صغرا کا باپ خالی خولی دھمکیاں دے کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی بیٹی کا کبھی نام نہ لیا۔

”اب ہاشم کے گاؤں چلے چلو جہاں صغرا گئی تھی۔“ محفل میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

”اب ہماری کہانی ہاشم کے گاؤں میں چلی جاتی ہے۔“ کہانی سنانے والے بوڑھے نے کہا، ”ہمارے گاؤں کی رشتہ داریاں ہاشم کے گاؤں میں ہیں۔ وہاں

لوگ چاکر اور وہ لوگ جنہیں دیہات میں اونچی ذاتوں والے کہیں ذات کہا کرتے ہیں، اپنے پیٹ اور اپنے بال بچوں کے وفادار ہوتے ہیں۔ وہ کسی کارائز چھپا نہیں رہتے دیتے۔ اونچی ذاتوں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی محفل میں ان کے خلاف بات کرنے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا۔ بڑی ذات کا جو فرد شہر کے کسی سیاسی لیڈر کے ساتھ مل کر سیاست میں منہ مارنے لگے تو وہ اپنے آپ کو گاؤں کا وزیر اعظم جانتے لگتا ہے۔

کانوں کان یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ صغرا شاہ صاحب کے سلام کے بہانے کسی اور گاؤں کے ایک بڑے خوبصورت جوان سے ملتی ہے۔ پھر اس جوان آدمی کا نام اور گاؤں کا پتہ بھی چل گیا۔ پھر ہاشم کو دو تین مرتبہ شام کے بعد صغرا کے گاؤں کے قریب بھی دیکھا گیا۔ لاہور جیسے شہر میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے اور لوگوں کی مصروفیات بھی اتنی ہوتی ہیں کہ ہر کسی کو اپنی غلط حرکتوں پر پردہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دیہات وہ حمام ہے۔ جس میں سب ننگے ہوتے ہیں۔ وہاں کا ماحول اور وہاں کی فضا ایسی ہے کہ کسی کی کوئی غلط حرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔ ویسے بھی لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ دوسروں کی نقل و حرکت پر نظر جمائے رکھتے ہیں اور ہر آدمی پر جاسوسی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ صغرا اور ہاشم کی ملاقاتیں چھپی نہ رہ سکیں۔

ایک روز پتہ چلا کہ صغرا کو باپ نے مارا پٹا ہے۔ اس سے تیسرے روز پتہ چلا کہ صغرا لاپتہ ہو گئی ہے۔ شام تک پولیس آگئی۔ تھانیدار نے صغرا کے باپ کی حویلی کی بیٹھک میں ڈیرے ڈال دیے اور ساری رات اس بیٹھک میں سے اُن دو تین نوکرانیوں کی چنچیں سُناؤں دیتی رہیں۔ جنہیں صغرا اپنے ساتھ شاہ صاحب کے ڈیرے تک لے جاتی تھی۔ دوسرے دن پولیس ہاشم کے گاؤں چلی گئی۔ اس کے بعد پولیس صغرا کے گاؤں نہ آئی۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ صغرا کے باپ نے ہاشم پر شک ظاہر کیا تھا اور نوکرانیوں نے بھی بیان دیا تھا کہ صغرا ہاشم سے ملنے جایا کرتی تھی۔ پولیس ہاشم کے گاؤں میں گئی تو اس نے صغرا کو تھانیدار کے سامنے



سے ہمیں صغرا کے متعلق پتہ چلتا رہا کہ اُس کا وقت کیسا رہا ہے۔

ان لوگوں نے یہ کہانی آگے یوں سنائی کہ ہاشم نے صغرا کے ساتھ شادی کر لی۔ ہر کسی کو یہی توقع تھی کہ یہ جوڑا بہت خوش رہے گا۔ دیہات میں اپنی مرضی کی شادی کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں میں سے کوئی ایک لڑکی اپنے پسند کے آدمی کے ساتھ گھر سے نکل جانے کی جرأت کرتی ہے۔ لیکن لڑکی اور لڑکے کے خاندانوں میں غوفی دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکی لڑکا اگر شادی کر بھی لیں تو ان کی تمام زندگی خوف و ہراس میں گزرتی ہے۔ صغرا اور ہاشم جیسا خوش قسمت جوڑا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ اگر ہاشم کے ساتھ پسپہ اور اُس کے ساتھ برادری نہ ہوتی تو صغرا کو وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ کبھی نہ رکھ سکتا۔

لڑکی کسی گاؤں سے صغرا کی طرح نکل کر آئے اور اپنی مرضی کی شادی کر لے تو وہ گاؤں والوں کے لیے ایک عجوبہ اور تماشا بن جاتی ہے۔ صغرا کے گھر میں بھی عورتیں آتی جاتی رہتیں۔ کوئی اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتی کہ یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے، کوئی اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی کہ یہ لڑکی کتنی بے غیرت ہے۔ لیکن صغرا کو کسی کی پرہیزگاری نہیں تھی۔ اُسے اپنی پسند کا خاوند مل گیا تھا جو اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔

ڈیڑھ ایک مہینے بعد ہی عورتوں نے دیکھا کہ صغرا اُداس اُداس نظر آنے لگی ہے۔ ایک آدھ مہینہ اور گزرا تو ایک دو عورتوں نے صغرا کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے۔ وہ جوان لڑکی تھی۔ گاؤں میں اپنی ہم عمر دو تین لڑکیوں کو اُس نے اپنی سہیلیاں بنالیا تھا۔ ان کی زبانی پتہ چلنے لگا کہ صغرا ہاشم کے ساتھ خوش نہیں رہوٹے ہی عرصے بعد راز کھل گیا کہ صغرا کا غم یہ تھا کہ ہاشم اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ صغرا نے اپنی سہیلیوں کو بتایا کہ ہاشم نے اُسے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ سیانے کہتے ہیں کہ جو لڑکی تمہارے پیچھے گھر سے نکل آئے، اُس کے ساتھ شادی کر کے بھی اُس کا اعتبار نہ کرو، کیونکہ وہ کسی اور کے ساتھ بھی نکل کر جاسکتی ہے۔

ہاشم صغرا کو زیادہ باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک بار صغرا نے اُس سے کہا کہ وہ شاہ صاحب کے سلام کے لیے جانا چاہتی ہے۔ ہاشم نے اُسے کہا کہ پاس بھی تم شاہ صاحب کے سلام کے بہانے کیا کرتی تھیں۔

یہ بوڑھا آدمی اور اُس محفل میں بیٹھے دو تین آدمی مجھے یہ واقعہ دلچسپ کہانی کی صورت میں سنارہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسے واقعات کے پس منظر میں کیسے غماز اور کیسی کیسی نفیات کام کرتی ہے۔ ہاشم جوان تھا۔ اس کے پاس پسپہ تھا۔ اسے برادری کی حمایت حاصل تھی اور اُس کے پریشاب جذبات تھے۔ ان عناصر نے اُسے اپنی دلیری دی کہ اُس نے ایک لڑکی کو نکال کر اس کے ساتھ شادی کر لی لیکن وہ میں پار جاعتیں بڑھا ہوا دیہاتی تھا۔ دیہات کے لوگوں کے ذہنوں میں عزت اور وقار کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔ اس تصور میں عقل کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔ ہاشم کی اطاعت پر دیہاتی ماحول اور روایات کا جو غلبہ تھا۔ وہ صغرا کی زندگی میں زہر گھولنے لگا۔

صغرا نے ایک سال بعد ایک بچی کو جنم دیا۔ تین چار ماہ بعد صغرا کی سہیلیوں کی زبانی پتہ چلا کہ ہاشم نے اُسے کہا ہے کہ یہ بچی حبیب دودھ پینے کی عمر سے گزر آئے گی تو اُسے وہ اپنے پاس سلایا کرے گا۔

”کیوں؟“ صغرا نے اُس سے پوچھا: ”کیا میں اُس وقت مرجاؤں گی؟“  
”نہیں۔“ ہاشم نے خاوندوں کے رعب سے کہا۔ ”وہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے سائے سے بچا کر رکھنا چاہتا ہوں۔“  
”وہ کیوں؟“ صغرا نے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ سیانے کہتے ہیں، جیسی ماں ویسی بیٹی“ ہاشم نے کہا۔ ”اگر یہ تمہاری گود میں پلے تو جس طرح تم میرے پیچھے نکل آتی تھیں۔ اسی طرح یہ کسی اور کے پیچھے نکل جائے گی۔“

اس بات پر صغرا اور ہاشم کی بہت تو تومیں میں ہوئی۔ ہاشم نے اُسے کہا کہ اگر



اس نے زیادہ بک بک کی تو وہ اُسے گھر سے نکال دے گا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ صغرا کے دل کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اگر ماں باپ کی مرضی سے اس کی شادی ہوتی تو اور بات تھی۔ اونچی ذات کی لڑکی تھی۔ یہ بات کہاں برواشت کرتی۔ اب اگر ہاشم اُسے گھر سے نکال دیتا تو وہ کہاں جاتی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہاشم کا دل بڑا سخت ہو گیا ہے۔ صغرا اپنی سہیلیوں سے کہتی کہ اُسے ہاشم کے سلوک کا کوئی دکھ نہیں۔ اب اسے یہ غم کھا رہا ہے کہ اُس نے کیسے کہیں آدمی کی خاطر اپنے باپ کی گڑھی مٹی میں رول دی ہے۔

قصہ خضر یہ کہ ہاشم نے صغرا کو زر خرید لونڈی بنالیا۔ جس کا کام یہ تھا کہ ہانڈی روٹی کرے اور دن ہو یا رات، اُس کی طبیعت ساتھ دے یا ندوے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ ہاشم کی تفریح کا ذریعہ بنے۔ صغرا نے دل پر پتھر رکھ کر اس جان لیوا حقیقت کو قبول کر لیا کہ وہ ایک جانور کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ اب وہ تڑپ سکتی ہے آزاد نہیں ہو سکتی۔

تین سال گزر گئے صغرا کے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ ان تین سالوں میں ہاشم اور صغرا کا تعلق اتنا ہی رہ گیا جتنا میاں بیوی میں چند منٹ کا جھانی تعلق ہوتا ہے۔ شاید ان کی آپس میں بات چیت بھی قریباً بند تھی۔ ہاشم نے جھوٹی غیرت پر ایک وہم کو سامنے رکھ کر صغرا کی محبت کا خون کر دیا تھا۔ صغرا نے اپنی سہیلیوں سے یہ بھی کہا تھا کہ اُسے اپنی عزت اور غیرت بہت پیاری ہے، ورنہ جس طرح ہاشم اُس کے چال چلن پر شک شبہ کرتا رہتا ہے، چاہیے یہ کہ وہ بے غیرت بن کر دکھادے، لیکن وہ اتنی بے غیرت نہیں ہو سکتی۔

تین سال گزر گئے تو اُس گاؤں میں ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ادھی رات کے وقت گاؤں کے تین چار کتے جو رکھوالی کے لیے رات کو کھول دیئے جاتے تھے۔ بڑی زور سے بھونکے اور گاؤں سے باہر کی طرف دوڑے۔ چوکیدار نے بھی گاؤں والوں کو آوازیں دیں۔ گاؤں میں رکھوالی کے کتے شام کے بعد کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہ کتے مشک لینے کے اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ گھپ اندھیرے میں گاؤں کا کوئی آدمی

ان کے سامنے آجائے تو یہ کتے اُسے نہیں چھیڑتے اور اگر کوئی اجنبی گاؤں میں داخل ہو جائے تو یہ کتے اُس پر حملہ کر دیتے ہیں۔

ہاشم کے گاؤں میں رات کو رکھوالی کے چار کتے کھلے رہتے تھے۔ جن میں ایک ہاشم کا تھا۔ ان چاروں کتوں کی آوازوں اور چوکیداروں کی لٹکار پر گاؤں کے بہت سے آدمی جاگ اٹھے اور کلہاڑیاں اور لٹکھیاں لے کر باہر کو دوڑے، چوکیدار گاؤں سے کچھ دور نکل گیا تھا۔ لوگ اُدھر گئے۔ چوکیدار واپس آ رہا تھا اور چلوں کتے اس کے پاس تھے۔ اُس نے بتایا کہ سب سے پہلے رہٹ کے قریب ایک کتا اس طرح بھونکا جیسے اُس نے کسی آدمی کو دیکھا ہو۔ پھر صاف آوازیں آئیں جیسے اُس نے کسی پر حملہ کیا ہو۔ ان آوازوں پر باقی تین کتے بھی اُدھر کو دوڑے اور چوکیدار بھی اُدھر کو دوڑ پڑا۔

چوکیدار نے بتایا کہ ہاشم کا کتا دور نکل گیا تھا۔ چاندنی پھینکی پھینکی سی تھی۔ چوکیدار نے ایک تو یہ دیکھا کہ ہاشم کا کتا ایک آدمی پر اچھل اچھل کر حملے کر رہا تھا۔ دوسرے اس نے یہ دیکھا کہ رہٹ کی طرف سے ایک عورت دوڑتی ہوئی گاؤں میں داخل ہو گئی۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کون تھی۔ چوکیدار تین کتوں کی لٹکار کر اُدھر کو دوڑا جہاں ہاشم کا کتا کسی کو گراتے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ آدمی کتے کو شاید ڈنڈا یا لٹکھی مار کر بھاگ نکلا۔

گاؤں والے تو سوچتے رہ گئے کہ وہ آدمی کون تھا۔ جس پر ہاشم کے کتے نے حملہ کیا تھا اور وہ عورت کون تھی۔ جو رہٹ کی طرف سے دوڑتی ہوئی گاؤں میں آئی تھی۔ دوسری صبح گاؤں میں ایک اور تماشا ہو گیا۔ وہ یہ کہ ہاشم نے صغرا کو گھر سے نکال دیا۔ ہاشم نے اعلان کیا کہ رات کو جس آدمی پر اُس کے کتے نے حملہ کیا تھا۔ وہ صغرا سے ملنے آیا تھا اور وہ عورت جسے چوکیدار نے رہٹ کی طرف سے بھاگ کر گاؤں میں آتا دیکھا تھا۔ وہ صغرا تھی۔

ہاشم کو صغرا کی یہ حرکت اس طرح معلوم ہوئی کہ جب چوکیدار کی لٹکار پر



اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ صغرا اپنے بستر سے غائب ہے۔ ہاشم باہر نکلا تو صغرا بڑی تیز تیز چلی آ رہی تھی۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہاشم نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ صغرا نے کہا کہ وہ رفح حاجت کے لیے باہر نکل گئی تھی۔ ہاشم کو جب پتہ چلا کہ اُس کے کتے نے کسی آدمی پر حملہ کیا تھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ آدمی صغرا سے ملے آیا تھا۔ کتا اپنے مالکوں کے ساتھ جاتا ہے۔ جب وہ آدمی صغرا کے ساتھ تھا تو کتا صغرا کے پاس چلا گیا۔ کتے نے جب اپنی مالکین کو ایک اجنبی کے بازوؤں میں دیکھا تو اُس نے اس اجنبی پر حملہ کر دیا ہو گا۔

ہاشم غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس بدکار عورت کو قتل کر کے اپنے دو بچوں کو یتیم نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس عورت کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے گھر سے نکال رہا ہوں۔

گاؤں میں جس نے بھی یہ بات سنی اُس نے کہا کہ ماں ہاشم سچ کہتا ہے۔ لیکن ہاشم کی برادری کی ایک بزرگ عورت باہر آئی اور وہ صغرا کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی یہ بڑی نیک عورت ہے۔ خدا نے اس عورت کے دل میں نیکی اور رحم بھریا ہے۔ اس کا خاوند بھی جتنا رعب والا ہے اتنا ہی رحم دل ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد اس بزرگ نے ہاشم کو بلایا۔ معلوم نہیں اندر کیا ہوتا رہا۔ دوپہر کے وقت دیکھا کہ ہاشم صغرا کو ساتھ لے کر اپنے گھر جا رہا ہے۔ لوگوں کے لیے یہ بڑا اچھا تماشا تھا۔ لیکن تماشا یہیں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے دیکھا کہ صغرا کے آنسو خشک ہو گئے ہیں اور اُس کا چہرہ جو ہر وقت اداس رہتا تھا۔ چمکے لگا ہے۔ اب ہاشم کو لوگ دیکھتے تھے کہ وہ نادام سارہنے لگا تھا۔ پھر عورتوں نے یہ بتایا کہ اب صغرا ہاشم پر حکم چلاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کیا چکر چلا ہے۔ لوگوں نے ایک تماشا بھی دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کھارن کو اس بزرگ نے گھر ملا کہ بے عزت کیا۔ مار پٹائی بھی کی اور اُس کے خاوند کو تو بہت زیادہ ہی مار پٹیا گیا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ دیہات میں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

اس بارہ روز بعد یہ پتہ چل گیا کہ یہ سب کیا واقعہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ہاشم کی برادری کے ایک اونچے گھرانے کی ایک جوان عورت جس کی عمر ابھی پچیس چھبیس سال تھی۔ تین سال سے بیوہ ہو کر ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی اُس کی شادی ہو گئی لیکن تین سال بعد ہی اُس کا خاوند مر گیا۔ اس کا کوئی بچہ بچا نہیں تھا۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ہندوؤں کی لڑکی اگر شادی ہوتے ہی بیوہ ہو جائے تو اُس کا دوسری شادی نہیں کرتے اور وہ ساری عمر جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ لیکن ہمارے اکتالیس دہائیوں میں بھی ہندوؤں کا یہ ظالمانہ رواج بڑی سختی سے قائم و دائم ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیوہ کی شادی اُس کے ماں باپ اور خاندان کے لیے بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔ اکثر لوگ بیوہ کے رشتہ کو خواہ وہ جوان اور خوبصورت ہی کیوں نہ ہو۔ قبول نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک خاوند کو کھا چکی ہے۔ دوسرے کو بھی چٹ کر جائے گی۔

بات یہ کہی کہ صغرا کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ اس بیوہ نے تین چار سال کی بیوی کس طرح گزاری ہے۔ وہ چوری چھپے پانچ چھ میل دور ایک گاؤں کے ایک آدمی سے ملتی رہتی تھی۔ اُن کے درمیان یہ کھارن رابطے کا کام کرتی تھی۔ یہ کھارن صغرا کے گھر جا کر اُس کی خدمت خاطر بھی کرتی تھی۔ صغرا اُسے غریب سمجھ کر کبھی کپڑے کبھی پیسے اور کبھی اٹا دانہ دل کھول کر دیا کرتی تھی۔ اس کھارن نے صغرا کو بتا دیا تھا کہ یہ بیوہ عورت اس کے ذریعے فلاں آدمی سے فلاں جگہ ملتی ہے۔

صغرا اُس بیوہ عورت کی ماں کے پاس گئی۔ اُس نے بیوہ کا پردہ نہ ہٹایا اور یہ کہا شیداں کی شادی کر دے۔ اتنی جوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی یہ تو بالکل کنواری لگتی ہے۔ اس کا ابھی بچہ بچہ بھی کوئی نہیں۔

”دیکھو صغرا!“ شیداں کی ماں نے کہا۔ ”جو بات تم نے آج کہی ہے وہ پھر کبھی زبان پر نہ لانا۔ غیرت والے ماں باپ بیٹیوں کی دو دو شاویاں نہیں کیا کرتے۔“

صغرا نے پھر بھی شیداں کی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بات نہ بتائی جو



کھارن نے اُسے بتائی تھی۔ شیداں کی ماں کو غصہ آگیا۔

”تمہیں کیا پتہ غیرت کے کتنے ہیں۔ شیداں کی ماں نے کہا ”تم غیرت والی ہوتی تو اس طرح کسی کے پیچھے نکل کر نہ آتیں۔“

یہ ایسی چوڑی تھی جو صغراں برداشت نہ کر سکی اور واپس اپنے گھر آگئی۔ شیداں اندر بیٹھی صغراں اور اپنی ماں کی باتیں سن رہی تھی۔ شیداں نے صغراں سے کہا کہ اس کے ماں باپ قسم کھائے بیٹھے ہیں کہ اُس کی دوسری شادی نہیں کریں گے۔ تم پہلی عورت ہو جس نے میرے درو کو بچا نا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ میں زندگی کس طرح بسر کروں گی۔

”شیداں بہن!“ صغراں نے کہا۔ ”کچھ کھا کر جانا کسی کے پیچھے میری طرح نکل کر نہ چلی جانا ورنہ ساری عمر روتی رہو گی۔“

شیداں چپ رہی اور اُس نے سر اس طرح جھکا لیا جیسے صغراں نے اُس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ شیداں نے جب سر اٹھایا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”تمہارے دل کا حال صرت میں سمجھ سکتی ہوں۔“ صغراں نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں تمہارا دل کہاں ہے لیکن دل کی بات نہ ماننا۔“

”تمہیں کس نے بتایا ہے۔“ شیداں نے دکھ داری سی آواز میں پوچھا۔

”جس کسی نے بھی بتایا ہو۔ تم اس کا فکر نہ کرو۔“ صغراں نے کہا۔ ”تمہارا یہ راز میرے سینے سے باہر نہیں نکلے گا۔ جو زخم میں نے کھایا ہے، میں نہیں چاہتی کہ وہ زخم تم بھی کھاؤ۔“

”میں تمہارے بھلے کی بات کروں گی۔ تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گی۔“

”میں یہی کر سکتی تھی کہ تمہاری ماں کو سمجھاؤں۔ وہ میں کر چکی ہوں۔ اُس کا جواب تم نے سن لیا ہے۔ عورت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی کہ بھاگ جائے یا مر جائے تم مرجانا بھاگنا مت۔“

”کسی نے ایک شاہ کا پتہ بتایا ہے۔“ شیداں نے کہا۔ ”سننا ہے وہ کوئی ایسا

دل کرتا ہے کہ دشمن بھی زیر اور پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔“

”شیداں!“ صغراں نے کہا۔ ”میں بے پیری ہوں۔ شاید تمہیں میری یہ بات اچھی نہ لگے۔ میں تو صرف اللہ کی ذات پر بھکیہ لگاؤ بیٹھی ہوں۔ کسی پیر فقیر اور کسی عامل شاہ کے

اس نہ جانا۔ میں جانتی ہوں کہ تم جیسی خوبصورت اور جوان بیوہ جب کسی پیر یا عامل کے پاس جاتی ہے تو وہ کیا عمل کرتا ہے؟“ صغراں نے تڑپ کر کہا۔ ”سب فریب کاری ہے۔“

اس دُنیا میں دھوکا فریب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ محبت بھی جھوٹ ہے، تعویذ دھماکے بھی جھوٹ ہیں۔ نام صرف اللہ کا رہ جاتا ہے۔ اللہ نے ابھی تک میری نہیں سنی لیکن میں نے

امید کا دامن پکڑا ہوا ہے۔ اللہ بھی تو سننے کا۔“

شیداں جو ایک بھر پور جوان اور بڑی خوبصورت عورت تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مایوسی کی پرجھائیاں لیے اور سر جھکائے ہوئے چلی گئی۔ صغراں نے اس کا

یہ راز کہ وہ کسی سے ملتی ملاتی ہے۔ اپنے سینے میں دبائے رکھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اُس نے کہاں کو بڑی سختی سے کہا تھا کہ اگر اُس نے شیداں کا یہ پردہ فاش کیا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

اب میں واپس کہانی کے اس مقام کی طرف آتا ہوں۔ جہاں صغراں کو اونچی ذات

کی ایک بزرگ عورت اپنے گھر لے گئی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد ہاشم کو بھی اُس گھر میں بلا لیا گیا تھا اور پھر ہوا یوں تھا کہ ہاشم اور صغراں اپنے گھر آئے اور سب نے دیکھا کہ

صغراں اپنے گھر آئے اور سب نے دیکھا۔ صغراں ہنسی خوشی رہنے لگی اور ہاشم کا رویہ اس کے ساتھ بالکل بدل گیا۔

اُس بزرگ عورت کی حویلی میں جو باتیں ہوئیں وہ کچھ دنوں بعد حویلی کے باہر بھی سنی جانے لگیں بھٹے کہانی سناتے والوں نے پورے وثوق سے بتایا کہ اندر کیا ہوا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ اُس بزرگ چوہدرانی اور اُس کے خاوند نے صغراں سے پوچھا کہ یہ ات کہاں تک پہنچے کہ جس آدمی پر تمہارے کتے نے حملہ کیا تھا۔ وہ تمہیں ملے آیا

تھا اور تم اس کے ساتھ تھیں۔ صغراں نے کہا کہ میں جو بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتی



تھی۔ وہ اب نکالنا پڑے گی۔ لیکن میں یہ بات اپنے خاوند کے سامنے کروں گی۔  
سُن کر چوہدرانی اور اُس کے خاوند نے اسی وقت ہاشم کو بلایا۔

ہاشم آیا تو چوہدری اور چوہدرانی نے اُسے ترمسار کرنے کی کوشش کی اور کہا  
اچھی ذاتوں والے لوگ اس طرح نہیں کیا کرتے کہ بیویوں کو بازو سے پکڑ کر گھر سے  
باہر نکال دیں۔

ہاشم اس قدر غصے میں تھا کہ اسکے منہ میں جو آیا اُس نے بک دیا۔

”ہاں صغرا؟“ چوہدری نے صغرا سے کہا۔ ”تم وہ بات کرو جو تم کہتی تھی کہ  
اس کے سامنے کرنی ہے۔“

”میں کسی کی بیٹی کا پردہ نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔“ صغرا نے کہا: ”میں  
بھی تمہاری ہی طرح ادنیٰ ذات کی لڑکی ہوں۔ میں کوئی بھنگن اور جعداری نہیں کہ بلاؤ  
کسی کو رسوا کرتی پھروں لیکن مجھ پر خاوند کی طرف سے جو مصیبت آپڑی ہے اور جس طرح  
مجھے سارے گاؤں میں نشا کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ میں پردہ اٹھا  
دوں اور وہ راز آپ کے سامنے رکھ دوں جو میں تین چار مہینوں سے اپنے سینے میں دبایا  
ہوئے ہوں۔“

”شیداں کو آپ سب جانتے ہیں، تین چار سال سے بیوہ ہو کر گھر بیٹھی ہے۔ اُس  
کی فوراً شادی ہونی چاہیے۔ وہ ابھی جوانی کی عمر میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جوانی اُسے  
اندھا کر دے۔“

”ہر عورت تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوتی۔“ ہاشم نے بڑے غصے سے  
صغرا سے کہا۔ ”پہلے میری پوری بات سُن لو۔ اس کے بعد جو سزا مجھے دینی ہے دے  
دینا۔ لیکن تمہیں یہ بتا دوں گے کہ میں نے اپنے آپ کو ختم کرنے کا انتظام کر رکھا ہے  
اس کا ڈس سے میری لاش نکلے گی جسے تم اپنے ہاتھوں دفن کرو گے۔ شیداں کچھ عرصہ  
پار والے گاؤں کے چوہدریوں کے بیٹے اسلم سے ملتی ملاتی ہے اور تھوڑے ہی دنوں  
بعد جس طرح میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر سے نکلی تھی، شیداں بھی نکل جائے گی۔“

”تم کیا ثبوت پیش کر سکتی ہو؟“ چوہدرانی نے پوچھا۔

”یہ جھوٹ بولتی ہے۔“ ہاشم نے بھڑکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ خود بدکار ہے۔“

اور شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو بدنام کرتی پھرتی ہے۔“

صغرا پر جیسے کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ اُسے غصہ بھی نہ آیا۔ اُسے ہنسی بھی نہ آئی۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ شیداں بد معاش ہے۔“ صغرا نے کہا۔ ”وہ شریف

لڑکی ہے۔ میں اُسے نیک اور پاک سمجھتی ہوں، لیکن وہ انسان ہے۔ میں اُسے بدنام

نہیں کر رہی۔ میں خدا لگتی بات کہہ رہی ہوں۔ تم لوگ مجھ سے ثبوت مانگتے ہو۔ فوری

کہارن کو بلاؤ۔ میں اس غریب عورت کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ لیکن تم ثبوت مانگتے ہو۔

اس کہارن کے کہنے پر میں نے خود دو دفعہ اسلم کو رات کے وقت رہٹ کے قریب

دیکھا ہے۔“

”تم رات کو رہٹ پر کیا لینے گئی تھیں؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”میں شیداں کے پیچھے گئی تھی۔“ صغرا نے کہا۔ ”کہارن نے مجھے پہلے ہی بتا دیا

تھا کہ آج رات اسلم فلاں وقت آئے گا۔ میں نے دو دفعہ اس رہٹ کے قریب انہیں

رکتے دیکھا ہے۔ میں شیداں کی ماں کے پاس گئی۔ لیکن شیداں کا راز افاش نہ کیا۔ میں

نے اس کی ماں سے کہا کہ وہ شیداں کی شادی کر دے۔ اُس کی ماں نے اُنٹا مجھے بے غیرت

کہہ دیا، پھر شیداں میرے پاس آئی اور بہت دیر روتی رہی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے

معلوم ہے کہ وہ پار والے چوہدریوں کے بیٹے اسلم سے ملتی ہے۔ اُس نے یہ بالکل

نہیں کہا کہ نہیں یہ بات غلط ہے۔ بلکہ اُس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ میں نے شیداں کو

سمجھایا کہ کچھ کھا کر جانا کسی کے پیچھے نہ نکلا۔“

صغرا نے چوہدری اور چوہدرانی کو ہاشم کا وہ سلوک پوری طرح سنایا جو پانچ

سالوں سے اُس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

”میں نے اس شخص کی محبت پر اپنے والدین کی عزت قربان کر دی۔ اس کی غلام

بن کر رہی۔“ صغرا نے کہا۔ ”لیکن اس نے مجھے آوارہ اور بدکار سمجھ لیا۔ میں آپ کو



پورے پانچ سالوں کی بیٹا سنا چکی ہوں۔ میرے لیے یہ زندگی جہنم ہے۔ میں شیداں کو اس جہنم سے بچانے کی قسم کھا چکی ہوں۔  
اُسے سمجھایا کہ جس شخص کی محبت کی خاطر اپنا گھر بار اور اپنے والدین کی عزت و آبرو قربان کر دو گی، وہ اپنے دماغ میں یہ وہم بٹھائے رکھے گا۔ جو میرے پیچھے نکل آئی ہے وہ اب کسی اور کے پیچھے نکل جائے گی۔

”شیداں مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔ وہ میرے پاس آتی رہی۔ میں اُسے بتاتی کہ میرا حال دیکھ لو۔ کسی کے پیچھے نکل کر نہ جانا لیکن وہ میری بات نہ سمجھ سکی۔ کل کہاں میرے پاس آئی اور اُس نے مجھے بتایا کہ آج رات شیداں اسلام کے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس نے وقت ادھی رات کا بتایا۔ ہم چھت پر سوئے ہیں۔ ہاشم اور بچے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ہماری چھت سے رہٹ نظر آتا ہے۔ چاندنی اتنی تیز تو نہیں تھی۔ لیکن مجھے ایسے نظر آیا جیسے کوئی آدمی وہاں جا رہا ہو جہاں میں نے اسلام اور شیداں کو دوسرے تہہ اکٹھے دیکھا تھا۔۔۔۔

”میرا وجود اندر باہر سے کانپنے لگا۔ اگر اس وقت میرا یہ خاوند جاگ رہا ہوتا تو بھی میں وہی کرتی جو میں کر گزری۔ میں اُٹھی اور دو بے پاؤں نیچے آگئی۔ باہر نکلی، ہمارا کتا قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑا آیا۔ پہلے تو میں نے یہ سوچا تھا کہ جب شیداں باہر نکلے گی تو اُسے روک لوں گی۔ لیکن اپنے کتے کو دیکھا تو میرے دل میں بڑا خوفناک ارادہ آگیا۔ میں نے کتے کو ساتھ لیا اور رہٹ کے قریب دوسری طرف چھپ کر بیٹھ گئی۔ کتے کے سر اور گردن پر میں ہاتھ پھیرتی رہی۔ تم لوگوں نے ہمارا کتا دیکھا ہو اسے۔ بڑا خوفناک ہے۔ رکھوالی میں یہ بھیڑیا بن جاتا ہے۔ گاؤں میں سے ایک عورت نکلی۔ وہ شیداں ہی ہو سکتی تھی۔ اُسے دیکھ کر اسلام اوٹ سے سلمے آگیا اور اس عورت کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ میں اُٹھی۔ کتے کا منہ اسلام کی طرف کیا اور کتے کو تھپکی دے کر آہستہ سے لٹکارا اور اُس کی طرف چھوڑ دیا۔

”اسلم ہمارے کتے کے لیے اجنبی تھا۔ اُس نے کتے کی طرف دیکھا۔ لیکن کتے کی

رفتار دیکھ کر اسلم بھاگ اُٹھا۔ کتے نے اسے دُور نہ جانے دیا۔ میرے کتے کی آوازوں پر گاؤں کے تین چار کتے دوڑے آئے۔ شیداں وہیں سے واپس بھاگ گئی۔ میرا خیال ہے کہ اُسے گھر سے نکلنے اور واپس گھر جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اسلام میرے کتے سے اپنے آپ کو چھڑ کر بھاگا۔ لیکن میرا کتا اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ پھر اس کے ساتھ گاؤں کے کتے بھی شامل ہو گئے۔ اس دوران چوکیدار کی لٹکار سنائی دی اور میں نے چوکیدار کو اس طرف آتے دیکھا۔ پھر گاؤں کے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں دوسری طرف سے اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ ہاشم دواڑے میں کھڑا تھا۔ میں ہانپ رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہو۔ میں اگر کہیں ذات کی ہوتی تو شیداں کا راز فاش کر کے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر دیتی۔ میں دراصل اتنی زیادہ گھبرا گئی تھی کہ میری عقل نے بھی کام نہ کیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ رنج حاجت کے لیے گئی تھی۔ رات بھر یہ مجھ سے پوچھتا رہا اور کہتا رہا کہ جس آدمی کو کتوں نے بھگایا ہے تم اُسی کے ساتھ تھیں۔

”میں اُسی بات پر اڑی رہی جو میرے منہ سے نکل چکی تھی۔ صبح ہوتے ہی اُس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے ایک خاندان کی عزت بچائی ہے ایک دکھیاری بیوہ کو اُسی جہنم سے بچایا ہے۔ جو میرے خاوند نے میرے لیے بنا رکھا ہے۔ اگر سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو میں نے جن جن کے نام لیے ہیں، انہیں بلا لو۔ میں نے شیداں کا پردہ نہ اُٹھانے کی قسم صرف اس لیے توڑی کہ مجھے اپنے دو بچے یاد آتے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ میں ماں ہوں۔ اگر میرے بچے نہ ہوتے تو میں اس شخص ہاشم پر لعنت بھیج کر کچھ کھاتی اور مر جاتی۔ مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت ہے۔ اس نے اللہ اور رسول کی قسمیں کھا کر مجھے کہا تھا کہ میرے ساتھ آ جاؤ۔ میں ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔ لیکن اُس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ وہ میں آپ کو سننا چکی ہوں۔ یہ مجھ پر جھوٹے الزام لگاتا رہا۔“

چوہدریوں نے جب درپردہ تفتیش کی تو صغرا کی ساری باتیں بالکل صحیح معلوم

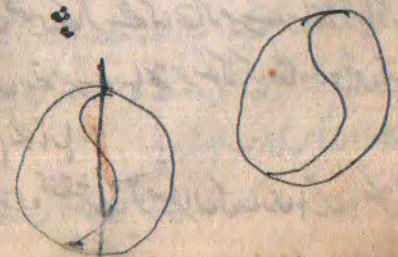


ہوئیں۔ اسی وجہ سے نوری کہارن اور اس کے خاندان کی پٹائی ہوئی تھی۔ اتنی خطرناک واردات کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ شیداں کی شادی کر دی جاتی لیکن اُسے بھی مارا پیٹا گیا اور اُس پر پھرے بٹھا دیے گئے۔

صغرا نے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھا تھا وہ پورا ہوا۔ ہاشم نے اُسے اپنے گھر میں اس طرح آباد کر لیا جیسے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا ہو۔ اُس نے صغرا کو اپنے خاندان کی چوہدرائی بنا دیا لیکن شیداں مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ دو سال بعد شیداں گھر سے باہر نکلنے لگی۔ پھر وہ گاؤں سے باہر نکلنے لگی اور پھر وہ پیر صاحب کے آستانے کی ہو کر رہ گئی۔ اُس نے اپنی حالت درویشوں اور ملنگوں جیسی بنائی۔ پورا پورا دن شاہ صاحب کے گھر میں گزارتی تھی۔ اسلم کے متعلق پتہ چلا کہ صغرا کے کتے نے اُسے بہت بُری طرح زخمی کیا تھا۔

مجھے کہانی سنانے والے جھوم جھوم کر عقیدت سے کہہ رہے تھے کہ شیداں شاہ صاحب کے سامنے میں رہ رہ کر پوری طرح درویش ہو گئی اور شاہ صاحب اس پر اتنے مہربان ہوئے کہ اپنی کرامات کا کچھ حصہ اُسے دے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ اب عورتیں اپنی مرادیں شیداں کے پاس لے کر جاتی ہیں۔ خدا نے اُس کی پھونک میں ایسا اثر ڈالا ہے کہ بے ہوش مریض اُٹھ کر چلنے لگتا ہے۔

مجھے ان لوگوں کی سادگی پر رونا آ رہا تھا۔ ایک جوان بیوہ نے شاہ صاحب کی صورت میں بیوگی کاٹنے کا وسیلہ پالیا تھا۔ پھر بھی شیداں کے والدین فخر سے کہتے ہیں کہ ہم غیرت والے لوگ ہیں اور غیرت والے لوگوں کی بیٹیاں دو برابر خاوند نہیں کیا کرتیں۔



## جرم ایک جاسوس کا

میرے نام ایک لفاظ آیا۔ کھولا تو اس میں سے کاغذوں کا ایک دبیز پلیدہ نکلا۔ اوپر موٹے قلم سے لکھا تھا۔ ”میں بھی جاسوس تھا۔“ تحریر اتنی شگستہ کہ بہت ہی مشکل سے اس صاف پتہ چلتا تھا کہ لکھنے والے کے ہاتھ میں بہت زیادہ رعشہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جاسوسی کی ایسی اصطلاحیں لکھی ہوئی تھیں جو صرف جاسوس ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہر حال میں نے یہ تحریر اس طرح پڑھی جیسے انٹیلی جنس والے کسی جاسوس کا خفیہ الفاظ میں دیا ہوا پیغام DECRYPTER کرتے ہیں۔ لکھنے والے نے ایک کہانی لکھی تھی جو میں عام اور قابل فہم زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ میں چونکہ خود جاسوسی کے میدان کا کھلاڑی رہا ہوں۔ اس لیے میں وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ کہانی من گھڑت نہیں ہو سکتی۔ ایسی کہانی وہی لکھ سکتا ہے جو جاسوسی کے لیے کسی ملک میں گیا ہو۔

لکھنے والے نے کہانی پر اپنا نام نہیں لکھا۔ اپنا اتنا پتا بھی نہیں لکھا۔ اُس نے لکھا تھا۔ ”میں ایک لمبے عرصے سے بیمار پڑا ہوں اور اب آخری منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ ڈاکٹر اور حکیم اپنا زور لگا چکے ہیں۔ میری مال مجھے پیروں اور عاملوں کے تعویذ پلا کر میرے ہی غم میں مچ چکی ہے۔ نہ کسی دوائی نے کام کیا نہ کسی تعویذ نے اثر کیا۔ میرے مرض کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں اپنا یہ مرض آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کیونکہ اسے صرف آپ سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے یوں دکھائی دیتا ہے کہ میری یہ کہانی چھپتے تک میں اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوں گا۔ پورے آٹھ مہینے لگا کر یہ آپ بتی لکھی ہے۔ ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی سکت نہیں رہی۔ میں اپنا نام اور پتہ دینا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ



میں پاکستان کی تاریخ کا مجرم ہوں۔ ہمسرو نہیں ہوں۔  
میں اُس کی آپ بیتی اُسی کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتیں۔ یہ باتیں دانستہ طور پر لوگوں سے چھپا کر رکھی جاتی ہیں۔ جنگ کی صورت میں عوام کو صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ محاذوں پر کیا ہو رہا ہے۔ محاذوں کے پیچھے اور فوجی ہیڈ کوارٹروں میں اور سیاسی میدان میں اور انٹیلی جنس کے پرووں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ عوام کے علم میں نہیں لایا جاتا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ انہیں اس سے بے خبر رکھا جائے۔ اسی اصول کے تحت میں بہت سی باتیں جن کا تعلق جاسوسی کے ساتھ ہے۔ وہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

۱۹۶۲ء میں چین اور بھارت کی جنگ ہوئی تھی۔ بھارت میں پاکستان کے جاسوس موجود تھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بھارتی جاسوس ہمارے ملک میں موجود رہتے ہیں۔ جب چین سے بھارت کی جنگ ہوئی تو بھارت نے پاکستان کے بہت سے جاسوسوں کو کپڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ پھر چین اور بھارت کی جنگ ختم ہو گئی۔ بھارت نے اس بہانے امریکہ برطانیہ وغیرہ سے پیشوا اسلحہ جمع کر لیا اور اس کی نیت کا صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ یہ اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا۔ یہ انٹیلی جنس کی باتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے دشمن ملک کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ کس طرح معلوم کرتی ہے۔ دشمن کے ارادے جاسوسوں کے ذریعے معلوم کر لیے جاتے ہیں۔ بھارت کے ارادے اور اُس کی نیت صاف نظر آرہی تھی۔ بھارت بہت بڑی جنگی طاقت بنتا جا رہا تھا۔

اُس وقت تک میں پاکستان کی انٹیلی جنس میں شامل ہو چکا تھا اور ٹریننگ بھی ہو چکی تھی۔ بھارت اور چین کی جنگ کے تقریباً ایک سال بعد مجھے ایک خاص مشن دیا گیا۔ بھارت بھیج دیا گیا۔ یہ بتانا ضروری اور صحیح نہیں کہ مشن کیا تھا اور میں بھارت میں کس طرح داخل ہوا اور ان سرکاری حلقوں تک میں کس طرح پہنچا۔ جہاں مجھے اپنے مشن کی تکمیل کرنی تھی۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ صرف بھارت کے جاسوس پاکستان میں موجود ہیں اور پاکستان اس معاملے میں کمزور ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس بہت

ل زمین کی سوں کے نیچے سے بھی راز نکال کر لے آتی ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ چوکانا پاکستانی جاسوسوں نے کیے ہیں۔ وہ بھارتی جاسوس نہیں کر سکتے۔

میں دلی چاہتا تھا اور ان سرکاری حلقوں میں داخل ہو گیا جن کے چاروں طرف مخالفت اور سپرے کا انتظام بڑا سخت ہوتا ہے۔ وہاں میری حیثیت اعلیٰ درجے کے سرکاری کی سی تھی۔ جسے انگریزی میں ۱۰-۷ کہتے ہیں۔ میں نے وہاں کے دوا اعلیٰ درجے کے کلبوں تک رسائی حاصل کر لی۔ ایک تو مجھے ٹریننگ ملی ہوئی تھی اور دوسرے یہ میٹر داغ تھا۔ جس سے میں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی۔ میں آپ کو یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی سوسائٹی میں مجھے اتنی بڑی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ میں ٹڈل کلاس خاندان کا آدمی ہوں۔ میں نے اداکاری میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ میں ہر قسم کے بہروپ بھر کر اس طرح کی ایکٹنگ کر سکتا تھا۔ میں صدر ایوب کے لب و لہجے اور آواز میں تقریر کرنے میں ماہر تھا۔ اگر میں ریڈیو پر تقریر کرتا تو سارا ملک یہی سمجھتا کہ صدر ایوب بول رہا ہے۔ میں بھٹو اور دوسرے لیڈروں کی آواز میں بھی تقریر کر سکتا تھا۔ اسی طرح میں نہرو اور شاستری کی آوازوں کی بھی سو فیصد نقالی کر سکتا تھا۔ بھکاری کا بہروپ دھارنا یا بھارت کا نواب یا ہمارا جہ بننا میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ میرے اس وصف نے اور انٹیلی جنس کی حاصل کردہ ٹریننگ نے میری پوری مدد کی۔

میں ایک مرتبہ پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو وہ طریقے نہیں بتاؤں گا جن میں نے کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری طرح وہاں جو بھی جاسوس جاتا ہے۔ وہ یہی طور طریقے اختیار کرتا ہے۔ پاکستان انٹیلی جنس کا اپنا ایک طریق کار ہے۔ میں ظاہر نہیں کروں گا۔ یہ بھی خیال رکھیں کہ میں آپ کو جاسوسی کی کہانی نہیں سنارہا۔ یہ ذاتی کہانی ہے جسے آپ میرے جرم کی داستان بھی کہہ سکتے ہیں۔ بھارت کی اعلیٰ سوسائٹی جس میں اکثریت اعلیٰ سرکاری اور فوجی حلقوں کی ہوتی ہے۔ پاکستانی سوسائٹی جیسی ہے، لیکن بھارتی سوسائٹی زیادہ آزاد اور رنگی ہے۔ وہاں شراب کھٹ



بندول چلتی ہے اور انتہا درجے کی بے حیائی نہ صرف یہ کہ فیشن میں شامل ہے۔ بلکہ ہندو مذہب کی طرف سے بھی اس پر کوئی بندش نہیں۔ اس سے مجھے خاصا فائدہ پہنچا۔ جاسوس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت بیدار مغز رہے۔ دو چیزیں انسانی دماغ کو بیکار کر دیتی ہیں۔ ایک ہے عورت اور دوسری شراب۔ جاسوس اونچی سوسائٹی میں جا کر ان دونوں چیزوں سے بچ نہیں سکتا اور جاسوس انہی دونوں کے نشے میں اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

میں جس سوسائٹی میں گیا۔ وہاں انہی دونوں چیزوں کا جادو چلتا تھا۔ مجھے انہی دونوں چیزوں کے ذریعے اپنا شن کھل کرنا تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ تھا کہ مجھ سے کوئی پوچھ بیچتا کہ میری کوٹھی کہاں ہے تو اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔ میں جہاں رہتا تھا۔ وہ ایک ٹل کلاس گھرانہ تھا۔ میں اس محلے اور گھرانے کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ پاکستان حاصل کرنے میں آج کے بھارت کے مسلمانوں نے بھی اتنی ہی قربانیاں دی تھیں۔ جتنی پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں نے دی ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پاکستان کے تحفظ کے سلسلے میں پاکستانی مسلمانوں میں اتنا جذبہ نہیں جتنا بھارتی مسلمانوں کا جذبہ شدید ہے۔ بھارتی مسلمان اس کی سزا جھگٹ رہے ہیں۔ ہندو آج تک انہیں سزا دے رہا ہے۔ یہی مسلمان تھے۔ جن کے ایک خاندان نے صرف دلی میں ہی نہیں بلکہ میں جہاں بھی گیا میری رہائش اور تحفظ کا نہایت اعلیٰ انتظام کرتی تھی۔ دلی کے ایک اعلیٰ درجے کے کلب میں جہاں سول اور ملٹری کے افسر زیادہ ہوتے تھے، مجھے جاتے ہوئے قریباً ایک ماہ گزر گیا۔ وہ لوگ مجھے کٹر برہمن سمجھتے تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ میرا بس چلے تو میں آج ہی پاکستان پر حملہ کر دوں۔ اس ایک عرصے میں میری دوستی ایک جوان سال ہندو لڑکی کے ساتھ ہو گئی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا نام جو کچھ بھی تھا۔ وہ مجھ تک رہتے دیں۔ میں اسے پورنا کہوں گا۔ بھارتی لڑکی کے کاغذات میں اس کا، اس کے باپ اور خاوند کا نام بڑے صاف الفاظ میں لکھا

ہوا ہو گا۔

دراصل دوستی کی ابتدا پورنما نے کی اور انتہا میں نے کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ہندو کے دو چار افسروں کے ساتھ تعلقات پیدا کر چکی ہے۔ یہ اس کے خاوند کی غلطی اور اس کی اپنی بھوری تھی۔ خاوند کی غلطی یہ تھی کہ پچاس برس کی عمر میں اس نے پچیس چھبیس سال عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور شادی صرف اس لیے کی تھی کہ وہ خوشامد کے لیے بھارتی حکومت کا اعلیٰ افسر بن گیا تھا اور اس کی پرانی بیوی اس کے ساتھ سوسائٹی میں گھومتی پھرتی اچھی نہیں لگتی تھی۔

پورنما کو وہ باقاعدگی سے اپنے ساتھ کلب میں اور جہاں کہیں بھی ڈیریا پارٹی ہوتی یا کنٹیکشن ہوتا ساتھ لے جاتا تھا۔ پورنما نے مجھے دراصل اپنا ایک اور شکار سمجھا تھا لیکن وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ لڑکی میری روح پر قابض ہو گئی ہے۔ اس نے اشاروں اشاروں میں مجھے کئی مرتبہ دعوت گناہ دی تھی جو میں نے اس لیے قبول نہ کی کہ مجھے عورت کے نشے سے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔ دوسری وجہ میری آدمی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لڑکی پاک صاف نہیں۔ میں نے اسے پاک صاف سمجھا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آ جاتی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں مجاہد ضرور تھا۔ لیکن میں مرد مومن نہیں تھا۔ میں نے زندگی میں ہر عیش ہمی دیکھی ہے اور اپنی توفیق کے مطابق اچھے برے کام بھی کیے ہیں۔ کوئی شریف آدمی جاسوسی میں کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن پورنما کو دیکھ کر میرے دل سے بدی کا خیال نکل جاتا تھا۔

میں نے ایک روز اپنے دل کی کیفیت اسے بتا دی۔ اس نے کہا کہ وہ اسی محبت کی تلاش میں ہے لیکن وہ جس آدمی کے قریب ہوتی ہے۔ وہ اسے ایک خوبصورت عورت سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا۔ پورنما نے یہ بھی کہا کہ سچی محبت کی تلاش میں وہ گناہوں کا ایک بت بن گئی ہے جسے یہ مرد پوچھتے ہیں۔ میں نے اس سے تسلیم کر دیا کہ وہ جس محبت کی تلاش میں ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔



ایا جا رہے۔

اس کے بجائے مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ میں اس کے ہاتھ میں لے لیے لگوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری محبت پاک تھی۔ جس میں بدی کا شائبہ تک نہ تھا لیکن پورنما کی محبت میں جو فتنہ اور خرافہ تھا وہ مجھے کبھی بھی فراموش کر دیتا تھا کہ میں ہا سوس ہوں اور یہ لوگ میرے ملک کی دشمن ہیں۔ میرے لیے اپنے آپ میں آنا دشوار ہو جایا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ہندو سوسائٹی میں کس قدر بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ پھر بھی میں اس وقت حیران رہ جاتا جب پورنما کا خاندان اسے میرے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا، میاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے مجھے اپنے گھر لکھنے پر بلایا اور دوسری مرتبہ چائے پر۔ یہ مکروہ شکل ہندو میرے ساتھ جلد ہی بے تلفت ہو گیا۔ میں اس کی دہریہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھے اپنا دوسرا دوست سمجھتا ہے۔ پورنما اپنے حسن و جوانی کے اثر سے اس بوڑھے خاندان کو بندر کی طرح پھانسی پھانسی کی ایک نقصان پہ بھی نظر رہا تھا کہ دو تین افسر پورنما کی وجہ سے میرے خلاف ہو گئے۔

چایا پانچ مہینے گزر گئے۔ میں نے اس دوران اپنا کچھ کام کر لیا تھا لیکن ایک انتہائی ضروری کام بھی باقی تھا جو خاندان میں تھا اس کے لیے آرمی کے جیتے آتے ٹانگ تک پہنچنا ضروری تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں یہ کام کر لوں گا۔ اس کا کچھ تعلق لوگڈاؤں کے ساتھ بھی تھا۔ لوگڈاؤں دہلی سے چند روز میل دور ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے وہاں انٹر فورس کے لیے ایک ایڈہ بنایا تھا۔ عام ۱۹۱۸ء کے بعد وہاں اور بھی بہت کچھ بن چکا ہے۔ مجھے وہاں تک جانا ہی تھا۔ لیکن ایک کام پورنما نے خواہش ظاہر کر رکھی تھی کہ وہ فوراً میری سیڑی میں نے اسے کہا کہ جلدی ہر مہینہ ہے چلے جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ لوگڈاؤں کی طرف چلتے ہیں۔ کتنے گلی کر اس طرف کی فضا اور ماحول بگاڑا ہے۔

اس نے اپنے خاندان کی گاڑی لی اور مجھے ساتھ بٹھا کر خود ہی گاڑی چلائی۔

اس شام کے بعد ہم دونوں نے یہ معمول بنالیا کہ کلب کے ساتھ جو ایک وسیع علاقہ تھا، اس کے ایک تارک ایک لنگ میں جا کر بیٹھ جاتے اور کبھی کبھی موقع ملتا تو اس کے خاندان کی گاڑی لے کر سہی، ایسی طرف نکل جاتے جہاں ہمیں تنہائی میسر آسکے۔ دہلی میں ایسی ہی جگہیں تھیں۔ ہمیں چار مرتبہ ہم جہان کے کنارے بھی جانیے۔ دن کو ہم ہمالیوں کے مقبرے میں بھی وقت گزارتے رہے۔ پورنما محبت کی اتنی پیاسی تھی کہ وہ میری کار جھٹکے بن گئی تھی۔ اس پر دلیا گئی کی سی کیفیت ظاہر ہو جاتی تھی۔ میری حالت تھی کہ تارک تنہائی میں بھی میرے ساتھ چکی ہوئی تو بھی میرے ذہن سے نکل جاتا کہ میں مرد ہوں اور یہ عورت ہے۔

اس نے مجھ سے چند مرتبہ پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ وہ میرے گھر آنا چاہتا تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میرے گھر آنے کی غلطی بھی نہ کرے کیونکہ میں بہت بڑے خاندان کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیوی مر چکی ہے۔ میری مال بڑی سخت طبیعت کی عورت ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اسے ایسی وجوہات بتائیں کہ کچھ بھی اس نے میرے گھر آنے کا نام نہ لیا اور وہ مجھے ایک مظلوم اور مجبور انسان سمجھنے لگی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بوڑھے خاندان سے چھٹکارا حاصل کر چاہتی ہے۔ وہ مجھے اگسا تی تھی کہ میں اسے کسی طرح ملاؤں یا کہیں بھی لے جاؤں۔

میں نے اس وقت تک کچھ راز حاصل کر لیے تھے۔ جو میں نے اپنے مخصوص طریقوں سے پاکستان پہنچا دیے تھے۔ لیکن میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ پورنما کو اپنے مشن کی تکمیل کے لیے استعمال کروں۔ وہ میرے آگے تھی تھی۔ میں اس کی اس ضروری یا اس وصف کو استعمال کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہندو سوسائٹی سے نالایق تھی۔ مگر میں نے یہ دیکھ لیا کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف نہیں تھی میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ پورنما کو استعمال کر کے کا خطرہ مول نہ لوں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ پاکستان کے اتنا ہی خلاف تھی، جتنا کسی ہندو



ان دن سے بیان تک میرے سینے میں جو لڑائی لگی رہی ہے۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا۔ ایک طرف میری محبت ہے۔ دوسری طرف میرا مذہب اور میرا لگ ہے۔ تم نے شاید محسوس نہیں کیا کہ میں کس قدر گھبرایا ہوں تھی، یہاں پہنچ کر اب تک میرا ذہن صاف ہو گیا۔ میرے دل نے کہا کہ محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میں اپنی بہت کوتاہی نہیں کر سکتی۔“

میں حیران تھا کہ میری نشاندہی کس طرح ہوئی ہے اور میرا نام یہاں کس طرح بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے پُورے دل سے پوچھا۔

”مجھ سے زیادہ باتیں نہ پوچھو“ پُورے غم سے کہا۔ ”بہار سے پاس اتنی لمبی گفتگو کا اہتمام نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہیں جیسے ہوئے تمہارا پردہ اٹھ گیا تھا۔ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ تمہارے ساتھ لگاؤ ہو اور دیکھو کہ تو کہاں کہاں جاتے ہو، کس کس کو ملتے ہو اور تمہاری سرگرمیاں کیا ہیں۔ میں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی ہے لیکن میں اپنی یہ ڈیوٹی پوری نہ کر سکی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں دھوکے میں رکھوں۔ لیکن میرے دل میں تمہاری محبت جو پیدا ہو گئی تھی۔ وہ میری بہت بڑی گہری برائی بن گئی۔ میں اپنے افسوس کو تمہارے متعلق جھوٹ موت کی رپورٹیں دیتی رہی۔ میں نے تم سے پوچھا کہ تم کہاں رہتے ہو وہ تم نے مجھے جو جواب دیا تھا وہ میں جانتی تھی کہ جھوٹ ہے۔ پھر بھی میں نے تم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ میرا خاوند اس دیکھ کر اس لیے خوش نہیں ہوتا تھا کہ تم اسے اچھے لگنے ہو بلکہ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے پاکستان کے ایک جاسوس کو مارنے کا حال میں پسندایا تھا۔“

موت جاسوسوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جاسوسوں کو کس طرح کچڑا جاتا ہے۔ لیکن پبلک کو اس کا علم نہیں۔ بہتر ہے کہ اسے ذرا صاف کر کے بیان کر دیں۔ پڑھنے والے سوچتے ہو گئے کہ میرے متعلق اگر تیرے چلی گیا تھا کہ میں جاسوس ہوں تو انہوں نے مجھے کیڑا کیوں نہیں لیا۔ بعض جاسوسوں کو ذرا نہیں

میں اس کے ساتھ پیدا ہوئی کہ باتیں کیا کرتا تھا۔ یہی باتیں اُسے اچھی لگتی تھیں لیکن میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس روز وہ کچھ گھبراؤں گھبراؤں سی لگ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک بات شروع کی تو بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ ہم اس وقت دلی اور گڑگاؤں کے درمیان جا رہے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ کوئی بات کہہ رہی تھی۔ پھر چپ کیوں ہو گئی ہے۔ اُس نے ہنس کر مجھے ٹالنا چاہا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی سانس بند ہو گئی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ آج کیوں پریشان ہے اُس نے میری طرف دیکھا اور گاڑی روک لی۔

اُس نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا۔ میں سر سے پاؤں تک حش ہو گیا۔ اچانک ارادہ کیا کہ اسے دھتکا دے گاڑی سے نیچے پھینک دوں اور گاڑی کے کھیاگ جاؤں۔ اُسے میرا نام کس نے بتایا تھا؟ وہ تو مجھے ایم۔ ڈی شرملا کے نام سے جانتی تھی۔ میں نے اُسے پھینک کر گاڑی میں بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن پورنا پر میرا ہاتھ اٹھ نہ سکا خزانہ کی دوسری صورت یہ تھی کہ میں اسے گاڑی میں پھینک دوں اور نکل جاؤں میں وہاں سے شرمک کے دابیں یا بائیں طرف کہیں بھی غائب ہو سکتا تھا۔ اگر میں دلی پہنچ جاتا تو پھر میری گرفتاری کا خطرہ بہت کم ہو جاتا۔ پُورے دل سے پوچھنے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی کہ اُسے میرا نام کس نے بتایا ہے۔ میرے سمجھنے کی بات صرف یہ تھی جو میں نے سمجھ لی کہ اسے اگر میرا اصلی یعنی اسلامی نام معلوم ہے تو اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں۔ اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔“

”گھبراؤ نہیں“ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اور اس کو چومنے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نام مجھے آج معلوم نہیں ہوا۔ میں وہ تین مہینوں سے جانتی ہوں کہ تم مسلمان اور پاکستانی جاسوس ہو۔“

”پھر تم نے مجھے کیڑا دیا کیوں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تمہیں کیڑا دے کے لیے ہی گاڑی کا ڈال سے جا رہی تھی۔“ پُورے غم سے کہا۔



ہے کہ یہ فرض تم سے انتقام لیں گے۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اپنی ڈیوٹی اپنے جہندہ کی طرح پوری کروں۔ لیکن میں تمہاری محبت کو اپنے دل سے نکال نہیں

سکتا۔ تم بھاگ جاؤ۔“

”اور تم؟“

”مجھے میرے حال پر پھوڑ دو۔“ پورنما نے کہا: ”میں کہہ دوں گی کہ راستے میں انہیں کوئی شک ہو گیا تھا اور تم کسی بہسے گاڑی رکھا کر بھاگ گئے ہو۔ پورنما نے اپنے فرض پر محبت کو غائب کر لیا تھا۔ لیکن میں اپنے فرض کو بہت پر قربان کرنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے اس بھاگنا تھا بلکہ بھاگنے کی ضرورت پر بھی کہیں نے کچھ اور معاوضات حاصل کر لائیں۔ جو پاکستان میں بھی ضروری تھیں۔ میرے پاس وہیں سے یہ معلومات بھیجے اور انتظام تھا۔ لیکن یہ ایک دانا تھا جو مجھے ذاتی طور پر پاکستان پہنچانا تھا۔ یہاں سے میرے جسم کی ابتدا ہوئی۔ مجھے وہ تین روزہ پہلے ہی وہاں سے نکلنا چاہیے تھا لیکن پورنما میرے لیے رنج پر ہی رہی۔ میں نے نو جا کر چوبیس چار دن اور سرکس ملتے ہیں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

میں نے ارادہ کر لیا کہ یہ نکل جاؤں۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ ایک لڑکی اپنے آپ کو میری محبت پر قربان کر رہی ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہ جو اب ایکلی والپس جا کر کھٹے گی کہ ماسوس بھاگ گیا ہے۔ تو اس پر کوئی انتخاب نہیں کر سکے گا۔ اسے ایذا رسانی کی اس کی دل ڈال دیں گے۔ جس میں جاہلوں کو ڈالنا ہوتا ہے۔ اپنے فرض کی خاطر مجھے ایک ہندو لڑکی کی پردہ دہائیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن میں بھی ہر سال ایک انسان تھا۔

”نہیں پورنما!“ میں نے اسے کہا۔ ”میں تمہیں ایکلی چھوڑ کر اس میں جاؤں گا۔“

”میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ میں تمہارے بغیر کیسی زندہ رہوں گی؟ پورنما نے کہا۔

کھڑا جانا۔ بلکہ ان کا بغیر تعاقب کر کے دیکھتے رہتے ہیں کہ یہ کیا جاتا اور کس قسم کے لوگوں سے ملتا ہے۔ اس طرح اس کے پورے رنگ یا گود پ کا سراغ مل جاتا ہے اور سب ایک ہی تہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں اس سطح کا جاہلوں سے بہت سے لوگوں کے ساتھ جوں اٹلی جیسی کو بھی طور پر شک تھا کہ میرے تعلقات بہت سے لوگوں کے ساتھ جوں گے۔ ان سب کا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے پورنما کو میرے ساتھ لگا دیا لیکن پورنما ہندو بھی تھی۔ پاکستان کی دشمن بھی تھی اور وہ انسان بھی تھی۔ اس کے جذبات پیاسے تھے۔ وہ ہندو حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ لیکن اس کے جذبات فرض پر غالب آ جاتے تھے۔

”میرے خاوند نے بڑی خوشی سے اجازت دی تھی کہ میں اپنے ملک کی خاطر یہ ڈیوٹی انجام دوں۔“ پورنما نے کہا: ”تمہارے متعلق انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ تمہارا اصل مشن کیا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے مشن کا کچھ نہ کچھ مستحق گرو گاؤں کے ساتھ بھی ہے۔ ہمارے دو ہندو افسروں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ان سے تم کیا کیا معلومات ملے چکے ہو۔ اب تمہیں گرفتار کرنا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ میں تمہیں گرو گاؤں تک نہیں لے جانا۔ لے چلوں۔ ہمارے افسروں کو معلوم تھا کہ تم گرو گاؤں ضرور جاؤ گے۔ جس مقام پر گرفتار کروانے کے لیے لے جا رہی تھی لیکن مجھے شک ہے کہ وہ تمہیں گرفتار نہیں کریں گے بلکہ تمہیں قتل کر کے کہیں بھیس دین گے۔“

میں نے اسے کہا کہ بھلا تم کی حکومت اتنی بوقوت نہیں ہو سکتی کہ اتنے قیمتی جاہلوں کو قتل کر دے۔ مجھے گرفتار کریں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ میں کیا کیا کرتا تھا۔

انفارمیشنز حاصل کر کے پاکستان بھیج چکا ہوں۔

”یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔“ پورنما نے کہا۔ ”تم نے ہی ایک افسروں کو بوقوت بنائے رکھا ہے۔ انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا ہے۔ وہ تم سے ذاتی طور پر انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی حیثیت نہیں بتائی۔ مجھے



میں نے اسے سٹیئرنگ سے اٹھایا خود ادرھ جو بٹھا اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں نے گاڑی گھمائی اور دل میں ایک جگہ گاڑی روک کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر گیا۔ وہاں کے لوگوں سے کچھ باتیں کیں۔ کپڑے تبدیل کر کے معمولی سے کپڑے پہن لیے۔ میں نے انہیں پورنار کے متعلق ساری بات بتادی اور یہ بھی کہا کہ میں ساتھ لیے جا رہا ہوں۔

میں نے جو بات نہیں سوچی تھی وہ اس گھر کے ایک بزرگ نے سورج لی۔ اس نے اپنی بیٹی کا ہر قصہ مجھے دے کر کہا کہ لڑکی کو اس برقعے میں لے جاؤ۔ میں واپس آیا۔ ہر قصہ پورنار کو دیا جو اس نے اسی وقت ادرھ لیا۔ اب ہمارے لیے ایک ایک کوئی تھی تھا۔ کار نے ہمیں بہت فائدہ دیا۔ ہم ریلوے سٹیشن پہنچے تیسرے درجے کے دو کلاسٹ انبار کے لیے خریدے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہوئی تھی۔ لیکن یہ ہمارے لیے پڑی لمبی مدت بنتی جا رہی تھی۔

پورنار کو راز نہ ڈبے میں بٹھایا اور میری روانہ ڈبے میں بٹھ گیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی چلی۔ اس نے ہمیں بچہ حفاظت انبار پہنچایا۔ تھوڑا کلاس کے ہجوم نے ہمیں بڑی اچھی طرح گھپلا رکھا۔ انبار اسٹیشن پہنچا تو اسے تو میرے کتے پر پورنار نے ہر وقت آرا دیا اور وہ چار دنے اوپر ادرھ لی جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پادر سے اس نے دیمانی عورتوں کی طرح لمبا گھونگھٹ نکال لیا۔ میں نے اپنا حلیہ اور چیلنے کا انداز بھی دیمانیوں کا سا کر لیا۔ پورنار کو بھی بتایا کہ وہ کس طرح چلے۔

وہاں سے ہم بس میں سوار ہوئے۔ بس میں داخل ہوتے ہی کاہارا انداز باطلی جاہلوں کا سا تھا۔ اس بس نے ہمیں لوهیڈ پہنچا دیا۔ اصل مسئلہ تو سرحد پار کرنے کا تھا۔ یہ مسئلہ اس لیے ٹیڑھا اور خطرناک ہو گیا تھا کہ سرحدوں کی ناکہ بندی لازمی تھی۔ بھارتی ٹیلیجنس کو رات ہی پہنچ چکی ہو گا کہ جس جاہلوں کو انہوں نے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ جال سمیت لاپتہ ہو گیا ہے۔ ہم جس وقت لوهیڈ پہنچے اس

”لیکن میں تمہاری محبت کی قیمت دینے کا تہیہ کر چکی ہوں۔“

اگر میں پوری تفصیل سے سُنا شروع کروں تو اس نے کیا کہا اور میں نے کیا کہا تو یہ قسمی کہا بن جائے گی۔ میری عزت یہ بات صاف کر کے بیان کرنا چاہتا تھا کہ محبت کی خاطر ایسی قربانی کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ یہ سبب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن پورنار کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ ڈال کلاس خاندان کی لڑکی تھی۔ جس کی شادی اتنے بچے انفر کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اس کی خوبصورتی تھی جو اس بوڑھے انفر نے دیکھ لی اور پورنار کے باپ کو معلوم نہیں کتنی رقم دے کر پورنار کو اپنی بیوی بنا لیا۔ ایک تو یہ شخص بوڑھا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس بوڑھے نے پورنار کو محبت کی خاطر بیوی نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اسے ناٹنی چیز بنا کر ساتھ رکھتا تھا اور اپنے بڑے انفرز کو خوش کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ یہ بوڑھا کرزی حکومت میں سیکرٹری کی سطح کا انفر تھا۔ اس نے پورنار کو بہت بُری طرح استعمال کیا۔ ایک تو پورنار کے دل میں انتقام کا جذبہ تھا۔ اور دوسرے اسے ہر انسان کی طرح محبت اور شرفیادہ از دو ادبی زندگی کی ضرورت تھی۔ وہ محبت اُسے فخر سے ملی تھی آپ بتا چکا ہوں کہ وہ انتہائی مستعجب بہندہ تھی لیکن سچی محبت کی تشنگی اس قدر شدید تھی کہ اس کے دل سے نہ صرف تعصب نکلا بلکہ مذہب بھی اس کے ذہن سے اتر گیا۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہیں آپ کو یقین دلا سکوں کہ رات کی تنہا بیویوں اور تار ایک دیرانوں میں بھی میری اور پورنار کی محبت پاک رہی۔

پاک محبت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے اور ایک ایسا نقشہ بھی ہوتا ہے جو انسان کو کسی کام کا نہیں رہنے دیتا۔ پورنار قربانی پر تل گئی تو میں نے سوچا کہ میں تو مرد ہوں مجھے بھی اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے اس سے بڑھ کر قربانی دینی چاہیے۔ اس نے حبیب یہ کہا کہ وہ میرے بغیر اکیلی نہیں رہ سکے گی تو میرے منہ سے نکلا کہ پورنار تمہارے بغیر نہیں بھی اکیلا نہیں رہ سکوں گا۔



وقت بھارتیوں کو پورنما کے خاندان کی گاڑی بھی دینی رہی۔ دینی رہیوں کے سیشن کے باہر مل چکی ہوگی اور سچے گئے ہوں گے کہ ان کا شکلا سرحد کی طرف نکل گیا ہے۔

سرحد کی ناکر بندی کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اگر نہیں اکیلا ہوتا تو میرے لیے یہ مسئلہ اتنا پیڑھا نہ ہوتا۔ ایک لڑکی کے ساتھ سرحد پار کرنا۔ تقریباً ناممکن تھا۔ یہ تو ہونہیں سکتا تھا کہ بھارتی ایشیا جس نے اپنی باڈر فورس کو چوکنا نہ کیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ مجزہ تھا۔ باڈر فورس چوکس نہ ہوتی تو پھر ایک چھوٹے میں چار لوگ کیوں کو بھی ساتھ لاسکتا تھا۔

ایک مہینے ہمیں امرتسر پہنچا دیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہم سرحد کی طرف چل پڑے۔

یہ علاقہ قریب کے لیے اچھی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء میں میری تقریر بارہ سال تھی۔ جب میں اس علاقے سے گزر کر پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ میں اس وقت بالکل منت تھا اور اب سولہ برس بعد بھی نہنتا تھا۔ اس وقت بھی دھن میں سے پیچھے ہٹا ہوا تھا اور اب بھی میرے تعاقب میں تھا۔ آپ فورجا سوسوں کن کران علاقوں سے گزر چکے ہیں، میں ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ علاقے بیان کئے جائیں۔ پورنما چڑی دلیری سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کو کش میں سے کراہنے آپ کو میرے اوپر پوچھ نہ پتا ہے۔ ہم نے آپس میں کوئی جھڑپا ہی بات نہ کی۔ پورنما نے ڈار خوف کا بالکل اظہار نہ کیا۔

میں نے امرتسر سے چار پانچ روٹیاں اور کچھ ٹوکے خریدے تھے۔ یہ ہم نے ایک جگہ بیچ کر کھالیے تو یہ کس نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً آدھ میل اور آگے گئے تو ایک ما بجاہ سے پانی پیا جو صاف نہیں تھا۔ ہم جب دیال سے چلے تو میں نے اندازہ کیا کہ سرحد قلعہ ڈی ہی دور رہ گئی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمیں دیالے راوی بھی چھوڑ کر کرنا ہے۔ مجھے دیال کی فکر نہیں تھی۔ خطہ باڈر کی کٹائی فوریں کا تھا۔ میں آپ کو یہ نہیں سنا۔ ہا کہ ہم کس طرح چلتے رہے۔ کتنی

کان ہونے اور کیسے کیسے راستوں سے گزرے۔ یہ تو آپ خود جانتے ہیں۔ میں اب آپ کو کس سرحد پہلے آتا ہوں۔ میرے کان بڑے تیز تھے۔ لادوں کی آہٹ ایک طرف سے سنائی دی تو میں نے پورنما سے کہا کہ وہیں دیک کر بیٹھی رہے۔ خواہ کچھ بھی ہوا اپنی جگہ سے نہ چلے اور میں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ سرحد پر کشتی پہرہ کہاں ہے۔ میں نے اسے سرگوشیز میں بتادیا کہ سرحد کس ہے۔

پورنما کو دو جھاڑیوں کے درمیان جھکا کر میں جھک جھک کر اور جو بھی آڑ میں آئی۔ اس کے پیچھے ہو کر ڈرائنگ نکلا کہ خطرہ کا جائزہ لوں۔ دو منٹری میرے اپنے چھ گز قریب سے گزر گئے۔ میں وہیں دیکھا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد اور سترگی گزرے۔ جن میں سے ایک اپنے ساتھی کو اپنے گھر کی کوئی مٹنا سام لٹا۔ میں نے یہ اندازہ کیا کہ چار منٹری آگے نکل گئے ہیں اور میرا سرحدت ہوگئی ہے۔ مجھے اب واپس جا کر پورنما کو ساتھ لانا تھا۔

میں جوں ہی پیچھے کو پیلا، پورنما کی بڑی خوفزدہ آواز سنائی دی۔ اس نے بلے میرے اصلی نام سے پکارا تھا اور وہ دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ رات تا ایک تھی۔ اس کی پکار سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک طرف پورنما کے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنیں۔ دوسری طرف سے بھاری بھر کم بھگتے ہوئے قدموں کی خوفناک آہٹیں سنیں۔ "ہالٹ" "ہالٹ" کی پکار بھی سنائی دی۔ میں سرحد کی طرف بھاگنے کے بجائے پورنما کی طرف دوڑا۔ میں نے پرورہ نہ کی کہ اب کیا ہوتا ہے۔ میں اور پورنما اتر چھڑے ہیں ایک دو میرے سے ٹکرائے۔ وہ میرے ساتھ چمک گئی۔ اپنی کانٹائی آواز میں اس نے کہا کہ کوئی چیز سرگرم کرتی میرے پاؤں کے قریب سے گزر گئی تھی۔ شاید سانپ ہو گیا۔ وہ اس سے ڈر گئی تھی۔

اسی علاقے میں صرف دیہاتی عورتیں رات کو بے دھڑک گھوم پھر سکتی ہیں۔ الی شرم کی لوط کی اس علاقے میں سوائے ڈرنے اور بدکنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔



اس کے بعد آپ خود جانتے ہیں کہ مجھے وہاں سے گزنا کر کے کس جہنم میں  
ال دیا گیا ہوگا۔ تفتیش کا وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس میں سے ہر اس جاہل کو  
کارا رہا جاتا ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے۔ اذیتوں سے میں بے ہوش ہو جاتا تھا اور جیب  
میں آتا تو پھر وہی تفتیش اور پہلے سے زیادہ ایذا رسائی شروع ہو جاتی۔ اس بات  
کو فکرمگسب ہی رہنے دیں کہ میں نے انہیں کیا بتایا اور کیا نہیں بتایا۔ میں اصل بات  
بولنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اذیت دینی شروع کر دی تھی  
لو کہتا تھا کہ مجھے یہ سزا ملنی چاہیے تھی۔ میرا جرم یہ نہیں تھا کہ میں پاکستانی جاہلوں  
ظالم اور پیراجرم یہ بھی نہیں تھا کہ میں ایک ہندو لڑکی کو اغوا کر کے لایا تھا۔ میرا  
اصل جرم یہ تھا کہ میں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنے جذبات کا خیال رکھا۔ وہ لازم  
ہوئیں بھارت سے لارہا تھا۔ میرے ملک کی ممانعت تھی۔

۱۹۶۵ء میں رن کچھ میں پاکستان اور بھارت کی لڑائی ہوئی اور پھر جیب بھارت  
نے پاکستان پر حملہ کیا۔ تب تک میں بھارت کے تین جیل خانے دیکھ چکا تھا اور  
اذیتیں سہسہ کر رہی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔

۱۹۶۶ء میں اعلان ناشتہ کے بعد جنگی قیدیوں کا تیار ہوا اور  
ان کے ساتھ قلعہ نے میری سمن لی اور مجھے جیل چنڈ اور پاکستانی قیدیوں  
کے ساتھ پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ میں اپنے گھر لگا اور سبیل ہار  
رہنے لگا۔ میرے بہت علاج کروائے گئے۔ سب سمجھتے تھے کہ مجھے  
بھارت میں جو اذیتیں دی گئی ہیں۔ یہ ان کا اثر ہے۔ لیکن یہ فحش میں جانتا تھا کہ  
یہ کیا اثر ہے؟

میں نے اپنے آپ کو یہ روگ لگا لیا کہ میں نے فرض پورا نہیں کیا۔ جس کے لیے  
بے چینی آیا تھا۔ میرا علاج تو نفسیات کا کوئی ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے سینے کا  
نار کاغذ پر منتقل کر کے آپ کے سامنے دکھ دیا ہے تو کچھ بوجھ بولنا ہو گیا ہے۔ لیکن میرا  
سم اندر سے اس قدر کھلایا جا چکا ہے کہ میں چند دلوں کا مکان ہوں۔

پورنا کا خوف بجا تھا۔ میں اُسے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر سرور  
کی طرف دوڑا۔ آگے سرکٹے آگئے۔ میں نے پورنا کو دبا ہا بٹھالیا۔ لیکن میں  
کپڑے والوں کے قدموں کی آہٹیں اور لٹکا قریب آری تھیں۔ میں نے جان  
لیا کہ ہم گھیرے میں آگئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اگر سرکٹوں کے اندر چلے  
گئے تو سرور کے یہ پہرہ دار سرکٹوں کی تلاشی ضرور لیں گے۔

میں نے اُن کی آوازوں سے اندازہ کیا کہ مجھے کہہ دے کہ ہرست نکلنا چاہیے۔ میں  
نے پورنا سے کہا کہ میرے ساتھ سیٹ کے بل رہتی جلد و تھوڑی دیر تک ہم  
سیٹ کے بل رہتے گئے۔ سرور کی محافل بالکل خاموش ہو گئے۔ یہ شایدا ان کی  
جال تھی۔ کچھ آواز آئے جا کر میں نے پورنا کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور ہم تیز تیز چلے  
گئے۔ اچانک پیچھے سے ایک لٹکا رشتائی دی اور ہم دوڑ پڑے۔ لیکن بیک وقت  
معلوم نہیں کتنی راٹھلیں فائر ہوئیں۔ گولیاں میرے قریب سے گزریں اور پورنا  
جو میرے ساتھ چلتی آ رہی تھی۔ پیچ مار کر گر گئی۔ میں نے فوراً اسے دیکھا۔ وہ  
گٹھنوں کے بل بھی پھڑک گئی۔ میں بے اختیار اس طرف پلکا۔ اُسے گولی  
لگ چکی تھی۔ اس کے منہ سے صرٹ اتنی سرگوشی نکلی۔ "تم چلے جاؤ" یہ اس کے آخری  
الفاظ تھے۔

میں نے اس کی نعیں یہ پتھر رکھا۔ نبض خاموش تھی۔ میرے سینے میں ایک  
راز تھا۔ جو پاکستان تک پہنچنا تھا۔ مجھے جھگ آنا چاہیے تھا۔ اب میں لکھا تھا۔  
میں شاید بیگناہ سرکٹا، چھتا دلوں سے نکل ہی آتا۔ لیکن پورنا کی موت نے میرے  
دماغ پر جبراً اثر ڈالا۔ میں یہ بھول کر کر رہی تھی۔ بڑے خطرے میں ہوں۔ پورنا کے پاس  
بیٹھ گیا۔ اس کا سراپا گوری دکھائی دیا۔ پورنا کا سر اوپر اٹھایا اور اپنی گال اس کے  
گال کے ساتھ لگا دیا اور میں بچوں کی طرح سکپاں لینے لگا۔ بھارتی باڈی کورڈ فوئرس  
کے آدمی جب مجھے پکڑ کر اٹھا رہے تھے۔ میں اس وقت بھی بچکیاں لے لے  
کر دو رہا تھا۔



پاکستان میں آج کل ہمارے سال کی عمر کا یہ لڑکا کا محنت مزدوری کرنے لگا۔ تصویر کیا جاسکتا ہے کہ اس کی جذباتی حالت کیسی ہوگی اور اس نے زندگی کے وہ دن کس طرح بسر کیے ہوں گے۔ دو سال گزر گئے اور ایک دن اسے ایک نابینا شخص نظر آیا۔ جس کی شکل و صورت اس کے باپ سے ملتی جلتی تھی۔ شریف کو اپنا باپ یاد آیا۔ یہ اندھا اس کے قریب سے گزرا تو شریف رہ نہ سکا۔ اسے روک لیا۔ وہ اس کا باپ ہی تھا۔ باپ نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ شریف نے اپنی جن کے متعلق پوچھا تو باپ نے اسے بتا کر جب قافلے پر چل ہوا تھا تو ہندو اور سکھ اس کی بہن کو پکڑ کر لے گئے تھے۔

اب اپنی بیٹی کو بڑھو بڑھاتا رہا مگر نام ہو کر پاکستان آگیا۔ اس سے بیٹی چھن چکی تھی اور کس نہ بیٹا بچھڑ گیا تھا۔ بچوں کی ماں ہندوؤں کے ہاتھوں پہلے ہی قتل ہو چکی تھی۔ باپ نے رد کر دیا اپنی بیٹی کی کھوری تھی۔ شریف نے عہد کر دیا کہ وہ اپنی ماں کے خون کا اور بہن کی عصمت کا انعام لے گا۔

اس کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو باپ مر گیا۔ شریف کے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ مگر اسے صحیح راستے پر ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے قتل و غارت اور خوراک پر محنت دیکھی تھی۔ اس سے اپنا گھر اور گھر کے تمام افراد چھن گئے تھے۔ اس کی قسمت میں محنت مزدوری لکھی تھی۔ ان حالات نے اسے سہلکار بنا دیا۔ وہ دراصل کسی سہلکار کو کرنا تھا۔ لڑکے سے چیلنا پھر اچھا خاصا استاد بن گیا۔ یہ ۱۹۵۳ کا واقعہ ہے۔ جب پاکستان میں سہلکار باقاعدہ کاروبار کی صورت میں عروج پر تھی۔ اس وقت بعض وزیروں اور بڑے افسر بھی اس کا سودا کر کے سرپرستی کر رہے تھے۔ ان حالات میں شریف کا سہلکاروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ البتہ یہ حیران کن تھا کہ اس بیٹے نے اس نے دہشت اور بے خوفی کے مظاہرے شروع کر دیے۔ وہی سرحد جو اس نے ۱۹۴۹ میں عبور کی تھی اور پھر یہ سرحد اس کے لیے لوہے کی دیوار بن گئی تھی۔ اب اس کے لیے کوئی ممانعت نہیں رہی تھی۔ وہ راتوں کو کم اور دن دن بڑھتے زیادہ بارے سرحد پار کیا کرتا تھا۔

## ہمارے لڑکے

لوگ اسے لگتا بھی کہتے ہیں۔ کھوکھے کالا اور چائے والا بھی کہتے ہیں اور جو اس کے ماضی سے آشنا ہیں۔ وہ اسے سابق سہلکار بھی کہتے ہیں۔ مگر وہ پاکستان کی داستان شہادت کے ایک باب کا عنوان ہے۔ جسے کوئی پڑھنا گوارا نہیں کرتا اور جس کے متعلق کوئی کچھ جانا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک کھوکھے میں بیٹھا جائے بیٹھا ہے۔ اسے میں جانتا ہوں یا میرے وہ معدودے چند دوست جو بھارت کی جیلوں میں کچھ عرصہ گزرا کے آئے ہیں یا اسے بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورسز، ملٹری انٹیلیجنس اور دہانوں کی پولیس جانتی ہے۔

آپ اس مصلحت کو سمجھتے ہوں گے جس کے تحت میں اس کا نام پتہ ظاہر نہیں کروں گا۔ اس کے بچائے میں اسے شریفیت اہوں کا۔ وہ بھارت کے ضلع ہوشیار پور کے ایک نچے کیریاں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ قصہ دسویں کے قریب ہے۔ اس کی عمر بارہ سال تھی۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اسے بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ مگر یہ ہجرت خون میں ڈوبا ہوا سفر تھا۔ اس کی ماں کو ہندوؤں نے جو لا ۱۹۴۷ میں ہی قتل کر دیا تھا۔ اگست میں اس نے اپنے باپ اور بہن کے ساتھ ہجرت کی۔ یہ پایادہ سفر تھا۔ راستے میں اس کے قافلے پر حمل ہوا تو وہ اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گیا۔ وہ تو قیامت تھی۔ جس میں سے وہ گزرا۔ یہ ایک لمبے اور درد انگیز کھڑے کر دینے والی داستان ہے کہ وہ کس طرح پاکستان پہنچا۔ جے کے بعد سفر کے دوران اسے نہ باپ ملا نہ بہن ملی۔



ساتھ سے واقف ہوں اور اس قسم کی اداکاری کر سکیں کہ وہ اسی علاقے کے

ہونے والے ہوں۔

شریعت فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پریشانیوں اور مایوس پھر رہا تھا۔ وہ انتقام کے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر رہا تھا۔ اس نے بھرتی ہونے کے لیے کسی سے بات کی تو اسے بتایا کہ ملٹری انٹیلی جنس کو آدمیوں کی ضرورت ہے۔ وہ گلیا تو اسے بتایا کہ دشمن کے علاقے میں جا کر بھارتی فوجوں کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ وہ سرحد کا پیرا سدرمات فراہم کر رہی ہے۔ شریعت مشرقی پنجاب سے خوب واقف تھا۔ وہ سرحد کا پیرا تھا، اس نے مصافحہ بتایا کہ وہ منگلور ہے اور دشمن کے علاقے میں کوئی شک پیدا کیے بغیر گھر نہ پھرنا خوب جانتا ہے۔ اسے جاسوسی کے لیے رکھ لیا گیا۔

ڈوجا پر روزگار دیا گیا کہ بعد ازاں سے بھارتی علاقے میں بھیج دیا گیا۔ وہ اس طرح کے دہشت گردانہ کاموں میں لا پیر رہی سے گھومنا پھرنا اور لوگوں کو مایوسی سے واپس آگیا پھر اس کے ساتھ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک دو آدمی بھیجے گئے۔ انہیں وہ دہشت گردی میں لے گیا۔ اس نے نہایت استعدادی سے سرحد پار کی۔ ایسے حالات میں جب سرحد پر دشمن کا فوج موجود ہو اور باؤں سیکورٹی فورس کی گشت بھی ہو۔ سرحد پار کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ شریعت نے یہ مشکل آسان کر دی اور وہ دوسرے دشمن سے بھی کامیاب واپس آیا۔ دوسری بار اس کے ساتھ فوجی تھے۔ جنہوں نے دشمن کی وہ پوزیشنیں دیکھ لی تھیں وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ شریعت کی تعلیم کل چھ جماعت تھی اور عملی تجربہ صرف سنگٹنگ کا تھا لیکن اس کے اندر جو جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اس نے اس کی ذہانت پیدا کر دی تھی۔ اسے خود بھی دیکھ رہی تھیں تھا کہ وہ اتنا زیادہ ذہین آدمی ہے۔ وہ دوسرے دشمن میں ہی سمجھ گیا کہ فوج کو قس قس کی سہولیات دے کر، ملٹری اور فوج کا ڈیپلانے کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی فوجی اس کے ساتھ جائے۔ وہ اب خود جانے لگا اور نہایت کامیاب معرکوں کے لڑنے لگا۔

اس نے ایک ڈھنگ اور اختیار کر لیا۔ وہ یہ تھا کہ اس نے بھارتی فوج کے اگلے مرکز

سنگٹنگ عموماً سرحد تک رہتے ہیں۔ آگے مال دوسرے گروہ لے جاتے ہیں۔ لیکن شریعت ان اچھے چیدہ سپلائیوں میں سے تھا جو خود سرحد پار جاتے اور اپنا مال خود لٹھکے پہنچا کر آتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک کام ہوتا ہے۔ شریعت کو اب یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کتنے بار بھارت کے دوسرے اندر تک گیا تھا۔ دن تک چلے جانا تو کوئی بات ہی نہیں تھی، وہ دس دن تک گیا تھا۔ وہ کئی بار اپنے آبائی قصبے کے قریب سے بھی گزرا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر جہاں وہ پیدا ہوا اور جہاں اس نے عمر کے ابتدائی بارہ سال گزارے تھے۔ اس کا خون ابل پڑتا اور اس کے دل میں انتقام کا عزم تازہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار وہ پاکستان میں مال سمیت پکڑا گیا اور اسے ایک سال سزا کے قید خانے میں لے گیا۔ وہ جب جیل سے نکلا تو اسے دیکھ کر ملٹریوں کا چٹا چٹا جیل میں اسٹانڈوں نے اسے مزید ٹریننگ دے دی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے زون کچھ میں حملہ کیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ تو شریعت کے اندر وہ انسان بیدار ہو گیا۔ جو بھارت سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ فوراً فوج میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا، مگر اسے سول یا فوجی ہونے کی وجہ سے قبول نہ کیا۔ تو انہی دنوں جہاں جہاں پیشہ اور سزا یافتہ آدمی کو فوج میں نہیں لیا جاتا۔ وہ بہت مایوس ہوا۔

رن کچھ کی جنگ بندی ہو گئی لیکن جنگ کے باؤل چھلنے لگے۔ بھارت کے اس وقت کے وزیر اعظم شام ستری نے ان افغانوں میں پاکستان کو لٹکا کر۔ "ہم اب اپنی مرضی کا حکم کھولیں گے۔" بھارتی فوجوں کی نقل و حرکت بتا رہی تھی کہ اب کیلچ بیاٹے پر جنگ ہو گئی۔ بھارت کو اپنی جنگی طاقت کا اتنا گھونٹ تھا کہ پاکستان کو ریت کی ڈھیری سمجھتا تھا۔ پاک فوج چو کس ہو گئی۔ چو کس ہونے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن کی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام فوج کا ایک شعبہ کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ایسے غیر فوجی افراد کو بھی استعمال کیا جاتا ہے جو دشمن کے



جی جاتی تھیں اور اس لیے ہی کچھ اور مشن تھے جن میں شریعت کو کاٹ میدے کے طور پر بھیجا گیا۔ اس نے نہایت جانفشانی اور شجاعت سے رابطہ قائم کیا۔ اپنے جاننا فوجیوں کو کمال دلیری سے دشمن کے عقب میں تباہی مچاتے دیکھا مگر اسے افسوس یہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اپنے افسروں سے کہا کہ اسے بھی ہتھیار دیا جائے اس نے حسب اپنے جذبات کا اظہار کیا تو اسے ایک عین گن دے دی گئی۔ اسے عین گن کے استعمال کا تھوڑا سا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں ہندوؤں سے انتقام لے لیا۔ لیکن وہ بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔

ایک شام وہ پاک فوج کی ایک پارٹی کے ساتھ ٹائیڈ بن کر جا رہا تھا۔ یہ ٹائیڈ گیسٹ بھی دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں تھا۔ راستے میں ایک پل آیا۔ جس کے نیچے دیا ہوتا تھا۔ اس نے پارٹی کو پیچھے چھپا رہنے دیا اور خود دیا پار کرنے کا کوئی اندیشہ نہ کیا۔ جہاں وہ پارٹی میں نہ ہو۔ وہ سب سے پہلے پل کا ہاتھ لے گیا۔ جوش اور جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے پل کے قریب جانے کی ہمت نہیں بولی۔ جنگل کے راستے میں کوئی پل ایسا نہیں ہوتا۔ جو فوج کی ٹھکانے میں نہ ہو۔ اسے بال پر روک دیا گیا۔ اس نے چرب زبان اور ایکٹلک سے سپاہیوں کو قائل کر لیا کہ وہ ہندو کسان سچ اور قریب ہی کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔

اس کی بد قسمتی کہ ایک سکھ حوالدار آ گیا۔ اس نے کہا کہ اس کی تلاشی کو شریعت نے کپڑوں کے اندر ٹھہر گئی تھی پھر پکڑی تھی۔ اس نے بھاگنے کا فیصلہ کیا مگر اس کے تین رات سپاہی تھے اور چوتھی طرف دیا۔ اسے زیادہ خیال ان چار چار تباہیوں کا تھا جو قریب ہی چھپے تھے۔ اس کے سامنے ایک وقت دو مسئلے تھے۔ ایک لینے فرار کا اور دوسرا پاک فوج کے جوانوں کو بچانے کا۔ اس نے اپنے سب سے قریب کھڑے بھارتی سپاہی کو کھینچ کر لیا اور بچا کی سی تیزی سے دوڑ کر دریا میں کود گیا۔ اندھیرے میں اس کے پیچھے کئی گولیاں مار گئیں۔ جن میں سے ایک گولی اس کے کندھے میں لگی۔ خوش قسمتی سے بڑی گچی گئی۔ گولی گولشت میں سے گزری۔

سپاہیوں کو اطلاع دیا مگر ان کے اپنی فوج کے پاس لانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے کا مروت ایک واقعہ شہسودا نیاکان کا ہو گا۔ ایک روز وہ سرحد پار کے کسی سرحدی قصبے میں اپنے مشن پر گیا ہوا تھا۔ لاریوں کے اڈے پر اس نے دو مرتبے سپاہی دیکھے جن کی بالین سرحد پر مورچہ بند تھی۔ یہ دونوں سپاہی چھٹی کاٹ کر اٹے تھے۔ پاکہیں سے ڈیوٹی پر آئے تھے۔ معلوم نہیں انہیں لاریوں کے اڈے پر کیوں اتار گئے تھے۔ بھر حال شریعت لے دیکھا کہ یہ سپاہی کسی گاؤں کا راستہ پوچھ رہے تھے۔ ان کی بالین وہاں تھی۔ پنجاب کے علاقے اور زبانان سے وہ وقت نہیں تھے۔ ڈیوٹی چھوٹی اردو بولتے تھے۔

شریعت نے انہیں چائے کی پیالی پر بھانسا لیا اور انہیں یہ تسلی دے لی کہ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کی بالین کے مورچوں سے وقت ہے۔ انہیں چائے اور گپ مشپ میں اُلجھا لے رکھا تاکہ ذرا شام ہو جائے۔ کچھ وقت بعد وہ انہیں ساتھ لے گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ شریعت اپنی بھارتی فوج کی بے پناہ تفریق کر رہا تھا اور پاکستان کو گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ سپاہی بڑی سادگی میں اس کے ساتھ چلتے آئے اور انہیں اس وقت اپنی سادگی کا احساس ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ وہ جس پوسٹ میں پہنچا دیے گئے ہیں وہ پاکستان کے ریجنز کی پوسٹ ہے۔ ریجنز نے ان بھارتی سپاہیوں کو فوج کے حوالے کر دیا۔

پھر چھ گھنٹہ ۱۹۶۹ کی صبح طلوع ہوئی۔ سرحد پر توپیں گرج رہی تھیں۔ ایک دھاڑ رہے تھے۔ مشین گنوں اور رائفلوں نے قیامت کا شور مچا کر رکھا تھا۔ ہندو اٹھارہ سالوں کی تیاریاں کے بعد پاکستان کو فتح کرنے آیا تھا۔ پہلے روز ہی ہر محاذ پر حملہ کر لیا گیا۔ بھارتی فوج کسی نہ کسی طرف سے آگے بڑھنے کی سرورڈ کو شش کر رہی تھی۔ شریعت پاک فوج کے کسی ڈویژن یا بریگیڈ کے ساتھ جاسوسی کے لیے موجود تھا۔ اسے اب ایک اور قسم کی ڈیوٹی دی گئی، یہ لکنا ڈیوٹی تھی۔ دشمن کے مورچوں کے پیچھے جا کر کسی قبائے ہوئے ٹائیڈ گیسٹ کو تباہ کرنا ہوتا تھا۔ کبھی یہ جیتا تھا کسی گاؤں میں دشمن نے تیل، پٹرول یا ایندھن کے ذخیرہ کر رکھا ہے۔ اسے تباہ کرنے کے لیے لکنا ڈیوٹی



اسے گرفتار کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ مگر شریف ان کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ اس سکھ نے اُسے پڑے ڈال دیا تو طریقے سے گرفتار کر لیا۔ شریف اُسے جانتا تھا۔ وہ سرحد پار کر کے اس سکھ کے گھر چلا گیا۔ سکھ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنی جوان بیٹی کو اس کے پاس ایک کمرے میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے باہر سے دو دزدے کی زنجیر چڑھا دی۔ شریف نے اسے حفاظتی اقدام سمجھا۔ سکھ اپنی بیٹی کو اس لیے اس کے ساتھ بٹھا گیا تھا کہ وہ جو ان آدمی ہے، اس کی بیٹی کے ساتھ باؤل میں گن رہے گا۔

بہت دیر تک سکھ نہ آیا تو شریف کو شک ہوا۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ تو اسے پولیس کھڑکی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ حال میں عینس گیا ہے۔ اس نے سکھ کی بیٹی سے کہا کہ اس کے باپ نے اس کے ساتھ دھوکہ دیا ہے اور اس نے اسے رہائی کو آزاد کر دیا ہے۔ بیٹی طیش میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس باپ پاکستان کا جاسوس ہے اور شریف اسی کام کے لیے پاکستان سے آیا ہے۔ شریف نے اسے کہا کہ وہ کھڑکی سے نکل جائے گا۔ لیکن اسے گولی مار دی جائے گی۔ سکھ کی بیٹی نے اسے کہا — ”میں کھڑکی میں سے نکلتی ہوں۔“

کے لیے پیش کر دیا۔

بھارت کی پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس نے اس سے خوب بدلے لیے۔ اُسے اتنی اذیتیں دیں کہ وہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہا۔ اسے مرنے بھی نہ دیا گیا۔ بھارتیوں کو معلوم تھا کہ وہ معمولی قسم کا جاسوس نہیں۔ انہوں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی اور کچھ عرصہ بعد قیدیوں کے تبادلے میں اسے پاکستان بھیج دیا۔

اس نے پورا زندگی اور بڑی لٹاکر مکی کے نیچے سے گزر گیا۔ روشنی راڈ ٹرانزپورٹ دیر روشن ہو گیا۔ شریف نے زیادہ سے زیادہ دیر پانی کے اندر رہنے کی کوشش کی اور وہ خطرے سے بچ گیا۔

کیا اس کا یہ کارنامہ معمولی تھا؟ وہ آگے جا کر دیر میں سے نکلا۔ قیض بھاڑا خون مدکنے کی کوشش تھی اور اس بگڑا پس گیا جہاں وہ چار جوانوں کی پارٹی کچھ پڑ آیا تھا؟ اگر اس کا یہ کارنامہ تفصیل سے بیان کیا جائے تو بے شمار صفحات صرف اسی کے لیے درکار ہوں گے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر یہ بتایا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ وہ انہیں کسی اور طرف لے گیا اور جیب یہ پارٹی اپنا کام کر چکی تو وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے گر پڑا۔ اس کے ساتھی اسے لٹاکر لے آئے۔

ستمبر ۱۹۶۱ء کی جنگ ختم ہو گئی۔ لیکن شریف نے ایسے محسوس کیا۔ جیسے یہ اس کی زندگی کے مشن کی ابتدا تھی۔ اس نے پاک فوج کو جاسوسی کے لیے خدمات پیش کر دیں۔ جیب فوجیں سرحدوں سے ہٹ گئیں تو وہ بھارت کے اندر جا کر جاسوسی کرنے لگا۔ اسے سرحد پار کرنے اور کرنے کی خصوصی جہازت حاصل تھی۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک اس نے کئی بار بھارت جا کر انٹیلی جنس کے لیے بڑی اہم معلومات اور دستاویزات حاصل کیں۔ دوسرے جاسوسوں کو کئی بار سرحد پار کر لائی۔ اس کا مشن کامیاب ہوتا تھا، مگر، ۱۹۶۹ء میں وہ ایک ایسے سکھ جاسوس کے ساتھ چلا گیا، جو ڈبل ایجنٹ تھا یعنی وہ دیر پہ وہ دونوں ملکوں کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ اب شریف اس کے ساتھ گیا تو اس ڈبل ایجنٹ نے اسے گرفتار کر لیا۔ یہ حیران کن نہیں کہ پاکستان نے ایک سکھ کو اپنا جاسوس بنا رکھا تھا۔ ایسا ہر ملک میں ہوتا ہے کہ ایک عرولیت ملک کے باشندوں سے ہی جاسوسی کرائی جاتی ہے۔ پاکستان میں آپ کو پاکستانی بھارت کے لیے جاسوسی کرتے نظر آئیں گے۔

بھارت کی سیکورٹی فورس ایک عرصے سے شریف کے نام سے واقف ہو چکی تھی اور



## کیا وہ پتھر تھا؟

یہ اس انسان کی کہانی ہے جس کے متعلق بھارت کے ۱۹۶۵ء کے ہوم منسٹر گوردی لانڈے نے کہا تھا۔ "اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔ اس وقت اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں، اس نے مستحضر عدالت کو یہی الفاظ رکھے تھے۔" اسے ضرور سزا ملنی چاہیے؟ اسے گرفتار کرنے والے ڈی ایس پی جالندھر ایشیا جیٹس، گیتا نے کہا تھا۔ "مجھے آج پہلی بار اپنے ڈی، ایس، پی بھونے کا احساس ہوا ہے،" جالندھر کے اخبار "پرتاب" مورثر ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء نے لکھا تھا۔ "محمد حسین جاسویں کی گرفتاری پر جالندھر کی مقامی ایشیائی پبلیشنگ جی فزیکر نے کہہ ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ بھارتی افواج کے نانہ کس طرح استان پہنچے ہیں۔"

محمد حسین کو ستمبر ۱۹۶۶ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری جالندھر میں اسی کے نانہ کردہ "پلاسٹک کے کارخانے" سے عمل میں آئی تھی۔ اس کے متعلق پھر نیپے اس اخبار کو مکمل مواد مندرجہ۔ بھارت کے تمام بڑے بڑے اخبار نمایاں طور پر۔ ہریانہ شائع کرتے ہیں۔ آخر سرخون کو فرسٹ کو ایک حکم کے ذریعے اخبارات کو اس کے کارخانوں کی مسلسل اشاعت سے روک دیا۔ کیونکہ بقول اس وقت کے ڈیفنس سیکریٹری اے ایس بی پردہ نشینوں کے نام بھی آتے تھے۔

محمد حسین ۱۹۶۶ء کے ابتدائی میں بھارت گیا اور ستمبر ۱۹۶۶ء میں پکڑا گیا۔ پکڑ پکڑا دیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء میں وہ سہ ماہی کو پاکستان واپس آ گیا ہے۔ جس شخص نے تیرہ سال ۱۹۶۶ء کے الزام میں بھارت کی قید رکھی تھی۔ اسے دل سے اتارنے کے لیے کم از کم

آج ہماری تاریخ کا یہ درخشاں باب ایک کھوکھے میں بند ہو گیا ہے۔ اس باب کا ہیرو ہمیشہ کے لیے نگٹا ہو کر اس کھوکھے میں چائے بنانا نظر آتا ہے اور سب اس کا کوئی ٹکڑا نہیں رہتا تو وہ سر جھکائے گہری سوچوں میں کھو جاتا ہے۔ شاید اپنے ہم کو تلاش کرنے لگتا ہے۔



پاکستان بڑوں کو اس نے جیل میں ٹران پھنسا سکھایا، نواز چڑھنا سیکھا تھا۔ اردو ہندوئی اور گورو کھی سکھائی اور ان کو کہتے ہی خطرہ نکال اور اذیت ناک مراحل سے بھرپور غوری گزارے گئے۔

اس پریسیپ سے پہلے تعزیرات ہند کی دفعات ۲۰/۱۲/۳۱ اور اسٹیشن لائبریری ایکٹ کی دفعہ تین کے تحت مقدمہ چلا گیا۔ جالندھر کی عدالت نے اس جرم میں دو سال قید کی سزا سنائی۔ ۱۲ برس وہ جالندھر سے رہا ہو گیا۔ لیکن وہیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہاں سے جیل میں ہی مروانے کی کوشش کی تھی۔ ایک سکھ بدعاش سے اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن انڈین تحالی کی فیملی مدد شامل حال تھی کہ وہ چاقو کے حملے سے صاف بچ گیا یہ کچھ نوجوانی رہا تھا کہ تدرست نے اسے اس طرحے امتحان میں بھی ڈالا کہ اس کی والدہ اس کے غم میں انتقال کر گئیں۔ محمد حسین نے یہ صدمہ اپنی ٹھوس شخصیت میں جذب کر لیا۔ اور اپنے ذرائع میں محو رہا۔ اب اس کا فرض یہ رہ گیا تھا کہ قید و بند میں دشمن کی اذیتیں برداشت کر کے ادرا سے کچھ نہ بتائے۔ اس کے متعلق ڈی جی جیڑا سے۔ سی پال جو بھارت کی مشہور فلم دو آنکھیں بارہ ہاتھ کا کہانی نگار اور مشہور افسانہ نگار بھی ہے۔ نے کہا تھا۔

”محمد حسین کے بعض چہرے بنے ہوئے ہیں۔“

۱۹۵۱ کی جنگ چھوڑ گئی۔ محمد حسین دشمن کی نظر بندی کا لالہ نہ تھیں تھا۔ جنگ کے بعد جالندھر کی سیشن کورٹ میں اس کے خلاف جاسوسی کا مقدمہ چلا گیا۔ رتن لال کرگ ۱۷ ڈی ایم جالندھر کی عدالت سے یہ کہیں کرتا دیکھنا ایدیشن سیشن جج کی عدالت سن گیا تھا۔ جہاں پاس وقت کے ہر منٹ کو لازمی لال سندھ آفس پر ٹری پی ایلی گیتا عدالت کے نام اس کا بیچہ صوبی حکم ۱۲/۵/۱۱ کے تحت منور سزا دی جائے۔ لے کر آیا تھا۔ محمد حسین کو پندرہ سال کی سزا دی گئی۔ لیکن اسپل پر کہیں سی پال کی کورٹ میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کی سماعت انڈیا کے مشہور افسانہ نگار و جرنلسٹ بھیر کی کہانی بھجیت سنگھ بھیر نے کی۔ محمد حسین کے خلاف حکومت کے پاس

تیر و صدموں تو گزارنی پڑے تھے۔ لیکن ہم اسے دل میں جگر ہی نہیں دی۔ قیام پاکستان سے ہی بھارت کی کانگریس قیادت نے پاکستان کو جس طرح ختم کرنے کے منصوبے بنائے شروع کر دیے تھے۔ وہ ایک کھلا راز ہے۔ اس کی ٹوٹیاں آپ ”حکایت“ میں پڑے رہتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ دشمن کے کردہ و روا ٹھوسے خبر داد۔ آگاہ رہا جائے اس کے لیے دشمن کی ایک ایک لمحے کی خبر درکار تھی۔ تاکہ قبل اس کے کہ دشمن بڑھ کر ہمیں نکل لے ہم خود ٹوٹے بڑھ کر اس کا گلہ کر دیں۔ اس مقصد کے لیے محمد حسین کو ۱۹۵۱ میں بھارت بھیجا گیا۔ اس نے بھارتی وزارت دفاع کے کئی ایک اہم راز اپنے من کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان پہنچا دیے۔ اس دلدرا انگریز کہانی کا یہ حصہ کہ اس نے یہ راز کس طرح پاکستان پہنچائے۔ ایک ایسا راز ہے جس سے پاکستان کی تاریخ ہمیشہ بے خبر رہے گی۔ ایسے راز معمولاً بتائے نہیں جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ جاسوس یا کمائڈو پور سے بریگیڈ جیتنا کام کر دیتا ہے۔ محمد حسین کے متعلق صرف یہ بتایا جاسکتا ہے کہ وہ ہندو بن کر انڈین پاسپورٹ پر پاکستان آیا تھا۔ ان دنوں ہندو سندھ میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ستمبر ۱۹۵۱ء میں محمد حسین ایک مخبر کی اطلاع پر جالندھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ مگر فزائی قاضی پورہ میں ہوئی تھی۔ جہاں اس نے پلاٹنگ کی اسٹیا بنانے کا ایک کارخانہ قائم کر رکھا تھا۔

تفتیش کے جن جن مراحل سے اسے گزارا گیا وہ وہی بیان کر سکتا ہے۔ میں نے بہر ۱۹۵۱ء میں جب پہلی بار اسے بھارت کی ناچھ جیل میں دیکھا اور اس کے متعلق ان کی رسیوں تو قیدی نہیں آ رہا تھا۔ دشمن کی ہوئی مختلف ذہنی اور جسمانی فزیتوں نے اسے بہت لاغر کر دیا تھا۔ لیکن کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی باؤں کی آنکھیں اس امر کی علامت تھیں کہ یہ شخص ناٹا بن لے سچ ہے۔ اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے جو حوصلہ دینا شروع کر دیا اور کہا۔ ”گھبرانا نہیں بس اب ہم صدمہ رہا ہو جائیں گے۔ میں ہر گز بچا اس کا منہ دیکھے جا رہا تھا کہ ۱۰ سال قید کا ٹکڑی وہ مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ بھارت کی جیل میں سرپرستی قیدی کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ جاتے کتے



اے امریک شریک سٹیج گار کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ چاروں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور شریک نامعلوم سمیت کو دھانے ہو گیا۔ اس دوران جیب انہوں نے آپس میں بات کرتے کی کوشش کی تو انہیں سختی سے منع کر دیا گیا۔ کافی دیر شریک کو ایک جگہ رکھا گیا گیا۔ یہاں سے میں باقی اپنی موجودہ زمین کو زانیہ ہی سنا تا بہوں یہ مختلف قسم کی آوازوں نے مجھے احاس دلا دیا کہ یہ کوئی چھڑنی یا پھانسی قسم کی کوئی جگہ۔ شریک رک گیا۔ کسی کے جھاری قذروں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک گھنٹہ دار آواز بلند ہوئی، تمہارا لب سے پانچ منٹ بعد گولی مار دی جائے۔ پانچ منٹ آپس اس بات چیت کر سکتے ہو۔ مرنے بیٹنے کے کئی مراحل سے میں گزر چکا تھا۔ لیکن ایسے موقع پر رت یہ سوچ کر پیشان ہو گیا کہ اگر میری لاش کو پاکستانی ٹی نصیب نہیں ہوگی مگر اب تک اس امید پر زندہ تھے کہ وہ نامے اپنے وطن میں جائیں گے۔

آواز سنائی دی۔ بدگمانی سے بچے آگیا گیا۔ خدا حافظ۔ اس نے مشکل حالات دیکھے۔ ایک آدھ منٹ بعد یوں قائم روئی آواز سنائی دی۔ گیا۔ اطلاعات شاہ کے گھر سے نکلا۔ انا بڈوٹا انا میرا جھوٹا، ہم تینوں نے پڑھا۔ دو منٹ اطلاعات شاہ کی آواز آئی۔ اب تو جاتے ہیں یکدم سے تیسرے۔ پھر ملین کے اگر خدا والا۔ اس نے ہسکون کو زانیہ ہی سنا تا بہوں اور سوئے منتقل چل دیا۔ تیسری بار تین فائبر جوئے میں اپنی باری کی منتظر تھا کہ ایک شریک چل چلا۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی اور اب ایک جیب میں منتقل کر دیا گیا۔ جیب ابخانی منزل کی طرف رو دنا نہ ہوئی۔ میں بالکل کراہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میرے ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔

”تو مارے لیے کوئی اور جگہ منتخب کی گئی ہے،“ سمین کو انگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اشارے کیا۔ محمد حسین خاموش رہا۔

”یہ لوگ ایسے وقت میں غائب ہوئے چپ کیوں سادہ لیتے ہیں۔ پتیلی دفعہ ہی اس اشارے کے ہم سے کہ ایک لحظہ بھی گزرے نہیں نکالا تھا، اس اشارے کے کہا۔ یعنی اس سے کسی دہائیہ کا کم کم دفعہ کر چکے تھے اور ان کے افسانے سے ہم سب کو کراہا گیا۔“

کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ زبان سے وہ کچھ نہیں مانا تھا رت ایک معروفہ کی بنا پر اسے جاسوس ثابت کیا جا رہا تھا۔ اس عدالت میں پنجاب گورنمنٹ کے سیٹ کو فساد نے اس پر جو سب سے بڑا الزام لگایا وہ یہ تھا کہ اس کے بہت سارے دوست ہندو ہیں۔ یہ طور پاکستانی ہے پڑھا کھا ہے۔ انڈیا میں اس کا دو سال سے مستقل قیام ہے۔ اس لیے جاسوس ہے۔

مجھ کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے سزا دے تو کس جرم میں۔ اس نے سیٹ کو فساد سے کہا تھا۔ ”میرے ۹ فیصد دوست مسلمان ہیں۔ میں انڈین ہوں ایک معزز عدالت کا جج ہوں ملور۔ ۹ فیصد دوست پاکستانی ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں غدار اور جاسوس ہوں؟“ سرکاری وکیل اپنا سامنہ کر رہ گیا۔ ہائی کورٹ نے محمد حسین کو زوری کر دیا۔ اسی اثنا میں انفارمیشن سروسز انڈیا کا بھی حکم نامہ حکومت پنجاب کے ہاں آگیا کہ اس پاکستانی کو ضرور سزا دی جائے۔ پنجاب محمد حسین کو ڈیفینس آف اٹلر یا دوزخ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد حسین کو اطلاع ملی کہ اس کی جہان بیوہ ہوئی ہوئی ہے بھائی ایک ہی تھا۔ جوا بھی لکھانے کے فانی نہیں ہوا تھا۔ سالا بوجھ بڑھے باب کے کندھوں پر آکر پڑا۔ جو بیٹے کی مائی کے لیے دن رات ارباب اختیار کے دروازے کھٹکھٹا رہا تھا۔

۱۹۶۷ میں نظر بندی ختم کر کے اس پر ٹریڈ رٹ ہند کی دفعہ ۸۲ کے تحت مقررہ

قائم کیا گیا۔ یعنی وہ ہندوین کر پاکستان گیا تھا۔ قانون کی سرکوبیاں اٹا کر اسے ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ جگہ زیادہ سے زیادہ سزا اس دفعہ کے تحت ۱۰ ماہ اور جرم ۵۰۰ روپے تھا۔ اس کے بعد کئی دوسرے کبھی اسے تین ماہ کی سزا ملتی کبھی چھ ماہ کی۔ کبھی کوئی دفعہ عائد کر دی جاتی کبھی کوئی دفعہ۔ ذہنی علما سے بہت جھگڑے دیے گئے۔ کئی دفعہ اسے مائی کے لیے سرحد پر لے جا کر اور پاکستان کا جھنڈا دکھا کر واپس لے گئے۔ حکومت جیران تھی کہ ابھی تک وہ شخص زندہ ہے۔ ضروری ۱۹۶۹ میں اسے تین پاکستانی قیدیوں اطلاعات شاہ، گلزار اور مجریہ کے ساتھ اس طرح مایا گیا کہ جیل



اصیٹ پی کی انتہا ہے کہ میں زندہ ہوں اور ملک و قوم کے لیے جہاد کر رہا ہوں۔ پھر وہ ۱۹ ستمبر تک جہاد سے متعلق ہی مختلف پیموں میں پشیمان بھی نظر نہیں رہا۔ کبھی حوالاتی اسی قیدی۔ بس وہ تو تھیکر افسان بن چکا تھا۔ پھر ایک روز وہ ہمارے ساتھ رہا ہو کر استنان آیا۔

سات دن تک ہم اس کا گھر ڈھونڈتے رہے۔ آنکھیں روز گھر ملا۔ وہ بھی اپڑا ہوا اب دبان رکھا ہی کیا تھا۔ گھر کو گردش دانا نہ ہو چکا تھا۔ ایک ٹوسٹ پورٹے مکان میں یہ بہن اپنا بیاد وجود اور دیکھوں کا بوجھ لیے سسک سسک کر زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ سلسل حادثات نے پھوٹے جھانے کو فحش میں ہی پختہ کر دیا تھا۔

آج محمد حسین کو رہا ہوئے تیرہ ماہ ہوئے کوہین بکین ہنزہ گھر کی حالت وہی ہے۔ وہ ایک خوشحال گھر چھوڑ کر ملکی خدمت کو گیا تھا۔ جان کی بازی لگائی تھی۔ آج دلیپ سے تو ہم ملا سے یہ کچھ دیا ہے۔ وہ ابھی تک بیا رہے اور جی ان بھی کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

اپنی جان کی بھیک مانگنی پانی پیچھے تھی۔ سبب ایک سرحدی چوکی پر ٹکر لگی۔ شام کا وقت ہو چکا تھا اور مغرب کی افواہ کی آواز پاکستانی پوسٹ کی طرف سے آرہی تھی۔ محمد حسین کی آنکھیں بازو دی گئیں۔ ساری رات وہ اڈین پکٹ کے ایک کمرے میں بند موت کی انتظار کرتا رہا۔ لیکن پاکستانی سرحدی چوکی سے صبح کی اذان سنائی دینے لگی۔ محمد حسین گولی مارنے کے بجائے واپس لے گئے۔ یہ ذہنی اذیت دینے کا ایک طریقہ تھا۔ است راہو تالی کہنی پیٹہ کوا طر میں نے گئے اور ایک قصائی قسم کے بھارتی ڈی ایس پی رہا رہا۔ سکورٹی فوری (بھلکر کے شہر کر رہا۔

”کون ہے؟“ ٹھہرے پڑے اگھر سے لے جے میں ڈیوٹی سنتری سے پوچھا۔

”جناب پاکستانی جا سوس محمد حسین ہے۔“

”اوسے تو محمد حسین ہے؟“ اس نے محمد حسین کو کھانے والی نظروں سے دیکھا ان

کہا۔ ”سانپ سے ڈسوا کر مار دو۔“

محمد حسین واپس جیل میں چلا گیا۔ جہاں معلوم ہوا کہ وہ محض ڈھونڈ نک تھا۔ یہ اسے انتہا درجے کی ذہنی اذیت پہنچانے کی ایک کارنامہ کو شش تھی۔ پھر کلوار اور اطلالت کر اجنا لے اور مجید کو کھیم کمر اور محمد حسین کو راجہ تال پہنچا دیا گیا۔ سب کو ایک دوسرے کے متعلق یہی کچھ بتایا گیا کہ اسے مار دیا گیا ہے۔ لیکن سب زندہ تھے۔ یہ بھی نہی انڈیا کا ایک طریقہ تھا کہ گولیاں چلا کر سب پر موت کا خوف عطا کر دیا جائے۔

اگست ۷۰ء میں محمد حسین کو بوڑھے باپ کی موت کی اطلاع ملی۔ چھ سال اس بلوچ

آدمی نے ریفریجیات کا صدر برداشت کیا تھا اور پندرہ سال سے اس کی آنکھیں پیچھے کر دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں۔ ادھر سے بوکی بیوہ ہو گئی۔ یہ صدے کہ ایک برداشت ہوئے۔ آخر ایک روز یہ آنکھیں بھی پھیر گئیں۔ اب جو ان بیوہ بن دو بچوں اور ایک عالا کے ساتھ جو کسی قابل ہو گیا تھا۔ زندگی کے کانٹ رہی تھی کہ اطلاع ملی۔ ”مکان بھی پہلا ہے۔“ یہ انعام تھے جو قریب اور قوم کی طرف سے لازماً دیا جاتا ہے۔

”دیکھا؟“ محمد حسین نے مجھے بھارت کی ایک جیل میں ۱۹۷۱ میں کہا تھا۔ ”یہ میرا



ایس آئیں گے۔ ذرا تصور فرمائیے کہ دو تین ہزار نفری کی فوج کے مورچوں میں دس یا پانچ ہزار لوگ کا لگس جانا اور تنہا ہی پکارنا کیا معنی رکھتا ہے۔ صرف تصور سے ہی رد نکال کر لے جو جاتے ہیں۔

جسٹریٹ کے پہلے ایک فوج کی انٹیلیجنس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا کہ جرمنوں کے سامنے دشمن کا فوجی اجتماع کہاں ہے۔ جرمنوں کے قریب دریا پایا ہے۔ جن کے سامنے کینیا نام کا ایک بھارتی گاؤں ہے اس سے کچھ آگے سے ایک سڑک نکلا پور سے پٹار کر جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف بھارت کے پگٹانے، اردستان، پکھیریوں وغیرہ نام کے گاؤں آباد ہیں۔ یہ تمام گاؤں تھا پٹوڑیہ بابا نامک میں ہیں اور ان کی تحصیل پٹار ہے ان دیہات کے علاقے میں بھارتی فوج کا اجتماع تھا۔ جسے جرمنوں کے حملے کو ملک دینی تھی۔ ایسا لکھوٹ کی سرحد پر کسی اور مقام پر محکم کرنا تھا۔ ڈیرہ بابا نامک سے بذریعہ ریل گاڑی امرتسر جا رہی تھی۔ اس سے تین سو پندرہ نامک ایک چھوٹا سا ریوے سٹیشن آتا ہے۔ اس کے قریب دشمن نے ایمرنیشن کا ذخیرہ رکھا تھا۔ دشمن کی جنگی طاقت ایک فوج کی بہت بات پانچ لاکھ سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ صرف افراد کی قوت سے کریں تو سیکورٹ، چوڑا اور جیسپر سیکڑوں میں دشمن کی پچاس نفری نے عماد کیا تھا۔ جسے رد کرنے کے لیے ایک فوج کی کل نفری نو ہزار تھی۔ بینکوں اور قریب خانوں کا تناسب بھی یہی تھا۔ ایسا صورت حال میں ضرورت محسوس کی گئی کہ کمانڈروا پیشہ دشمن کو تنہا ہی قتل کر دینا تھا۔ یہ کام کیا جائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے چند ایک جاننا دشمن کے اسے ہرگز نہ لے گا۔ اس سے کہیں زیادہ فورس (پرمکھ کرنے کے لیے جائیں اور مطلوبہ ایسا حاصل کریں۔

ایک فوج کی شجاعت کا یہ پہلو دکھنا چاہتا ہے۔ اس کی تفصیلات سے حاضری بخشے بغیر نہ رہے گی۔ کیونکہ تفصیلات بھگی دراز ہیں۔ ایک کمانڈو پارٹی منتخب کی گئی جس کے اہل یہ کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس میں کون کون تھے اور وہ کہاں کہاں گئے رہے اسلئے۔ ہم ہی جانتے ہیں کہ وہ پاکستان کی دیہاتی ماڈل کے جوان بیٹے تھے اور درج

## ڈیلا مینٹل

یہ کہانی ایک پاکستانی جاسوس کی ہے۔

اگر آپ مشرقی پنجاب رجسٹرار کے کسی جیل خانے میں بھی جائیں۔ جہاں جاسوسوں کو قید میں رکھا جاتا اور ان سے ان کے پورے رنگ رگوں کی نشاندہی کرانے کے لیے انہیں دردوں کی طرح پیرا پھاڑا جاتا ہے۔ وہاں آپ ”ڈیلا مینٹل“ کا نام ضرور سنے ہیں گے یہ اصل نام عبد اللہ ہے جس کو لکھوٹ کی تحصیل نادر وال کی پولیس کے ریکارڈ میں ڈیلا مینٹل سہرا انت کے نام سے درج ہے۔ اسے ”ڈیلا مینٹل“ کا خطاب بھارتی پولیس، انٹیلیجنس اور جیل خانے کے طاقت اور انداز کی گراوی جرائم پیشہ قیدیوں نے دیا تھا۔ مینٹل سے ان کی مراد مینٹل کیس یعنی پاگل تھی۔ ڈیلا جاسوس کے فن میں پگ پگ کی حد تک دلیل تھا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح بھارتی فوج نے سیالکوٹ سرحد پر جرمن کے مقام پر محکم کیا۔ یہ ایک دھوکہ تھا۔ ان کا پڑا عملہ شمال کی جانب سے سیالکوٹ کی طرف سے آ رہا تھا۔ یہ ان کے بیکس ڈیڑھ کی لینا تھی۔ جو کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح آئی۔ اس سے پہلے دشمن پاک فوج کو یہ جھانسنہ دینا چاہتا تھا کہ وہ جرمن کی طرف سے محکم کرے گا کہ ایک فوج اپنا دفاع اس طرف منتقل کر دے۔ آج کے دذریعہ جاسوسی یعنی انٹیلیجنس اور کمانڈو واپیشہ دشمن کے بغیر جنگ جیتنا ممکن نہیں۔ کمانڈو واپیشہ دشمن کے بعد رٹا کا گشتی پارٹیوں (ٹانک پارٹیوں) اور ٹینک پارٹیوں کے ٹینک (ٹانک پارٹیوں) کا فیر آتا ہے۔ ”حکایت“ میں کئی بار ان کی تشریح کی گئی ہے کہ تفصیلی سے بتا گیا ہے کہ ان پارٹیوں کے جوان کس طرح دشمن کے مورچوں کے علاقے سے اندر یا عقب میں چلے جاتے ہیں اور دل میں یہ جھانکنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ زندہ واپس



بلاکتے ہیں۔ دلا جانہ زوں کو اس جنگل میں سے گزار رہا تھا جہاں دشمن کی فوج نہیں تھی۔ مگر سرکنڈوں میں خنزیر، گیدڑ اور ایسے ہی جانور رہتے تھے۔ کملاڈ جہاں تو اکواں سپدا کیے پیرا تھیا ط سے چلنا جانتے تھے۔ لیکن کسی بڑی چھپے ہوئے جانوروں کے ڈر کر بھاگنے لگاؤ زوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ دشمنی راڈنڈ فائر جوتے ہیں اور اگر قریب کوئی سٹین گن پوسٹ ہو تو وہاں سے مشین گنوں کا اندھا دھند فائر شروع ہو جاتا ہے۔ کملاڈ پارٹی کو دلا اس خطرے سے بھی بھلا کر گئے اور انہیں بخیر و خوشی تاگریشٹ ملک پہنچا دیا۔ دسے کی ایک طرف کی ڈویژنی ختم ہو گئی۔ اب کملاڈ جانہ زوں کو اپنا کام کرنا تھا اور انہیں دشمن کے اجتماع کا اندازہ کیا۔ ٹیکل دیکھے اور سپلا راڈنڈ قافلہ کیا۔ اس کے ساتھ ان دشمن نے دشمنی راڈنڈ فائر کر کے شروع کر دیے۔ لیکن ان کی روشنی ہمارے کملاڈ جہاں زوں کے ہی کام آئی۔ وہ تو دشمن کو نظر نہ آئے۔ انہیں کا سک تاگریشٹ نظر آ گئے۔ انہوں نے بہت باہمی سیل کی۔ دشمن نے انہیں پینے کی کوشش کی لیکن وہ بھلے آئے اور دلا انہیں قریب کے ایک گاڑیوں میں لے گیا۔ جہاں اس کے میل جول کے ہم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ اس وقت پوسٹ رہی تھی۔ اس نے دن بھر انہیں دلیں چھپائے رکھا اور رات کو اسی طرح واپس پاکستان میں لے آیا۔ جس طرح لے گیا تھا۔ دسے کے بغیر یہ مشن کامیاب نہ ہوتا۔

بنگلہ دیش کے تھرہ دونوں میں دلا ایسی متعدد پادریوں کے ساتھ کائیڈ بن کر گیا۔ اس کے ہمراہ دشمن شہر کے ہیں جہاں اس نے ایک بار انڈین آرمی کے ایک میجر کو اغوا کیا اور ایک اٹھ کے حوالے کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ ٹیلی فنی دسے کے لیے کام کرتا رہا اور بھارت میں کھڑا گیا۔ جاسوسی کے الزام میں کٹیڑے ہوئے پاکستانیوں کے لیے امر سرکار انٹیر وگیشن سنٹرز تفتیش کا مرکز اور اس سے کم نہیں۔ جاسوسیوں کی تفتیش میں ایک ہی سوال پرسند دریا جاتا ہے کہ تھمہر سے دوسرے ساتھی کہاں کہاں ہیں، یعنی پورے بنگلہ کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نام نہانک جانتے ہیں کہ جاسوسوں کی کیا نہیں ہوتا۔ ایک نکلہ گروہ جس کا ایس میں رابطہ ہوتا ہے اس کا کام ہے اندر یہ گروہ دشمن ملک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایک جاسوس گرفتار ہو کر مارے

پانچ تھے۔ انہیں ایسے علاقے سے گزر کر دشمن کے عقب میں جانا تھا۔ جہاں دشمن کی فوج پھیلی ہوئی تھی اور جہاں شہین گنوں اور دیگر تمام ہتھیاروں نے فضا میں آگ کا جال مان رکھا تھا۔ دونوں طرف کے توپ خانے کو بار بار کر رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس علاقے سے واقفیت نہیں تھی۔ رہائی کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بھارت کے اس علاقے کے ایک ایک انچ سے واقف ہونے کے علاوہ جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ اسے پارٹی کو تاگریشٹ ملک لے جانا تھا اور اگر کوئی جانہ ز زندہ رہ جائے تو اسے واپس لانا تھا۔

یہ ایک ایسی ضرورت تھی جو پوری قوم کو پارٹی کو بھیجنے کا مطلب ہے رت پیرہ جانا کر رہتے ہیں بھلاک جائے اور دشمن کے ہاتھوں ختم ہو جائے۔ یہ ضرورت لیڈی کرنے کے لیے ایک ایسا شخص سامنے آیا جو بھارت کا بد معاش رہا یا اب بھی بھارت میں ہی ہے اور سرنگلہ تک بھی کرتا تھا۔ وہ معاشرے کے بدنام ترین افراد میں سے تھا۔ یہ بھٹا دلا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسے کہاں بھیجا جا رہا ہے۔ راستے میں دیا گئے رادی بھی حامل تھا جو تھمہر کے پینے پینے میں سیلابی کیفیت میں تھا۔ دریا کے پار دشمن تھا اور اس کے پیچھے کا علاقہ بھی دشمن کا تھا۔ دسے کا زندہ رہنا کسی پہلو ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ ان پانچ کملاڈ جانہ زوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو اس جہاں کے عالم میں پاکستان پر قبضہ کر جانے والے کے لیے جارہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ رات گہری ہوئی تو وہ انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔ اس نے کچھ فاصلہ دیا کے ساتھ ساتھ دسے کی اور ایک جگہ سے دیا کر دیا۔ ان سوالوں کے جواب کہ اس جگہ کا نام کیا تھا اور وہاں کس طرح پایا گیا۔ کبھی بھی نہیں ملیں گے ہیں نے جب اس سے ان سوالوں کے جواب ملے تو اس نے کہتا رہے تھے بھارت کی جیلیوں میں قید بھی کاٹ آئے ہو۔ کیا راز کی یہ باتیں کسی کو بتا دے؟

اس نے پارٹی کو دیا یا کر دیا اور پارٹی کو کہیں بھیجا کر خود اگلے علاقے کو دیکھنے گیا۔ وہاں ایک اور خطرہ نظر آیا۔ اس تمام علاقے میں سرکنڈوں اور اونچی گھاس کا جنگل ہے۔



سلام کہا ہے کہ یہ واحد آدمی ہے۔ جسے امرتسر انڈیا ویشن سٹر میں سب سے زیادہ بے عرصے کے لیے رکھا گیا تھا۔ ہندو افسر جیران تھے کہ گوشت پرست کا یہ انسان اتنا زیادہ تشدد اور ساتھی ظالم اذیتیں کسی طرح برداشت کر رہا ہے۔ اس سے رازہ اگرا نے کا یہ طریقہ بھی آنا یا گیا کہ اس کے مندر پر غلاظت باندھ دی جاتی۔ کچھ دیر بعد لالائت ہٹا کر اس سے پھر پوری سوال پوچھا جاتا لیکن دسے کا جواب دہی ہوتا کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ قید میں اس کے ساتھ کچھ کھڑی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک دو اس کے رنگ کے اذرا د تھے۔ وہ دسے کو اس وقت دیکھتے تھے جب اسے اذیت رسائی کے بعد (انڈیا ویشن) کی حالت میں ا قید میں لایچکے تھے تو اسے اٹھایا کر کہتے تھے۔ "دسے! اس طرح کب تک زندہ رہو گے۔ بہا نام بتا دو کہ وہ بہرے ساتھی ہیں۔ ہم سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی"

"میں پاکستانی ہوں میرے دوستو! — دسے کا ہر بار یہی جواب ہوتا تھا۔ دھوکہ نہیں دوں گا۔ اور اس نے کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ اپنے ملک کو بھی نہیں، اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں۔ تقبیل کے دوران اسے دست و پائی ثبوت دکھا کر کہا جاتا کہ اترنا تسلیم کر لیں کہ دست و پزات صحیح ہیں۔ اس کے جواب میں اس کے مندر سے یہی الفاظ نکلتے تھے۔ "میں ان پڑھ ہوں" یہ ہے بھی حقیقت کہ وہ ان پڑھ ہے مگر ان طالب علموں کا عالم ہے جنہوں نے عمر کی کتابوں میں کھال دی ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ہٹ لانا انجام موت یا ہمیشہ کی قید یا عمر بھر کی جہان مندری ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا جسم اور جان پاکستان ہے اور پاکستان ہی کے کام آئیں گے۔ اس کے بدلے اور قوت برداشت کو دیکھ کر بھارت کے درمند صفت افسروں نے اسے ڈالا میٹل" کا خطاب دیا تھا۔

آخر بھارتی مار گئے اور اسے تقبیل کے مرحلے سے نکال کر جیل میں ڈال دیا۔ پھر اسے سڑتی پنجاب کی مختلف جیلوں میں تبدیل کیا گیا جن میں نا پھر جیل جیسا ظالم قید خانہ بھی شامل ہے۔ ایسے قیدیوں کو بھارتی کسی باقاعدہ مندرے کے بغیر جیل میں ڈال دیتے ہیں۔

کردہ کی نشاندہی کر دے تو پورا رنگ گرفتار ہو کر بیکار ہو جاتا ہے۔ جاسوس کا ایک کمال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن ملک میں داخل ہوتا ہے اور عقل سے کام لے کر اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ حالانکہ وہ دشمن آبادی کے جوہم میں گھومنا پھرتا ہے۔ اس کی بیاوردی اور سرواخی کا امتحان اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ پکڑا جاتا ہے۔ دشمن کی ملاطمتی انڈیا ویشن اور پولیس اس کے ساتھ پیا دمجیت کی برت اتنی بات کرتی ہے کہ اپنا کردہ اور مار پڑ بتا دو اور عدیش کرو۔ اگر وہ مزید دل کا منظرہ کرے جوئے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دے تو اسے عیش نہیں کرائی جاتی۔ اسے کسی پر کسی قید و بند میں رکھا جاتا ہے اور اپنے ملک کے خلاف فحاشی پر کسا یا جاتا ہے۔ لاپے دینے جاتے ہیں اور ضرورت پڑے تو تشدد بھی کیا جاتا ہے۔

غرض تقبیل وہ مرحلہ ہے جو دین و ایمان کی بڑی سخت آزمائش کا مرحلہ ہے۔ ہائی انڈیا ویشن کے جو افراد بھارت کی قید سے فرار ہو کر کسی مہم ہارے کے تحت دالیں آسے ہیں۔ ان کے جسم گرا ہی دیتے ہیں کہ وہ بھیڑیوں کی کھچادوں سے نکل کر آئیں۔ تشدد کے ایسے ایسے نشان غرا کرتے ہیں جو رنگے کھڑے کر دیتے ہیں، ان میں سے بعض بیٹائی سے، طاقت کو یا فنی سے، کافوں سے اور بعض دماغی لحاظ سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو جاتے ہیں۔ یہ شہوت ہے ان کے جذبات حب الوطنی اور مرض شناسی کا جسموں کا یہ جھڑکا کہ بھی انہوں نے دشمن کو ایسی بات نہیں بتائی جس سے ان کا رنگ اور ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا اور وہ جان بوزو دشمن کی غیر انسانی اذیتوں سے یا فساد کی کوشش میں فائزنگ سے مر گئے ہیں وہ ہمارے ہی تھے۔

ڈالنا ہی سرفروزشوں میں سے ہے۔ اس کے تمام دشمن ایک تو طاقت کی وجہ سے بیان نہیں کیے جاتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جگہ راز کے زمرے میں آ۔ ہیں۔ جن سے کبھی بھی ہر دہ نہیں اٹھ سکے گا۔ اسے قید اور تقبیل میں وہی اذیتیں دی گئی جو ہر جاسوس کو دی جاتی ہیں مگر اس نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جاسوس کی عیش میں ہوا۔



عالمی کا الزام ہوتا ہے) کو مشقت کرا نے کے لیے جیل کے کاخانے (مشقت  
ہاٹ) میں لے جایا گیا تھا اور ان سے قیدیوں کی سیکڑوں کی صفائی بھی کرائی  
جاتی تھی۔ ڈولڈ مشقت سے جواب دے چکا تھا اور جیل خانے کا مشاٹ اس کے  
اگے ہتھپڑا لچکا تھا۔ ڈولڈ بیکار بیٹھے کا بھی عادی نہیں تھا۔ اس نے جیل سے  
ڈرائر کی سیم تیار کر لی۔ یہ ایسی سیم تھی جس میں عقل و دانش اور غیر معمولی ذہنی

دے نے پھر ایسے اوصاف پیدا کر رکھے ہیں جو اس کی بہت مدد کرتے تھے۔

ایک ہے بذریعہ اور طبعیت کو، وہ "مفسر طبعیت" کا ایک ہے۔ قید کے دوران اتنی  
انسانی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کے باوجود وہ ان اوصاف سے دست بردار نہیں ہوا  
وہ دشمن کا دل جوہیت تھا۔ جیل خانے کے وارڈ راؤ قیدی اس کے ان اوصاف کی پرورش  
اس کے مرید بن گئے تھے۔ دوسرا وصف یہ کہ اپنے آپ کو ایسے مرض کا مریض بنایا تھا  
نرس بننا ہوتا تھا۔ لیکن ٹائلو بھی بوجہ جاتے تھے اپنے آپ کو بخار بھی ہوٹھا یا کڑا تھا جو  
فنا واقع بخار ہوتا تھا۔ اس نے یہ گرجھے بھی سکھایا تھا جو میں نے قید کے دوران کامیابی  
سے استعمال کیا تھا۔ وہ بیڈ سے ٹانگ پر قدامت کرنا اور کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ  
اسی ٹانگ سوچ جاتی تھی۔ خون کی قے کرنے کے فن کا وہ ماہر تھا۔ وہ عام طور پر اپنے  
آپ کو آنکھوں کی ایک بیماری میں مبتلا رکھتا تھا جسے "اندھرتا" کہتے ہیں، اس سے دن  
کا انکار آتا ہے اور رات کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

امتر جلی سے غرار کی سبک سمجھنے سے پہلے جلی کا نقشہ سمجھنا ضروری ہے۔ باہر کی دیوار  
وہ فٹ اونچی ہے۔ جلی کے بڑے گیس سے داخل ہوں۔ تو انہی طرف کی بڑی دیوار  
ساتھ اندر کی طرف ایک فٹ دیوار کے متوازی رہتا ہے۔ فٹ سے آگے دیوار کے  
متوازی چوبیس کونٹے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بجہ خالی ہے۔ جہاں خاصا چوڑا اور  
گراڑھا ہے اس میں سارے جلی کا ٹکڑا کرٹ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ  
بت الخلا کے سامنے، کچھ دور ایک سولہ ذریعہ چھوٹے جو دراصل ایک فٹ اونچی پتھر کی

اندر ان سے سزا یا فدیہ قید لیوں کی طرح مشقت کراتے ہیں۔ بعض قید می مشقت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ عالمی قانون کے خلاف ہے۔ اس انکار پر انہیں اذیتیں دی جاتی ہیں اور ایسی تک و تا کر یکے اور دیگر کو ٹھٹھیلوں میں پکڑ دیا جاتا ہے جہاں حیران بھی نہیں رہ سکتے۔ ورنہ ابھی مشقت سے انکار کرنے والوں میں سے تھا۔ اس سے مشقت کرنے کے لیے ہر وہ ہمزہ استعمال کیا گیا۔ جو بھارتی ہرگزیت کی فہرست میں تھا۔ مگر رتے نے مشقت نہ کی اور کہا کہ میں تمہارا مولیٰ قیدی ہوں۔

وہ "بوجھیل" میں ہی تھا۔ جب سقوطِ مشرقی پاکستان کی خبر آئی۔ یہ خبر سننے والے بھارتی اور بھارتیوں کے اخبارات تھے۔ جتنے نے جیل میں ادھم بہا کر دیا اور غور سے لگا لگا کر کہا۔ "ساری دنیا اگر کہے کہ پاکستان کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں تو یہ نہیں مانوں گا۔ میری فوج ہتھیار نہیں ڈال سکتی۔" اسے جب جیل کے ہندو محلے نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ خبر صحیح ہے۔ تو اس نے کہا۔ "تم بزدل ہندو مجھ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں کون ہوں۔ تم مجھ سے مشقت نہیں کرا سکتے۔ تم میں اتنی ہست کہہاں کہ میری فوج سے ہتھیار ڈالالو،" مگر حقیقت ایسا آپ کو تسلیم کرا لیا کرتی ہے۔ ڈکے کو ماننا پڑا کہ یہ خبر صحیح ہے۔ پھر پھر اس نے کہا کہ میری فوج کے ساتھ کوئی دھوکہ نہ ہوا ہے۔ اس کے دل میں اپنی فوج کی جو عقیدت تھی وہ کہہ نہ ہوئی اور آج تک بھی نہیں ہوئی۔

نا بھر سے آئے امرتسر جیل میں بھیج دیا گیا۔ یہ بھی بھارت کا ایک جڑا ہی سخت جیل خانہ ہے جہاں سے وزراء نامہ نگر آتا ہے۔ کیونکہ جنفاقی انتظامات بہت سخت ہیں۔ کسی پاکستانی قیدی کا فائز اور زیادہ نام نہیں ہے۔ کیونکہ پاکستانیوں کو جیل خانے کے اس حصے میں رکھا جاتا ہے جو جیل خانے کے اندر ایک اور جیل خانہ ہے۔ وہاں قیدیوں کو بیڑیاں ڈال کر رکھا جاتا ہے۔ جن سے خرابی کی کوشش کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ان دونوں امرتسر جیل میں پاکستان اور بھارت کے ان مسلمان قیدیوں کو رکھا



اے سنتری کے پر سے کاغذ کر لیا گیا۔ سنتری کو قاتل بکر نے کے لیے لاہور کے رہنے والے ایک قیدی محمد حسین اور میا نالی کے رہنے والے قیدی سیاحی حمید اللہ خان منتخب کیا گیا۔ بھاگنے والے قیدیوں کو ڈرتے سے پانچ پانچ کے گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک گروپ کا کمانڈر مقرر کیا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کوئی ساگر واپس مقام سے سرحد پار نہ کرے گا۔

۲۵ دسمبر کا دن سکیم کے مطابق قیدیوں کے لیے قید کا آخری دن تھا۔ اس رات انہیں اس لمبی سرنگ سے نکل جانا تھا۔ جہانوں نے بڑی کامیابی سے کھودی۔ اور چھپا رکھی تھی۔ یہ کمرس کا دن تھا۔ عیسائی قیدیوں نے کمرس منانے کا بہانہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے مسلمان قیدیوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کر کے لیے مدعو کیا۔ مسلمانان کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ اپنا کانگنی کا حکم اگیا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ تمام فیڈی اپنی اپنی جگہوں پر پہلے جائیں۔ معلوم ہوا کہ باہر سے ڈی آئی سی آیا ہے۔ اس کے ساتھ جیل کے تمام افسر سیدھے کورٹسہ کرکٹ کے گڑھے تک آئے۔ کوڑا کرکٹ بنایا گیا تو اندر سے سرنگ پر آمد ہوئی۔ سرنگ میں گئے تو پیر پڑی کامیابی سے آگے بڑھی باہر تک چلی لی تھی۔ جہاں سے بند تھی۔ خزانہ ہونے والوں کو فرار کے وقت اسے کھولنا اور نکل جانا تھا۔ دکاندار اس کے ساتھی پکڑ لیے گئے۔ تصدیق کیا جاسکتا ہے کہ ان کا کیا حشر پایا ہوگا۔ یہ آخری آستینوں کے ساتھیوں نے کی تھی۔ خزانہ ہونے والوں میں کوئی ایمان ویش بھی تھا۔ اس نے اس وقت آخری کی جیب فرار کے لئے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنائی تھی۔ بھلائی ڈی آئی سی نے سرنگ تو فرار سے پہلے ہی پکڑ لی۔ لیکن اس نے سرنگ کھودنے اور اسے چھپانے رکھنے والوں کو ان الفاظ میں حراج تحسین پیش کیا۔۔۔ "مسلمانوں میں کوئی بد روح داخل ہو گئی ہے۔ یہ جوں کا توں ہے، مسلمانوں کا نہیں"

دکاندار قیدیوں کے ایک اور دور میں داخل ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں اسے

بنائی جا رہی تھی۔ اسی سرنگ نے فرار کی سکیم میں بہت مدد کی۔ ڈسٹے نے کوڑے کرکٹ کے کورسے میں سرنگ کی کھدائی شروع کی۔ اسے چھپانے رکھنے کا انتظام یہ کیا کر جیل خانے کے لیے اس جھگڑے میں جو سنتری ہوتے تھے۔ انہیں ڈلے کے کچھ ساتھی تاش کھینے کے لیے بٹھا لیتے تھے۔ اس موقع پر ڈلے کی بند بچی نے بہت کام کیا۔ کھدائی کے لیے اڈا ریل بن گئے۔ ہوز پیر تھیرو سرنگ سے حاصل کیے گئے۔ سرنگ کا مشکل اور خطرناک پہلو وہ مٹی ہوتی ہے۔ جو اندر سے نکلتی ہے۔ ان لوگوں نے مختصری کھڑی اٹھا کر زبردستی سرنگ پر پھینکی۔ شروع کر دی۔ اس کے علاوہ جیل کے اندر تمام زمین پر لمبائی ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے کچھ مٹی لپائی میں کھادی اور یہ خطرناک عمل جاری رکھا۔

یہ ایک دونوں میں ختم ہونے والا کام تو نہیں تھا۔ رفتا رست تھی۔ ہر لمحہ کپڑے بدلنے کا خطرہ تھا۔ اور کپڑے جانے کے نتائج سے سب آگاہ تھے۔ تاہم کام جاری رہا۔ جیل کا کوئی دار و دروغیرہم جاتا تھا تو پاکستانی قیدی وڈر کر اس کا استعمال کرتے۔ اس کی مٹی چائی کرتے اور اسے اپنے پاس بٹھا کر تاش میں گھس کر لیتے۔ دکاندار کام کی نکلانی کر رہا تھا آخر وہ دن آیا کہ سرنگ جیل کی بڑی دیوار کے نیچے جا پہنچی۔ ۲۵، دسمبر کی رات فرار کے لیے طے پائی۔ رات کو قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں بند ہوئے ہیں۔ لہذا کوٹھڑیوں سے نکلنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ یہ انتظام پاکستان کے قیدی لوہار نے کر دیا۔ وہ جیل کے لوہار خانے میں کام کرتا تھا۔ اس نے ایک چائی تیار کی جو ہر ایک کوٹھڑی کے تالے میں لگائی تھی مگر اسے خود کوٹھڑی سے باہر نہ لانا چاہیے تھا۔ وہ بھی تو کوٹھڑی میں ہی بند ہوتا تھا۔ اس نے اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی سلاخیں اس طرح کاٹ لیں کہ دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کٹی ہوئی ہے۔ فرار کی رات سے پہلے تمام تالے دن کے وقت جھکی جالی سے کھول کر دیکھ لیے گئے تھے۔ چابی کا سیاب تھی۔ رات کو صرف ایک سنتری پر سے ہوتا تھا۔ جو تین گھنٹوں بعد بدل جاتا تھا۔ فرار کا وقت بارہ بجے سے تین بجے تک ڈیوٹی



ایک روز رخصتے میں سفیدی شروع ہو گئی۔ دلا تھا نیدار کی ہیز کے قریب غرض  
پر لٹا ہوا کر رہا تھا۔ لڑائی جھگڑے کا ایک کہیں آگیا۔ چالیس چاس آدمی  
جو اس کہیں میں ٹوٹتے تھے اندر چلے گئے اور تھکنے دار کو گھیر لیا۔ تھکنے دار  
نے ان کی رہبرٹ نہ کی۔ جو کا غدی کارروائی کرنی تھی کہیں کی اور جب ان سے  
لارغ ہوا تو دلا وہاں نہیں تھا۔ اس نے اس خیال سے اُسے مڑو ہڑا کر سیس  
اہیں پڑا ہوا کہ اس کی حالت بتا دیتی تھی کہ تین چار دن بعد مر جائے گا۔ کچھ دیر بعد نیدار  
کو تیرے چلا کر اس کا اودھ کوٹ (ربڑڈی) غائب ہے۔ اس کی وردی کی ایک پتلیوں  
دہاں پڑی تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ اس کے بعد انکشاف ہوا کہ حریر کی کچڑی اور  
ایک سپاہی کی وردی کی قمیض غائب ہے۔ اور یہ بھی پتلیاں دلا تھی تھکنے  
سے غائب ہے۔

تھکنے دار کو یقین نہیں آیا تھا کہ نزاع کی حالت میں کراہتا ہوا مسیحا فرار ہو  
گیا ہے۔ ان دونوں بارڈر سیکورٹی فورسز کا تین فی ایک ظالم بھارتی جبر تھا جو  
اجناب اور اندر سیکورٹی کا اچھا راج تھا۔ اس نے فوری طور پر ہمدردی کی ناکر بندی کر دی اور  
اپنی فورسز کے ہزاروں افراد کو ہمدردی دیا۔ پولیس ہونگام اور سی آئی ڈی کے  
کو اندر سر کے اندر ڈھونڈ رہی تھی مگر ناکر بندی اور تلاش محض بیکار تھی۔ ظالم پاکستان  
میں داخل ہو چکا تھا۔

اس کی خون کی قے، بخار اور نزاع کی حالت اس کی ادکاری کا کمال تھا۔ اسے  
معلوم تھا کہ اسے جس سہائی کے لیے رام باغ تھکنے میں لائے ہیں۔ وہ اسے کبھی نہیں  
لے گی۔ اسے سرحد پر لے جا کر قتل کر دیا جائے گا یا پھر کئی مہینے مقدرے کے بدلے جیل خانے  
میں ڈال دیا جائے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ جیسے پاکستانی کو بھارتی۔ مگر  
دیتے۔ اس نے اپنی رہائی کا بندوبست خود ہی کر لیا۔ تھکنے سے اس نے پولیس والوں  
کے چوک پر لے اڑائے تھے۔ ان سے صاف ظاہر ہوا تھا کہ وہ پولیس کی وردی میں  
فرار ہوا ہے۔

رہائی کا چھانسر دے کر اندر کے تھکنے رام باغ میں لے گئے۔ پاکستانی قیدیوں  
کو رہائی کی خوشخبری سنا کر بھی ایک ذہنی چھٹکا دیا جاتا تھا۔ بھارتیوں کا طریقہ کاریہ ہے۔  
کہ پاکستانی قیدیوں پر مختلف دفعات کے تحت دوزخ عائد کی جاتی ہے۔ انہیں بغیر  
مقتدرے کے قید میں رکھا جاتا ہے۔ پھر رہائی کا ٹھک لکھایا جاتا ہے۔ انہیں رہائی کی  
خوشخبری سنائی جاتی ہے اور کسی تھکنے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ حوالات میں  
بند رہتے ہیں۔ انہیں ہر روز رہائی کا یقین دلایا جاتا ہے۔ اس طرح ذہنی اذیت  
دے دے کر قیدی کو سرحد کی طرف لے جاتے ہیں اور کسی جگہ اسے قتل کر کے  
لاش غائب کر دی جاتی ہے یا پیچھے سے کوئی اطلاع لے کے آہتا ہے کہ قیدی کو  
واپس لے آؤ۔ کیونکہ اس کے خلاف ایک اور مقدمہ نکل آیا ہے۔ چنانچہ اسے دہاں  
لے جا کر تشدد اور اذیت کے انہی مراحل میں جہاں سے وہ نکل کر آتا ہے ایک بار  
پھر گزارا جاتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں اُسے کو نا بھرجیل سے رہائی کی خوشخبری سن کر اندر سر لے گئے  
جہاں اسے رام باغ تھکنے کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ تھا اندر سر کے گنجائش آبا و بھتے  
میں ہے۔ میں بھی اس تھکنے میں رہ چکا ہوں۔ مجھے دے کے بعد دہاں لے جایا  
گیا تھا۔ اس تھکنے کا ایک سکھ سپاہی میرا دوست بن گیا تھا۔ اس نے مجھے دے  
کی ایک ایسی کہانی جسے میں سن گھورت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ باطل بیچ نکلی۔ دے کو جب رام  
باغ تھکنے کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت وہ برسوں کا مریض لگتا تھا۔ اس نے پہلے  
تو یہ تیار کر کے اندر آ کر رہا گیا ہے۔ ایک آدھ دن بعد اس نے خون کی قے ٹھونچ  
کر دی اور ادھڑا ہوا گیا۔ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں لگتا تھا۔ رہائی کی خبر سنا کر پاؤں  
سے بیڑیاں اتار لی جاتی ہیں۔ تھکنے میں دلا پیڑیوں کے بغیر تھا۔ اس کی حالت ایسی  
تھی کہ تھکنے کا عمل اس سے بے پردا ہو گیا۔ اس حالت میں جبکہ وہ مرنے والا تھا  
اس کے فرار کار کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔



## وہ امر ہو گیا

اس نے مجھے اپنا اصلی نام رشید بتایا تھا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس

کا اصلی نام یہی تھا۔ البتہ میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آدمی ہوں جسے رشید کا عقاد حاصل ہوا تھا۔ میں نے بھارت کے طین خان میں اس کے ساتھ چھ مہینے گزارے ہیں۔ بھارتی پولیس کے ریلوڈ میں اس کے کئی نام اب ابھی موجود ہیں۔ جن میں مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ سنجلی پاڈے، بگتا رنگھ، راج پال اور گوردیت سنگھ۔ اگر وہ زندہ ہو تو میں اس کے یہ نام ظاہر کر دیتا اور اس کا اصلی نام اگر رشید ہی تھا (جی کسی کو نہ پتا)۔ وہ سرحدوں کا تھکیدی تھا۔ ادھر نکل جانا اور ادھر کی جو ریا اور رازنا دھڑلے آنا اس کی زندگی کا مشن تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب وہ سرحد پار کر رہا تھا۔ دیکھ لیا گیا۔ اسے لٹکا دیا گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی، مگر دشمن کی رائفل سے ٹکلی ہوئی گولی نے اسے بھاگنے نہ دیا۔ اس طرح اس نے اپنا یہ عہد پورا کر دیا کہ وہ کسی کے اٹل نہیں آئے گا۔

وہ پاکستان کے اس سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا جو بھارت اور مشرق وسطیٰ کے سرحدوں سے ملتا ہے۔ اس نے زیادہ تر وقت شہر میں گزارا تھا۔ یہ شہر کا اثر تھا کہ اس نے سیریک پاس کر لی تھی۔ وزیر اس کی خاندانی تاریخ کچھ اور تھی۔ اس کا باپ شہزادہ تھا۔ یہ اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ پاکستان موجودہ سیاسی تو رشتہ کے باپ نے کم کمال کی کہ پاکستان میں چوہدری نہیں کرے گا۔ لیکن اس نے چوہدری سے تو سب زکی۔ اس نام کے لیے وہ سرحد چلا چلا جاتا اور بھارتیوں کے مویشی کھول لاتا تھا۔ اگر موقع ملے تو

یہ کہانی ایکلے دے کی نہیں، یہ ہمارے معاشرے کے بہت سے ایسے افراد کی کہانی ہے۔ جنہیں ہم جوائنٹ پیس اور سرنگھ کہتے ہیں۔ انہوں نے کمانڈو پارٹیوں کی رہنمائی کی۔ ایسی جیس کا کام آسان کیا اور پکے گئے تو دشمن سے کھلوا کیا کہ مسلمانوں میں کوئی بدردع داخل ہو گئی ہے، یہ کام جنوں کا ہے انسانوں کا نہیں۔ اگر ہم ان لوگوں کو اس خیال میں لائیں تو یہ قوم کی بہت بڑی قوت ثابت ہو سکتے ہیں۔



سے سریشی کھول لانا انتقامی کارروائی تھی۔ جو آگے چل کر ان کا پیشہ بن گئی۔ دو چار بار بھارت کے سرحدی دستے کے جوازوں نے انہیں دیکھ لیا۔ اور تعاقب کیا۔ لیکن یہ رگ نکل آئے۔ بعد میں انہوں نے کہیں سے ریلو اور اسٹیشن گئیں لے لیا تاکہ بوقت ضرورت مقابہ کیا جاسکے۔ ایسا ایک موقع آ گیا۔ رشید اور اس کا باپ بھارت میں آئیں اور نکل گئے۔ علاقہ ایسا تھا کہ وہ راستہ بھول گئے اور واپس آئے وہ بھارت کی ایک سرحدی چوکی کے قریب جا گئے۔ سنتری نے انہیں سٹکارا۔ سنتری کی لالچا پر انہوں نے پھینے اور بھاگنے کی کوشش کی۔ چوکی سے آج پر گولیاں برسے گئیں۔ رشید اور اس کے باپ کے پاس بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے جوابی فائر کیا اور نکلنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔

دشمن انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً اڑھائی گھنٹہ گزیرا کہ باا دل ہوتا رہا۔ اچانک موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ روشنی راتوں بھی فائز ہوتے رہتے تھے۔ جن کی مدد سے بچا بہت مشکل تھا۔ بارش نے دونوں کو فاصلہ فاصلہ دیا۔ وہ (بپ) ہی سرکڑوں کے جنگل میں چلے گئے۔ دشمن کو بارش نے روک لیا۔ باپ بیٹا کو ٹروں سے نکلے۔ دشمن اندھا دھند فائر کر رہا تھا۔ ایک جہلی جھلی گولی رشید کے باپ کے پیٹ سے پار ہو گئی۔ وہ گر پڑا۔ رشید کے لیے مشکل پیدا ہو گئی۔ اس نے باپ کو لڑکوں پر اٹھایا اور چلی پڑا۔ گولیاں اس کے ارد گرد اڑتی رہیں۔ رشید نکل آیا بھر کے اندر اسے لٹک اس کا باپ زندہ تھا۔ مگر گھر پہنچے تو باپ مر چکا تھا۔

باپ کے پیٹے کو یا انتقام کی مسلسل کوشش کو زندہ رکھنے کے لیے رشید لڑا گیا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کی صبح کے اندھیرے میں بھارت کی فوج بھارت کے سرحدی علاقے میں داخل ہو گئی۔ ہندوؤں نے بھارتی کا یہ مظاہرہ کیا کہ سوئے ہوئے لاشوں پر قدم لپو لپو دیا۔ خود تو ان کو انہوں نے پکڑ لیا۔ یہ حملہ چوکی کے سوتے وقت تھا اس لیے دشمن کا مقصد یہ نہ کیا جاسکا۔ رشید کے گاموں پر درد مری جگہوں کی

کسی آباد بھارتی چوری یا ڈکیتی کی واردات بھی کرتا تھا۔ رشید چوکی کا سرٹیفکیٹ لے کر گاؤں چلا گیا۔ اس کے باپ کو دیکھ کر لڑکی ہوئی کہ اس کا بیٹا تقسیم یافتہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے کام کا نہیں رہا تھا۔ لیکن خون نے اپنا اثر دکھایا۔ ایک روز رشید نے اپنے چچا کے ساتھ سرحد پار کی اور سکھوں کی دو جھینسیں کھول لایا۔ اس کے باپ کو بہت خوشی ہوئی کہ اس کا بیٹا راہ راست پر آگیا ہے۔ اس کے بعد اس نے سرحد پار کرنا اور تیرہ ٹروں اور سکھوں کو چوری یا دیگر طریقوں سے نقصان پہنچانا زندگی کا واحد مقصد بنایا۔ اس نے جیسے بتایا کہ وہ چور نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف انتقام کا جو جذبہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے اسے چور بنایا۔ وہ سرحد سے تیرہ میل دور بھارت کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اس کے خاندان کو دہلی سے بھاگ کر پاکستان آنا پڑا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس کا گھروٹ لیا اور اس کی بہن کو اس کے ساتھ لے آئے۔ بے پروا کی تھا۔ رشید اپنے باپ اور ماں کے ساتھ بہت بُری حالت میں پاکستان تک پہنچا تھا۔ بہن کی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے وہ اگلے ہوا ہوتا اور انتقام کے طریقے سوچتے رہتا تھا۔ بھارتی کافروں نے آواز دی کے بعد پاکستان تک آنا لیا تھا۔ رشید کا خاندان پاکستان میں سرحد کے ساتھ ہی آباد ہو گیا تھا۔ سکھ اکثر اڑھار ڈاکو اور دیگر چوری کر کے لے جاتے تھے۔

اس خاندان نے بھارتیوں کی اس بیدہ دیرنی کا تدارک یوں کیا کہ سرحد پار کر کے بھارت میں داخل ہو جاتے اور وہاں سے مویشی چوری کر کے لے آتے۔ رشید کا باپ آواز کی سے پہلے بھارت میں بھی پیشہ ودر تھا۔ اس کے لیے چوری کوئی نئی واردات نہیں تھی۔ البتہ سرحد پار کرنا مشکل کام تھا۔ دونوں طرف سرحدی دستوں کی گشت متبہتی ہے۔ اصل خطرہ بھارت کے سرحدی پھرو داندوں کی طرف سے تھا۔ انہیں علم ملا ہوا تھا کہ سرحد پر کوئی مشکوک آدمی لالچا سن رہا ہے۔ بھارت کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دو۔

رشید کا باپ اور چچا سرحد پار کرنے کے باہر ہو گئے۔ یہ کام جاسکتا ہے کہ بھارت



بہر خواتین قیدی تھیں۔ ان کے لیے وہاں قہوڑے سے نوجی اور چند ایک عیسائی بہت  
 اصرہ تھے۔ رشید نے دیکھا کہ گاؤں جنگ کی وجہ سے خالی تھا۔ اس نے اپنے ایک  
 بھائی کو ساتھ لیا۔ دوسروں کو ادھر ادھر کھڑا کیا اور جمع گھڑی ہا ہر والی دیا اچھلاک  
 کر اندر چلا گیا۔ اندر کچھ روشنی تھی۔ اس نے دو بھارتی فوجیوں کو دیکھا جو شہر اب میں  
 بدست تھے اور ایک لڑکی کو فروغ رہے تھے۔ رشید اور اس کے بھائی ایک  
 ہلکے آن پر چھپے اور چاقوؤں سے انہیں ختم کر دیا۔ ایک چکر انہیں ایک لڑکی کی  
 لاش پڑی نظر آئی۔ اسے انہوں نے پہچان لیا۔ یہ ان کے گاؤں کی لڑکی تھی۔  
 وہاں تین چار اور فوجی تھے۔ انہیں رشید اور اس کے بھائی نے آسانی سے ختم  
 کر دیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بھی بلایا۔ کمرے میں گئے۔ وہاں سولہ سترہ  
 لڑکیاں تھیں۔ ان میں رشید کے گاؤں کے ابا سمجھ کی بیٹی بھی تھی۔ اس لڑکی نے  
 رشید کو بتایا کہ اس کی بہن میں تھی۔ لیکن بھارتی فوجی چند ایک لڑکیوں کو میاں  
 سے لے گئے تھے۔ جن میں ان کی بہن بھی تھی۔ ان سولہ سترہ لڑکیوں کو بیرون وہاں  
 سے نکال لائے۔ سب کی حالت جبر تھی۔ تاہم وہ انہیں کسی محض خوار سے پائنتان  
 کی سرحد میں لے آئے اور ایک فروغ کی بیوی نٹ کے گاؤں لائبریر کے حوالے کر دیا  
 تاکہ اس کا نام سے کو کرادی حیثیت حاصل ہو جائے۔

یہ ایسا کارنامہ تھا جسے سرکاری طور پر کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ رشید  
 کو ایلی ہنس کے رہبر کے طور پر فرائض سونپ دیے گئے۔ یہ ایک ایسا محاذ ہے  
 جس پر لڑنے والوں کے نام اور کارنامے تاریخ میں نہیں آیا کرتے۔ یہ جاننا اپنی  
 فروغ کی آنکھیں اور کان موندتے ہیں۔ رشید نے اپنے حق کو ملک و ملت کے دفاع  
 کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ایک بار وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک آدمی کو سرحد پار بھارتی  
 علاقے میں لے جا کر واپس لا رہا تھا۔ جنگ کے بعد دونوں طرف سرحدی دستے پہلے  
 سے زیادہ چوکے ہو گئے تھے۔ رشید کے پاس بولیوار و چند گولیاں اور ایک چاقو تھا۔

نسبت زیادہ ہی قیامت لڑی۔ اس کے دو بھائی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ نکلے جاتے  
 ان کی ایک بہن بھی چھ نہیں نظر آئی۔ بھائی سمجھے کہ وہ ان سے پہلے نکل گئی ہوگی۔  
 نفسا نفسی اور شور شرابے میں کسی کو بھی ہوش نہیں تھا۔

پچھتھو نڈھلا تھے یہ، کہ رشید کو احساس ہوا کہ اس کی بہن کو ہندو لے گئے ہیں۔  
 اس کے خاندان کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ عام و امیں بھارت میں اس کی  
 ایک بہن کو بے آبرو کیا گیا تھا۔ اب اس کی ایک اور بہن کو ہندو اس کے ملک میں آکر  
 اس کے گھر سے اٹھالے گئے تھے۔ اس نے کسی طرح معرکہ کر لیا اور سرحد پار اغوا  
 کی ہوئی پاکستانی لڑکیاں کسی جگہ بند کر رکھی ہیں۔ رشید نے مجھے تفصیل سے سن کر سنایا  
 تھا کہ اسے یہ اطلاع کس نے دی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اطلاع دینے والے  
 وہ سنگھریا جرنل پریشہ لوگ تھے جن کے جوہ دونوں ملکوں کی خبر رکھتے ہیں اور ان کے  
 تعاقبات دونوں ملکوں میں ہوتے ہیں۔

رشید کو ایک گاؤں کا نام بتایا گیا اور یہ بھی کہ اس گاؤں کے "مچھ گھر" میں  
 پاکستان سے اغوا کیے ہوئے مردوں کو الگ اور عورتوں کو الگ بند کر کے رکھا جوتا ہے  
 ایک رات رشید نے اپنے جیسے چند نوجوانوں کو ساتھ لیا اور بھارت کے اس گاؤں  
 تک پہنچنے کے لیے پل پر اٹھا۔ جگہ ختم ہو چکی تھی۔ فوجیوں دونوں طرف تو بچہ نہیں  
 اس صوبہ حال میں سرحد پار کرنا محال بھی تھا اور خطرناک بھی۔ لیکن یہ لوگ سرحد کے  
 بھیدی تھے۔ انہوں نے معرکہ کر لیا تھا کہ تمام پر فوجی نہیں ہیں۔ رشید کے  
 بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس پارٹی کے پاس بارہ تو تین شکاری تھے وہ قیدی تھے  
 اور ایک سٹیل گن کی چاقو اور خنجر وغیرہ سب کے پاس تھے۔

یہ پارٹی بھارت کے اس گاؤں میں پہنچ گئی۔ بھارت کی فروغ کے تو دو ہم و گمان  
 میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی غیر فوجی آدمی یہ کارنامہ نہ جوہ دونوں کی طرح اس گاؤں تک  
 پہنچ جائیں گے۔ اس گاؤں میں کوئی خزانہ یا گولہ بارود کا ذخیرہ تو نہیں تھا۔ جس کی  
 حفاظت کے لیے وہاں فروغ رکھی جاتی۔ وہاں منتے پاکستانی دیہاتی اور ان کی بے بس اور



اگر کے دبیر کھڑی رہی تاکہ پولیس وہ دوازہ گھنٹہ ٹھہرائے تو اسے چند منٹ دبیر باتوں کا کیا ہوا ہے۔

فورا بعد پولیس نے دستک دی۔ اس اثنا میں رشید اور سکھ صاحب قافلے مکان لاہوت پر ٹکرو گئے۔ وہاں سے اگلی چھت پر اس طرح چھتوں کے ادب پر اور اگلے اور وہاں سے سوک پر کو دے۔ پولیس وہاں بھی موجود تھی۔ آگے لپے لائن اور اس سے آگے نہ تھی۔ سکھ رشید کو اپنے پیچھے پیچھے ہانا پولیس کی نظر پر بجا کر لے گیا۔ سلورج خوب ہو چکا تھا۔ پولیس سکھ کے مکان میں داخل ہو کر چھت پر گئی۔ وہاں سے دوسرے مکانوں کی چھتوں پر گئی۔ غالباً کسی لائن پر پولیس ان کے تعاقب میں نہر تک پہنچ گئی۔ رشید اور سکھ نہر میں کودنے کے بجائے دوسری طرف نکل گئے۔ انہیں ایک ٹیوب ویل کے متعلق معلوم تھا۔ جہاں سکھ کا ایک سنگھڑا ساتھی موجود رہتا تھا۔ اس کے پاس دو گھوڑے تھے۔ اس نے ایک گھوڑا رشید کو دے دیا۔ رشید بھارت کی سیکورٹی اور ان کی آنکھوں میں دھول بھونک کر نکل گیا۔

وہ چونکہ اپنے فرض کا پکا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے ایسی کوئی بات نہ سنا کر باہر اسی سے تعلق رکھتی رہے۔ جاہوس کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھید کسی کو دے خواہ وہ اپنا کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ یہی چونکہ خود اسی میدان کا کھلاڑی وہ چکا ہوں اور بھارت کے جیل خانوں میں کچھ عرصہ گزارا کیا ہوں۔ اس لیے میں رات سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے انٹیلی جنس کے لیے یہاں کا فائدہ سرخام دیے ہیں۔ وہ جب بھارت میں کسی خبر کی اطلاع پر کر پڑا تو اس سے اسی جیل خانے میں لایا گیا تھا۔ جہاں میں قید تھا۔ میں اس کا علی شہناز ہوں۔ بھارت کی سی آئی ڈی اور لاری انٹیلی جنس کے مٹی افسر سے دیکھتے آئے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس اور سیکورٹی فورسز کا گھیراؤ تو تو کر نکل جانے والا پاکستانی بھی تھا۔

اسے جسے اذیتوں میں ڈالا گیا۔ وہ گھوڑے جیسے طاقتور جانور بھی برداشت نہیں

سرمہ بننے والا ایک میل دور گئی تھی۔ یہ دونوں پاکستانی بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورسز کے زرخ میں آ گئے۔ آگے ایک نہر تھی۔ ان دونوں کو لاکھا گیا۔ انہوں نے بھاگنے کی ترکیب کی۔ ان پر فائر کھول دیا گیا۔ رشید کو بھی معلوم تھا کہ نہر کے دوسرے کنارے بھی بھارت کی سیکورٹی فورسز موجود ہے جو اتنی زیادہ فائرنگ سے ہرکشیار اور تیار نہیں ہو گی۔

رشید کو اپنے اس ساتھی کا غم تھا جسے وہ ساتھ لایا تھا۔ اسے وہ اپنی بات سمجھتا تھا اس نے ریلوے اور کے چند سٹاڈل فائر کیے اور دشمن کی فائرنگ میں نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ دونوں نے نہر پار کر لی اور لیگنے لگے۔ وہاں بھی خطرہ تھا۔ یہ شخص اتنا قتل تھا کہ رشید کو اپنے سامنے کوئی کھڑا نظر آیا۔ فاصلہ دو قدم ہو گا۔ اس نے اندھیرے میں دیکھا لیکن وہ بھارتی سپاہی تھا۔ سپاہی فوراً پیچھے کو ہٹا لیکن رشید تیز تھا۔ اس نے جھپٹ کر سپاہی کو پکڑ لیا اور اس کی کینڈی پر لپٹا اور کاٹ مارا۔ وہ گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی نشان دہی کا خطہ تھا۔ رشید اور اس کے ساتھی نے سپاہی کو بے ہوش کر کے پھینک دیا۔ اس کی ٹیٹھیں گن اور امیریشن لے لیا۔ وہ جو ابی فائر کرنے کے بعد نے سرحد کی طرف پل پیسے جو ایک فوٹنگ فڈر گئی تھی۔ رشید کے ساتھی کے کندھے میں گولی لگی۔ مگر اس نے جو صدمہ قائم رکھا۔ دونوں سرحد میں داخل ہو گئے۔

رشید سے بھارت کی پولیس بھی آگاہ ہو چکی تھی۔ خبری تو بھرتی ہی نہ ہوتی تھی۔ کسی نے بولی کہ کھلی اور ایک شام اس وقت اس سرچ پولیس کو اطلاع کر دی گئی جب رشید اپنے ایک سکھ دوست کے گھر اور سرشہر میں کہیں پوچھا ہوا تھا۔ پولیس جہاں تک آگئی۔ رشید کے پاس ٹیٹھیں گن تھی۔ اسے بھی اطلاع مل گئی کہ پولیس آگئی ہے۔ اس نے بالائی منزل سے دیکھا۔ پولیس گھیرا کر چکی کر تھی۔ رشید نے اپنے سکھ میزبان کو خبردار کیا جو نیچے صحن میں کھڑا تھا۔ سکھ رائفٹ اٹھا کر اوپر چلا گیا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بھی ہرکشیار کر دیا۔ یہاں تک کہ جو انکشمیشہ تھا۔ سکھ کی بیٹی اور ماں دروازہ



## منیر افرادیا

اُس سے پہلی ملاقات نا بھرتیل رحبارت امیں ہوئی تھی۔ پیرس میں ہم وطن ایک دوسرے کو سٹک بھائی سمجھتے ہیں اور جب وہ ہم وطن دشمن کی جلیں میں اکٹھے ہو

امیں تو وہ خون کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔  
میں اس وقت پاکستان انٹیلی جنس میں تھا۔ ایک جاسوسی مشن پر بھارت گیا تھا۔ اس سے پہلے میں کئی مشن کامیابی سے پورے کر آیا تھا۔ لیکن اس مشن پر حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ میں کھڑ گیا۔ کپڑے جونا بھی اس کام کا ایک حصہ ہے۔ جس کے لیے میں اپنی طور پر تیار تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے وہ اذیتی دی جائے گی۔ جن کے موت قصور سے ہی ایک عام شہری کا پینے لگ جائے۔ میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔

ایک روز ایک خوش شکل، خوش طبع جوان سال قیدی میرے پاس آ بیٹھا۔ اُس نے اپنا نام منیر تیار اور کہنے لگا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اُسے کسی نے میرے متعلق بتایا تاکہ میں جاسوسی کے الزام میں کھڑا کیا ہوں۔ اُس نے کچھ خوشی کا اظہار کیا۔ میں چونکا ہونگیا کہ بڑے بھائی جو جاسوسوں سے ایذا رسانی سے نہیں لگوائی جاسکتیں۔ وہ اس طرح کے آدمیوں کے ذمے معلوم کر لی جاتی ہیں۔

منیر خاں گامگ معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سمجھ گیا کہنے لگا کہ میں آپ سے کوئی راز کی بات معلوم نہیں کروں گا۔ صرف پاکستان کی محبت نے مجھے آپ کے پاس لا بٹھایا ہے۔

کر سکتا۔ اُس سے وہ سوال پوچھے جا رہے تھے۔ ”اب تک کون کون سی راز کی بات بھارت سے لے جا چکے ہو اور بھارت میں تمہارے ساتھ کون کون اور کہاں کہاں ہیں۔“ وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اُس پر نزع کا عالم بھی طاری ہوتا تھا۔ مگر وہ زبان نہیں کھولتا تھا۔

ایک روز ایک ہندو لیس۔ پی نے اُس کے متعلق کہا تھا۔ ”یہ شخص مر نہیں سکتا۔ مر گیا تو ام ہو جائے گا۔“ اور ایک روز وہ مر ہی گیا۔ ہندوؤں کی قید سے وہ آزاد ہو چکا تھا۔ ایک روز سرحد کے قریب کسی بھارتی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔



اٹاٹا ہوا کہ اس نے مجھے کہا کہ تمہارے خلاف اس کے سوا کوئی انسان نہیں ہے کہ تم نے خیر فاذنی طور پر صدر عبور کی ہے لیکن میں تمہیں چھوڑاؤں گا اور واپس انسان بچوا دوں گا۔۔۔

”مجھے سمجھ کر نیت پر شک ہوا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اذیتیں دینے کے بجائے آپ کیوں نہیں مجھے سوا نے قید میں دیتے؟ میں کسی طرح قیدیں کر دے گا آپ مجھ پر اتنی مہربانی بلا وجہ کر رہے ہیں۔ اس نے آہ بھری اور کہنے لگا کہ پاکستان نے مجھ پر جو مہربانی کی ہے میں اس کا صد دریا چاہتا ہوں۔ میں ستمبر ۱۹۷۵ء میں شدیداً زخمی حالت میں بیمارے ملک کا جنگی قیدی بن گیا تھا۔ پاکستانیوں نے میرا علاج اور میری دیکھ بھال اتنے پیار سے کی۔ جیسے میں پاکستان آدمی کا انصر ہوں۔ درہم میں تو مر گیا تھا۔ میں بالکل بیخ سلاست اور پیٹ سے زیادہ مندوست ہو کر اپنے ملک میں آیا ہوں۔ تمہیں ضرورے دن جیل کی حالات میں رہنا پڑے گا۔ میری رپورٹ اوپر چائے گی اور وہاں سے تمہاری رہائی کا حکم آ جائے گا۔

”اب میں حکم کا انتظار کر رہا ہوں۔ میجر ٹریٹ نے مجھے چھ ماہ بارڈر کر اس کرنے کی نرا دی ہے اور میرا چالان میاں آگیا ہے آپ کے متعلق پتہ چلا کہ آپ جاسوسی میں گرفتار نہ ہوئے ہیں تو پڑے شوق سے آپ سے ملے گا۔“

اتنے میں بارک کا سفری اکٹرا گیا۔ اس نے سینئر کو بھول گیا۔ کیونکہ میرے جرم کے ٹیلیوین سے دوسرے قیدی زیادہ مل لائیں سکتے تھے۔ اس کے بعد میرے ساتھ ضروری تھوڑی دیر کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخر ایک دن وہ بڑا خوش خوش آیا اور کہنے لگا کہ وہ پاکستان جا رہا ہے۔

اس کے بعد میرے خلاف تفتیشیں ہوتی رہیں۔ مقدمہ چلتا رہا۔ تین چار سال اسی طرح جیل سے کورٹ اور کورٹ سے جیل تک آنے جانے میں گزارے گئے۔ بالآخر ٹیلیوین کے تباہی دے میں ہم واپس آ گئے۔ اس سے تقریباً پانچ سال بعد کی بات ہے کہ میں مال مدد کی فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میرے کندھے پر کسی کا ہاتھ آیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوا ہے؟  
”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں بڑا پانی ہوں۔ لیکن اب بغیر کسی جرم کے کپڑا گیا ہوں۔ میں کوئی شریعت آدمی نہیں۔ میں خاما لکھا پڑھا ہوں۔ لیکن حالات نے مجھے اس طرف دھکیل دیا ہے۔ میرا میدان کچھ اور ہے۔ اب ایک درست کے ذریعہ یہ خیال آیا کہ سنگٹک کا کاروبار بھی شروع کیا جائے۔ ہوائیوں کو میرے دوست کی پارٹی مجھے ساتھ لے آئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور ان کے پاس مال کیا ہے۔ مجھے اتنا ہی پتہ ہے کہ ہم نے بارڈر پڑی آسانی سے پار کر لیا اور بھارت میں تھر۔ سک آ گئے۔ کسی نے ہمیں لالچا لایا۔ اس کے ساتھ ایک گولی فائر ہوئی۔ میرے ساتھ اوسر اصر ہوا گئے۔ میں کیا بیوقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ بھارت کی پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے لایا گیا۔ یہ وہاں نے انہیں صحت باہت تباہی اور دباؤ کے کچھ پتہ نہیں کہ یہ گولہ کیا لارہے تھے۔ میں بالکل آدمی ہوں اور یہ بارڈر کر اس کرنے کا جرم نہ کیا ہے مجھے نہیں چاہی ہوں یہ سہ گئے۔ ہر جگہ مجھے مارا پیٹا گیا۔ میں نے ہر جگہ یہی بات بڑے صاف الفاظ میں بتائی۔

ان لوگوں کو ہر حال قید ہو گیا کہ میں نے اس جرم میں شامل ہونے سے ہرگز نہیں کیا۔ لیکن وہ اتنا سمجھ گئے کہ میں کوئی کم عقل آدمی نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں جو نشانہ بھارت کی انٹیلی جنس کا دفتر تھا۔ میری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ایک ہندو میجر نے مجھے کہا کہ میں پاکستان واپس چلا جاؤں۔ باقاعدہ سنگٹک کروں لیکن مجھے جاسوسی کرنی پڑے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے ٹھوڑے دنوں کی ٹریننگ دیں گے۔

”میں نے اسے کہا کہ میں طرح میں سرنگارنا سچا اور ایک ہی بیان دے رہا ہوں۔ اسی طرح میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ میں کتنا ہی سنگٹک کیوں نہ ہو جاؤں۔ اپنے ملک کو دھوکا نہیں دوں گا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں پاکستان میں جرم نہ نہ گئی ہوں کہ ہا ہوں لیکن میں یہ نہیں چھو سکنا کہ وہ میرا وطن ہے۔۔۔۔۔

میں کسی ہمدرد سے بھلائی کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ میجر میری صحت گوئی سے



”اللہ کی ذات میں مشرقی پاکستان نظر آتا ہے۔“

اس لوٹکی کے ہوشوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مینیئر نے پاکستان کے متعلق پھر وہی مذہباتی سی باتیں کہیں۔ جیسے وہ پہلے کرتا رہا تھا۔ لیکن میں لک میں پڑا رہا۔

اس کے بعد ہماری تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک روز میں نے پیشانی پر کمر اسے کہا۔ ”مینئر! جس طرح تم نے انڈین ایشیائی جنس کے سامنے بالکل سچا بیان دیا تھا، اسی طرح مجھے بھی سچ بتاؤ کہ وہ کونسا ہے؟“

ایسی چند اور باتیں کر کے اس نے مجھے کہا کہ آؤ ذرا دھرم خان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ باغ میں اس نے جا کر کہا کہ تم نے اچھا کیا ہے جو مجھ سے پوچھ لیا ہے کہ میں کیا ہوں۔

”میں ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ میرے والد پیر سے ہیں لوگ تھے۔ اتنی محدود آمدنی ہیں بھی انہوں نے ہم پانچ بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائی۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں سب سے بڑا تھا۔ میں جب تھوڑا بڑا ہوا تھا تو ایک روز مذہب نے اپنے امی اور آپا کو بڑی پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ بہن نے گھیر کر پوچھا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ اچھا کہنے لگی کہ بیٹا! تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری بہن جوان ہو گئی ہے۔ رشتوں کے پیغام آتے ہیں۔ لیکن ہم کسی کے آگے ہاں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو میرا بھائی تھا وہ لک کی بات ہے۔ ہم بارات کو کھانا بھی کھانے کے قابل نہیں۔ تمہاری اس بہن کے بعد دوسری بہن جوانی کو پہنچ رہی ہے۔“

”طریق بھائی! ایسے معمول ہوتا ہے کہ خدا نے میرے اندر کوئی خاص ناکارہ ڈال دی ہے یا شاید میں بہت حساس ہوں۔ دونوں بہنیں میرے اصرار پر غالب آ گئیں تھیں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ بڑھائی چھوڑ دوں گا اور کوئی ٹوکری تلافی کروں گا۔ کہیں اپنے اس باپ کو پریشان نہیں دیکھ سکے گا تھا۔ امی آپا نہیں چاہتے تھے کہ میں تعلیم اور صوری چھوڑ دوں۔ لیکن میرے اندر اتنا پختہ عزم ہے کہ اسے تم ڈھیلے پن

میں نے ہو کر کر دیکھا۔ ایک خوش پوش پوش آدمی نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں اسے نہ پہچان سکا۔ لیکن جب اس نے بات کی تو اتنی ہنس آواز نے پہچان آسان کر دی۔ وہ مینیئر تھا۔

وہ مجھے قریب ہی ایک ہوٹل میں لے گیا۔ میری ذات میں وہ کچھ عورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ پوچھتا تھا کہ پھر کسی مشن پر کب جاؤ گے گا۔ کہیں نے اسے بتا کر میں اس کام سے فارغ ہو چکا ہوں اور اب اپنا ہی کونٹری فریڈر معاشرہ ہے۔

”طریق بھائی!“ اس نے مینیئر پر ہانپ مارنے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے یہ شکست قبول کر لی ہے۔ جو ہمیں مشرقی پاکستان میں ہوئی ہے؟ میں ابھی ایک سنبھل نہیں رہا۔“

میں نے اسے دسی سا جواب دیا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو اسے ملک کی فتح اور شکست کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو خود کہنا تھا کہ میں پاکستان میں مجبوراً زندہ رہا ہوں۔ مجھے یہ شک بھی تھا کہ یہ شخص میرے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ کہیں بھارتی جاہلوں تو نہیں بن گئے؟ میں براہ راست اس سے ایسی بات پوچھ نہیں سکے گا تھا۔ میں نے بھی آخر جاہلوں کی تھی۔ ٹریفک کی تھی۔ تجربہ حاصل کیا تھا، میں نے اس تجربے کے داؤ بیچ کھینچے ہوئے اسے اپنا پٹا پڑ بنایا۔ جب ہم رخصت ہوئے تو اس نے مجھے اپنے گھر کا پتہ دے کر کہا کہ کل رات کا کھانا میں اس کے گھر کھاؤں گا۔

اگلے شام میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں یہ ارادہ کر گیا تھا کہ اسے ٹھیکہ بنا کر دیکھوں گا کہ اس شخص کی اصلیت کیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے تعارف کرایا وہ ساڑھے رنگ کی ایک عام سی جوان لڑکی تھی اور وہ بنگال تھی۔

”طریق بھائی!“ مینیئر نے کہا۔ ”یہ لڑکی بنگال دیشی نہیں یہ مشرقی پاکستانی ہے۔“



سیکڑاڑ کا ایک کلاس فیلو تھا۔ سیکنڈ لیئر میں وہ کالج سے چھال گیا تھا۔ میری طرح وہ بھی وہ میا نے درجے کے گھرانے کا لڑکا تھا۔ یکین میں اس کا سوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ سوٹ کہاں سے اڑایا ہے؟ اس نے کہا کہ بھی تم مجھ سے یہی پوچھو گے کہ وہ کار کہاں سے اڑائی ہے۔

”اس نے مجھے اپنی کاد دکھائی اور وہ مجھے ایک اعلیٰ درجے کے جوٹل میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے یہی سہائی کہا کہ تم دی جو نہیں سنا کرتے تھے اس نے کہا کہ تم بیوقوف ہو۔ اگر کم سٹوڈنٹ بیٹریں جاتے تو تمہارے دار سے پیار سے ہو جاتے۔ جس سیاسی پارٹی کے ساتھ تم لگ جاتے۔ وہ پیسوں سے تمہاری جیبیں بھر دیتی۔ اس نے مجھے کہا کہ تم جہاں بھی گئے۔ تمہارے ساتھ جو باز بات کی گئی کیا تم سمجھے نہیں کہ شرافت سے یہاں کوئی کام نہیں بنتا؟“

اس آدمی نے منیر کو اپنے ساتھ لگایا وہ جانتا تھا کہ منیر میں ایک خاص قسم کی ذہانت ہے۔ ان ہی دنوں حکم آیا تھا کہ سورہ پے اور چاچا میں روپے کے نوٹ بکوں میں جمع کروا دیے جائیں۔ یہ شخص منیر کو ایک بک کے سامنے لے گیا۔ وہاں ایک بیوی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ نوٹ تبدیل کروانے آئے تھے۔ اس شخص نے منیر کو بتا دیا کہ کچھ لوگ سو رخ ٹکٹے سے پتے میاں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ دنوں سے آ رہے ہیں۔ سارا دن قطاریں کھڑے ہو کر گزار جاتے ہیں۔ ان کی بارہائی نہیں آتی۔

یہ شخص منیر کو ایک قطار کے آخروں لے گیا اور ایک حنفیہ نشین بزرگ سے پوچھا کہ ان کے پاس کتنے نوٹ ہیں۔ بزرگ نے بتایا کہ سو سو اور چاچا میں پچاس کے نوٹ ملا کر کل بارہ سو روپے ہیں۔ منیر کے سابق کلاس فیلو نے اس بزرگ سے کہا کہ ایک کپا بک یہاں کھڑے ہیں گے۔ یہ ایک ہزار روپیہ مجھ سے لے لیں اور بارہ سو روپے حوالے لے لیں۔ بزرگ نے پیشانیان یا حیران حوزے کے بجائے دعائیں دیں اور کہنے لگے کہ

بھی کہہ سکتے ہو۔ کہیں اگلے روز کالج جانے کے بجائے نوکری کی تلاش میں نکلا کھڑا ہوا اسی شام سے ٹاپکال بھی سیکھنی شروع کر دی۔۔۔۔۔

”کئی دنوں تک میرا معمول یہ بنادیا کہ درخواست لکھتی اور کسی دفتر میں جا کر سے دینی اور وہاں سے ٹکاسا جواب لے کر واپس آ جاتا۔۔۔ طارق بھائی و اگرچہ تمہیں یہ بتانے لگوں کہ مجھے کیا کیا جواب ملے اور میں نے کیا کیا دیکھا تو تم کو گئے کہ منیر جھوٹ بولتا ہے۔“

اس نے وہ تمام محکمے گزرائے جہاں اس نے درخواست دی تھی لیکن دفاتروں سے تو اسے یہ جواب ملا کہ کم از کم کسی وزیر کی سفارش لاؤ۔ دفتروں کے لوگوں سے اسے یہ جواب ملا۔ ”پندرہ ہزار روپیہ نقد لاؤ اور اس کو کر سہی بہرہ بٹھ جاؤ۔“

منیر بہت ہی پریشان ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ تو پندرہ روپے بھی دینے کے قابل نہیں۔ اسے پچیسے پیار سے کہا گیا کہ پندرہ ہزار کم دو مہینوں میں پورے کر لو گے یہاں نوکریوں کی بولی بولی جاتی ہے۔ یہاں سے منیر کا دماغ بھر گیا۔ دماغ تو پھر نکلا تھا۔ اس نے آخری دفتر میں جا کر فی الا واقعہ نے ہوئے کہا کہ مجھے چوپڑا ہی رہی کہہ لو۔ مجھے اپنی دو بہنوں کی شادی کرنی ہے۔ مجھے اس اخیر نے منیر سے کہا۔۔۔۔۔

”دیکھو بھئی، میں تو شادی شدہ ہوں۔ میں تمہاری بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔“

”طارق بھائی؟ میں نے کبھی کسی کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس روز

میں قتل پر بھی تیار ہو گیا۔ لیکن اچانک دو دنوں میں اور بوڑھے ماں باپ میری ٹوکھوں کے سامنے آ گئے۔ میں نے اپنے خون کا گھونٹ بھر لیا۔ جب میں باہر نکلا تو مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں زمین پر چل رہا ہوں یا آسمان پر۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ مجھ جیسوں کی مدد خدا ضرور کرتا ہے۔ جس طرح اس روز میں نے تمہیں راہ دے جانے کمنہ بہرہ نہ تھا کہ روکا تھا۔ اس طرح میرے کمنہ سے یہ ہاتھ چلا۔ میں نے دیکھا وہ میرا



ہداری تسلی دی کہ وہ بری ہو جائے گا۔ مجھے کچھ شبہ نہیں کہ وہ بری ہو ابھی تھا یا نہیں میں  
کوسمی ہو کر جاتا چھٹا نہیں تھا.....

”میں نے دونوں بہنوں کی شناسی کر دی اور جہیز ایسا دیا کہ لوگ حمد کی نظروں سے  
دیکھتے تھے۔ میرے بااُمی اور بہنیں مجھے لعنت علامت کرتی تھیں کہ میں کہیں ہاتھ مارا ہوں۔  
میں انہیں بھی ہتھی مٹھیں کھاتا تھا کہ میں یہ منہ ڈی اور سبزی منڈی میں دلائی کرتا ہوں۔  
میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میرے اندر ایک فائوٹو گراف تھا۔ وہ میدا ہوتی تو میں استا و  
بانگیا۔ ملوڑی کوڑوں کے چھ سات ملوڑوں سے میں نے مجموعی طور پر کچھین ہزار روپیہ منیٹھا۔  
آخر ایک بار پڑا گیا اور ایک سال ہزار گئے قید ہوئی اور اٹھویں مہینے میں جیل سے نکل آیا  
لیکن اب میں ایسے تھا۔ پیسے میں سکول سے نکل کر یونیورسٹی میں گیا۔ اور آخری ڈگری حاصل  
کر کے نکلا۔ تم نے خورجیوں میں دیکھا ہے کہ جی جی جی جی جی جی جی جی جی جی جی جی جی جی جی  
جی استا و مل گئے اور انہوں نے ایسے ایسے ہاتھ سکھائے کہ میں جی لان رہ گیا۔  
”میں نے جیب تراشی، اٹھائی گیری، وکیٹی وغیرہ کی طرف تجربہ نہ دی۔ مجھے جی لان  
اور صحرانوی زیادہ پسند آئی۔ میں جیب جیل سے نکل کر آیا تو ایک پٹرول پمپ کے قریب  
سے گزر رہا تھا۔ ایک لاکھ پٹرول میں اگر کر رہی۔ ایک لاکھ پٹرول ڈیالنے لگا۔ وہ اپنے  
میں گن تھا۔ ہار والا اپنی سیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے پاس چلا گیا۔ ہاتھ  
اس کے آگے لایا اور پوچھا ”کتنا ڈنوار ہے ہیں صاحب؟“ اس نے لہجہ چالیں۔ اس کے  
ساتھ ہی اس نے دس دس کے کچھ نوٹ مجھے پٹرول پمپ کا آدی بھی کر میرے ہاتھ میں دے  
دیئے۔ میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

”اُن دنوں سینینٹ نہیں ملتا تھا۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ ان کے پاس پیسہ تھا بلکہ  
لاٹو پیسہ تھا۔ لیکن انہیں سینینٹ نہیں ملتا تھا۔ یہ فرارڈ اپنی جان بچان کے لوگوں کے ساتھ  
ہوتا ہے۔ میری جان بچان قاضی ہو چکی تھی۔ میں کسی ایک آدمی کو بیٹھا نسخہ کڑا سنے سینینٹ  
کا ہر قیامت وصول کر لیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سینینٹ قرضے ملتا نہیں تھا اور میرا کمال یہ  
تاکا کہ اسے مطمئن رکھوں کہ سینینٹ مل جائے گا۔ اس کاروبار میں کامیاں کھاتی پڑتی تھیں۔

اس عمر میں میں چار روز سے آرام ہوں۔ وہ بزرگ قطار سے ملے آئے۔ بانہ سورہ پیر ان  
کے حوالے کیا اور میرے دوست نے ایک ہزار روپیہ دی دس کے نوٹوں کی شکل میں  
آئے دے دیا۔ وہ بزرگ دھائی دیتے چلے گئے۔

میر کا دوست آئے بانک کے اندر ملے گیا۔ ایک لوک کے آگے سو سو روپے کا  
پچاس کے نوٹ رکھے۔ لوک نے دو منٹ میں دس دس کے نوٹ اس کے حوالے کر دیے  
باہر آکر اس نے سیر کر بتایا کہ لوک نے اپنے پچاس روپے کاٹ لیے ہیں۔

”ظاہر بھائی؟“ اس نے کہا۔ ”جتنے دن یہ نوٹ تبدیل ہوتے رہے۔ میں دو  
تین ہزار روپے کر تا رہا۔ میرے اس دوست نے مجھے ایک روز دعوت دی کہ پیلر  
توہیں بہشت بھی دکھاتے ہیں۔ وہ مجھے طوائفوں کے بازار میں لے جاتا چاہتا تھا۔ میں  
نے اسے کہا کہ میں یہ جرم اپنی حیاتی کے لیے نہیں کر رہا۔ میری جیب میں یہ ساری رقم  
حرام کی ہے۔ لیکن میں اسے حرام کاموں میں صانع نہیں کروں گا۔ میں تمہیں سچی  
بات بتاتا ہوں کہ شراب اور طوائف بازی تو دور کی بات ہے۔ میں نگرے ایک  
نہیں مینا.....“

”اس دوست نے جہاں کا میں نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ایک اور راستہ  
پتا دیا۔ اس نے مجھے کہا کہ ملوڑی کوڑوں کا ایک میجر ہے۔ میں ایک آدمی کو توہمہ مارے  
پاس لاؤں گا اور اسے یہ بتاؤں گا کہ تم اس میجر کے چچا زاد بھائی ہو اور وہ میجر  
توہمارے اشاروں پہنا چکا ہے۔ چھڑیں تمہیں اس شخص کے سامنے کوہن لگا کر ان پر  
ایک کسب میں گیا ہے جو توہمارے رشتہ دار میجر کے پاس ہے۔ تم مجھ پر اور اس پر شک  
بھٹانے کہ تم اسباب غلط کام نہیں کرو گے۔ پھر میں تمہاری منگیں کروں گا اور آخر میں تمہیں  
دو تین ہزار روپے دوں گا۔ تم یہ نوٹ پھینک دینا اور کہنا میں پانچ ہزار سے کم  
نہیں لوں گا.....“

”مختصر یہ کہ اگلے ہی روز پانچ ہزار روپے میری جیب میں آ گئے۔ سائل کے  
جانے کے بعد میں نے اڑھائی ہزار روپے اپنے دوست کو دے دیے۔ سائل کو ہمارا



تو میں نہیں اپنا بیٹا ہو کر نہیں سمجھوں گا۔ تمہارے ساتھ بات کرنا بھی لوگ انہیں کروں گا اور اگر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہو گا۔ چھر میں بہنوں کے گھر گیا۔ انہوں نے مجھے رو رو کر کہا کہ تم کس دنیا میں چلے گئے ہو۔ دونوں بہنوں نے مجھے ایسا اپنے گھر رہنے کی پیشکش کی لیکن میں اپنے قابو سے نکل چکا تھا۔۔۔۔۔

میں کب کہیں بھی جا کر آباد ہو سکتا تھا۔ لیکن میں اپنی وہ بڑی نہیں کاٹ سکتا تھا جو میرے گھر نے میں بھی نہیں گھر سے رشتہ نہ توڑ سکا۔ مجھے گھر گئے ہوئے دو تین دن ہو گئے تھے۔ ایک دوست ملا۔ اس نے مجھے بڑا خوشگوار کر لوگ تمہارے باپ کی بے عزتی کر رہے ہیں اور تم عیش و عشرت کر رہے ہو۔ میں یہ سن کر بڑا پریشان ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ مالک مکان نے کوئی فائدہ بھی تھا جس نے میرے باپ کی بے عزتی کی اور یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ دو دن کے اندر مکان خالی کر دو یا موجودہ کرایہ سے دو گنا کر دیو و دودھ نہ مارا سناں اٹھا کر باہر چھینک دیا جائے گا۔

”میں جاگ بھاگ اپنے گھر گیا۔ اما سے پوچھا کہ وہ کون تھا۔ ابا نے مجھے کلیاں دیں اور کہا کہ تم اگر حلالی ہوتے تو راج میری بے عزتی نہ ہوتی۔ باپوں کو بیٹوں پر اتار ہوتا ہے۔ میں وہ دن گھر رہا۔ ابا سے کوئی بات نہ کی۔ تبسیر کے دن وہی نمونہ ہمارے گھر آیا۔ میں باہر نکلا۔ وہ شاید مجھے جانتا ہی نہ تھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک لیا۔ میں نے اسے کہا کہ مالک مکان سے تم نے کتنے پیسے لیے ہیں۔ اس نے کوئی ان چار سو روپے کی رقم سنائی۔ میں نے اسے کہا کہ تم یہ پینہ کرو گے کہ میں چار سو روپوں کے پیچھے تمہاری کوئی ٹانگ یا بازو ہمیشہ کے لیے پیکار ہو جائے؟ وہ بھی آخر نمونہ تھا۔ کچھ تو تو میں میں ہوئی اور وہ چلا گیا۔ میری بھی یاری ایسے ہی لوگوں کے ساتھ تھی۔ میں نے چار پانچ غلطے ساتھ لیے۔ پہلے اس غلطے کے کرکٹ اوٹ سے باہر نکلا کہ مار مار کر پٹنے کے بجائے زبانی کہا کہ اتنے دیر سے گھر کا رخ نہ کرے۔ وہاں سے میں ان غلطوں کو ساتھ لے کر مالک مکان کے گھر گیا۔

طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ جتنی کامیاں شہر پر مجھے ملتی ہیں ویسی ہی کامیاں اس فرضی آدمی کو دینا جیسے میں غائب کرتا تھا کہ اسے رقم دے دی ہے۔

”گامیاں کھانکھان میں مکمل طور پر ڈھکیٹ ہو گیا۔ جلی میں ایک اور فریڈ کی بھی تنہائی حاصل کی تھی۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ عدالتوں میں ملزمانوں کا جو ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے لائے جاتے ہیں۔ کتنا بھرم ہوتا ہے۔ ان میں اکثر سپردی ہوتے ہیں یا ان کے تعلقات محدود ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ضمانت پر رہا نہیں ہو سکتے۔ ایک مدت سے بوس خاں کا کاروبار چل رہا ہے جو کرپٹی میں سب سے زیادہ ہے۔ منظم کے ساتھ سودا باز کی کرلی جاتی ہے اور حاشیہ دار کے جعلی کاغذات اور رجسٹرڈاں وغیرہ عدالت میں پیش کر کے جبر جیسا کوئی فریڈ یا منظم کو ضمانت پر پا کر دیتا ہے۔

”میں نے یہ کام شروع کر دیا۔ منظم کی حیثیت کے مطابق اس سے فیس کمیشن لے لی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کا روبرو لوگوں آگے چلایا جاتا ہے کہ وہ میرے فیسیں سے بیٹھے بوس خاں منظم کو پا کر کہتا ہے کہ میرے کاغذات جعلی ثابت ہو گئے ہیں۔ میں ایک ہی صورت میں پیچ سکتا ہوں کہ تمہاری ضمانت منسوخ کروا کے کہیں بھاگ جاؤں۔ منظم دوبارہ جیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مقدمے کی کئی سال چلتے ہیں۔ وہ ہاتھ بڑھاتا ہے اور مورقہ پر پیش کرتا ہے۔ اس طرح بوس خاں میں ایک بلیک جادی کھٹے ہیں۔

میں نے اس کا دوبارہ سے بھی فوب کیا اور یہ رقم چھوٹے بھائیوں کی تعلیم پر خرچ کرتا ہوں۔

مجھے پتہ چلا کہ جعلی فیما اور چرس بھی بنائی جاسکتی ہے۔ جو دوسرے ملکوں کو مشکل کی جاتی ہے۔ مجرموں کی دنیا میں میرا ایک مقام بن چکا تھا۔ ان لوگوں سے پتہ چلا کہ جعلی افیم چرس وغیرہ کس طرح بنائی جاتی ہے۔ میں نے کچھ مقدار چری محنت کر کے تیار کر لی لیکن میں سولگامک کے ہنس سے بالکل ناواقف تھا۔ میرے ایک دو دوستوں نے ایک پارٹی کے ساتھ تعارف کروا دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھی کھادی تھی۔ میرے جعلی مال پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ وہاں سے چپ میں واپس آیا تو میرے ابا اتنی مجھ سے بیکانے ہو چکے تھے۔ ابا نے مصافحہ نظروں میں کر دیا کہ تم اس گھر میں رہو گے



ادارہ کار پانچ مکان خالی کر دالیے اور پچیس ہزار روپیہ مل گیا۔ میرے ساتھیوں نے غصہ کیا۔ یہ رقم چاروں نے تقسیم کر لی۔

”اتنے بڑے شہر میں ہزار ہا مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ میں اسی کو ادارہ بنانا چاہتا تھا۔ ایک روز ایک مالک مکان نے مجھے کہا کہ دس باہ سال سے میرے ایک مکان میں بنگالی خالوں رہتا ہے۔ وہ خیریت سے لوگ ہیں۔ کرو نہیں بڑھاؤں اور مکان بھی نہیں چھوڑتے۔ اس نے کہا کہ آپ تین ہزار روپے لے لیں۔ اور وہ مکان خالی کر وادیں۔ یہی ان کا پتہ کر رہا ہوں گا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ کتنے پانی میں ہیں اور کیا غصہ گردی کی ضرورت ہے یا نہیں چھوڑا مکان ملے گا۔ میں نے وردازہ لکھکھٹایا تو ایک بوڑھا سا بنگالی ہنس آیا۔ میں نے اسے کہا کہ تم مکان کیوں نہیں خالی کرتے۔ میں کل شام تک تمہیں یہاں نہ آؤں۔“

بوڑھے نے مجھے کچھ نہ کہا۔ مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ مجھے پانی پر بچھا کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ پہلے تو اس نے میرے پاؤں پر پیسے پھینکے۔ اس نے کہا کہ چھوٹی سی دکان ہے جو میرے کفن کو بڑی مشکل سے روٹی کھا سکتی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت میرے سر پہ ہے کہ میری ایک بیٹی لان ہے۔ میں اسے صرف زندہ رکھ سکتا ہوں۔ اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ میں لانا ہوں مجھے تھوڑا عرصہ اور اسی کرایے پر رہنے دو۔ شاید بیٹی کا ہاتھ کسی اور میں دینے کے قابل ہو جاؤں۔

”میں نے اسے کہا کہ تم اپنے وطن کیوں نہیں گئے اب تو تمہارا اپنا وطن بن گیا ہے۔ اس نے میری دعا مانگ کر اپنا ہاتھ اس طرح دیا جیسے اس کی انگلیاں سے گزرتی ہیں آخر چاہیں گی۔ اس نے جذبات سے کاہنی آواز میں کہا کہ میرا وطن ہے۔ میری اور میرے خاندان کی قبریں اسی مٹی میں نہیں گی۔ تم جسے بنگلہ دیش کہتے

اس شخص کا میں کوئی ادب خالص نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گلے میں لکھڑے ہو کر اسے گایاں دے کر نہ لکھا۔ وہ باہر آیا اور اندر بھاگ گیا۔ محلے کے لوگ جمع ہو گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس شخص نے کیا حرکت کی ہے اور میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے محلے والوں سے کہا کہ اسے باہر نکالو اور یہ وعدہ کرے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

باہر آنے کے بجائے اس نے ہمیں اندر بلایا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ میری اور بے عزتی نہ کرو۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ میں نے اسے کہا کہ اسے ایک پیسہ فالتو کرنا یہ نہیں ملے گا اور اس نے غصہ سے بھیچے یا مقدمہ دائر کیا تو اس کا گھر اسی رات ٹٹ جائے گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ کرایہ لینے بھی وہاں نہ جائے۔ کرایا اسے یہیں مل جائے گا۔ میں نے گھر کا ربا اسے کہا کہ آئندہ وہ کسی کو کرایہ نہ دے۔ میں خود کرایہ پہنچا کر دوں گا۔

”اس مالک مکان کو ٹھکانے لگا کر ہم واپس آ رہے تھے تو میرے ایک غصہ مند دوست نے کہا کہ یہ کاروبار بڑا اچھا ہے۔ تین چار سو روپیہ وصول کرو۔ کسی شریف کو یہ وہ کوڑھکیاں دو۔ مکان خالی کروالو۔ میں نے کبھی غصہ مند کوڑھکیاں کی تھی۔ لیکن یہ کاروبار مجھے پسند آیا۔ میں نے چند دفنوں میں جا پانچ مکان مکان ڈھونڈ نکالے۔ ہر ایک کے ساتھ کچھ اس طرح کی باتیں کہیں کر آپ لٹا کر لے لے رہے ہیں؟ انہوں نے جو کرایہ بتایا۔ میں نے اس سے دوگنا کر لیا کہ کہا کہ آپ مکان خالی کر وادیں۔ ہر آپ کو پڑا ہوا کرایہ دار لادیں گے۔ ہر مالک مکان نے یہی مشکل بتائی کہ کرایہ دار مکان خالی نہیں کرتے۔ میں پانچ ہزار بتا کر کہنا کہ یہ رقم دے دو۔

اور پیرتوں تک مکان خالی نہ لے۔“

”مالک مکان تو چاہتے ہی میں کہہ رہا تھا کہ یہ بڑھایا جائے۔ بعض پرانے کرایہ داروں کو کوئی نئی ہزار روپیہ پیش کر کے یہی کہہ وہ مکان خالی کر دیں یہ میری مدد میں کش نہیں پڑی ابھی گنتی اور صرف ایک فیصد میں نہیں نے کرایہ داروں کو غصہ دلوں سے



## شانتی اور شیطان

میں جب بھارت میں قید کاٹ رہا تھا۔ تو اُمید نہیں تھی کہ قید مکمل ہوئے پر رکن واپس چلا جاؤں گا۔ میں سال باقی پاکستانیوں کا تھا۔ جو دہائی قید تھے۔ ہم کو کش کرتے تھے کہ اپنے آپ کو زیادہ تر مصروف رکھیں۔ جیل میں سارے دن کے لیے کام نہ ہوتا نہیں تھا۔ ہم جب فارغ بیٹھے تو ایک دوسرے کو جھوٹے بچے واقعات اور کہانیاں سناتے گئے تھے۔ نا بھر جیل ان دنوں پاکستانیوں کے سنٹر کی حیثیت رکھتی تھی۔ مشرقی پنجاب میں کوئی پاکستانی جوان بھی گرفتار ہوتا اور اسے سزا ہو جاتی تو اسے "بھوجیل" میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طرح بھارتی مسلمان بھی جب پنجاب میں گرفتار ہوتے تو انہیں بھی زیادہ سزا دی جاتی تھی۔ یہی بھیجا جاتا تھا۔ خصوصاً عادی مجرموں کے لیے تو یہی جیل مخصوص تھی۔

ایک روز ہم لوگوں سے جیل کے "چکر" میں مشقت لی جا رہی تھی۔ "چکر" جیل کے بین درمیان آس چکر کو کہتے ہیں، وہاں انچارج حوالدار بیٹھتا ہے اور عموماً نئے قیدی سب سے پہلے یہیں آتے ہیں

نمبردار رُپنا قیدی (مکھن سنگھ چولہ دھیا نے کارہننے والا تھا اور ایک ہندو بدعاش کو قتل کر کے بیس سال قید کاٹ رہا تھا۔ اس جیل میں آتے ہی میرا دوست بن گیا۔ اُن دنوں آس کی دیوانی چکر میں تھی۔ ہمارے سامنے قیدیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

مکھن سنگھ نے مجھے کہا، "مہیاں؛ شانتی دلیوی والا دلا دیر لگا گیا ہے"

ہو وہ میرا دلش نہیں۔ وہ دلش ہندو نے بنایا ہے۔

اگر تو مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو تو میں بھی اسی مٹی پر تڑپ کر جاؤں گا اس نے پھر میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگا کہ مجھے پر دلیسی سمجھ کر نہ دھتکا کرو میری جوان بیٹی کے حال پر رھ کر۔

"جس طرح پاکستان کے ایک افسر نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہاری بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا تو میرے اندر جو ارتش فشان پھٹ چلا تھا۔ وہی پھر پھٹ پڑا کہ نے بوڑھے بنگالی سے پوچھا۔ کہاں ہے تمہاری بیٹی؟ اس نے آواز دی اور ایک سالوں کی لڑکی کرے میں آئی۔ وہ کوئی اتنی خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں مشرقی پاکستان کی لاش اور اس کے باپ کی غریب نظر آ رہی تھی۔ میں نے کچھ سوچے سمجھے پیر پڑھے سے کہا لو میں تمہاری بیٹی کو زیادہ لے جاؤں گا۔"

"بوڑھے کا سونلا رنگ لال ہو گیا۔ وہ سمجھا شاید میں کوئی بدعاشی کی بات کر رہا ہوں یا اس کی غریبی پر طنز کر رہا ہوں۔ میں نے بہت سی باتیں کہیں کر اس کے وہم اور شک شبے دو کر دیے۔ پانچ چھ دنوں بعد میرا اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح ہو گیا میں نے اس مکان کے مالک سے کہا کہ آئندہ اس بوڑھے کو پیشانی نوکر سے۔ جب میری مالی پوزیشن بہتر ہوگی تو میں خود ہی کر لیا یہ بڑھا دوں گا۔

"بوڑھے کی ایک چھوٹی سی منیاری کی دکان تھی۔ میرے پاس کافی رقم تھی۔ میں نے ایک بڑی دکان کر لیا یہ پرلے لی اور بوڑھے کو جو میرا سرین چلا تھا۔ اپنے ساتھ لکھایا۔ انٹرنے کریم کریمیری مرکت ایک بینکی پر میرے گناہ معاف کر دیے اور میرا کاروبار چلا گیا۔ اب بڑی خوشحالی کی زندگی گزر رہی ہے اور میں شریفوں کی زندگی میں دلچسپی لگائی ہوں"



لیا خبریاں جنہاں میں چھپ چکی تھیں۔ لیکن اصل کہانی نذیر سے معلوم ہوئی۔ اس نذر اخباروں کو تو مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کا بہانہ لیا تھا۔ لیکن حقیقت کہتا رہی۔

اس کہانی کا آغاز لکھنؤ کے ایک انیمیر کیپٹن سے ہوا جہاں ایک دوست مندر لہ دوار کا واس نے ایک نوجوان بیوہ شائقی دیوی سے شادی کر رکھی تھی۔ شائقی کوئی غریب یا گری پڑی عورت نہیں تھی کہ وہ دوار کا دس چھپے کے ساتھ بیوہ دی جاتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بیوہ ہو کر گھر آ بیٹھی تھی۔ اور ہندو عورت اگر بیوہ ہو جائے تو اس سے کوئی بھی بیاہ نہیں کرتا، نہ ہی وہ بے چاری خود شادی کر سکتی ہے۔ اس سے اس کا دل بھر شٹ ہو جاتا ہے اور معاشرے میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھ دیا جاتا ہے۔ شائقی دیوی نے دوار کا دس کے ساتھ شادی پر صرف اس لیے ہاں کی تھی کہ اس کی نظر دوار کا دس پر نہیں بلکہ اس کے نوجوان بیٹے کیلش پر تھی۔ اس نوجوان کے ساتھ شائقی دیوی کی ملاقات پہلے کہیں ہو چکی تھی۔ اس کی ڈیلی ڈول کچھ ایسی تھی کہ شائقی دیوی کی پہلی ملاقات میں اس پرست ہو گئی تھی۔ دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تو بھلا ہی

ہو گیا تھا۔

شائقی بیاہ کر کے دوار کا دس کے گھر آئی تو اسے کھن کر اپنی ہرکس پور کر کرنے کا موقع مل گیا۔ لاکے کا بیٹا کیلش ڈیلی ڈول کا تو بڑا دلکش اور مضبوط تھا۔ لیکن ذہنی طور پر بڑا ہی کمزور تھا۔ وہ جلد ہی شائقی کے قابو آ گیا اور شائقی نے اس سے غلط چلتا استغوا کر لیے۔ ذہنی کی نظروں میں وہ بالکل تھے۔

کیلش اس بری طرح شائقی کے شکنجے میں پھنس چکا تھا کہ شائقی کے ہاتھ میں کھدانا نہ گیا۔ ان کا یہ گھناؤنا کھیل جاری تھا کہ ایک ایک بجلی لار دوار کا دس نے

شائقی دیوی کو ایک روڈ پٹی ہندو لالے کی بیوی تھی۔ جسے کوئی مسلمان بھگتا کر لے گیا تھا۔ اور اس کی خبریاں اخباروں میں چلی سرخسوں کے ساتھ شائقی جو رہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو شائقی دیوی کا حسن تھا اور دوسری وجہ یہ کہ اس کا کرٹہ پتی خاوند بڑا بڑا تھا۔ اتنی زیادہ تشہیر کی وجہ ہندو اخباروں کا مسلمانوں کے خلاف تعصب تھا۔ وہ لوگ ایسی خبریں جن میں کوئی ہندو یا سکھ عورت کسی مسلمان کے ساتھ بھاگ جائے یا بیاہ کر لے، اتنی اچھا لاکر لے جتے کہ اس پر ہمتی ہندو آباد میں آتش تھلا بیٹا ہو جاتا اور وہ مسلمان آبادیوں پر حملے شروع کر دیتے تھے۔

نذیر بآب شائقی دیوی کے اعزاء میں تین سال قید لے کر آیا تھا۔ اس کے آگے سے پہلے ہی اس کے افسانے جیل میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن میں اس کی زبان پر سارے واقعات سننے کے لیے بے چین تھا۔ جیل کا چکر ایسی جگہ ہے۔ جہاں ہر وقت کسی نہ کسی افکری آدمی کا دھڑکا دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے قیدی ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے غافلہ فحشاء رہتے تھے۔ میں نے سرسری نظر سے نذیر کا جائزہ لیا اور اپنے کان میں گئی مگن رہا۔

دوسرے ہی روز نذیر کو شفقت دے کر ہمارے ساتھ جیل کے احاطے میں بھیج دیا گیا۔ مسلمان ہونے کے باعث غلام رہے۔ ہمیں اس سے ہمدردی تھی۔ اگلے دو چار روز میں میری اس سے

گلا

چھٹنے لگی اور ایک روز چپ میں نے اس سے شائقی دیوی کے اعزاء کی کہانی سنی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”علاقہ بھائی!“ اس نے کہا۔ ”اگر تم یہ کوکر مجھے یہ قید شائقی دیوی کے احاطے کے الزام میں ملی ہے تو میں نہیں ماننا۔ میرے بھائی شائقی دیوی تو میرے گلے لگتی تھی۔ ورنہ یہ کوئی ایسا جرم نہیں تھا۔ میری تو ساری زندگی جرم کرتے ہی گزری ہے آج تک جیل کا منہ نہیں دیکھا تھا، اب یہ گھر بھی دیکھ لیا۔“

اس نے مجھے جو کہانی سنائی وہ اپنے الفاظ میں آپ کو سننا دیتا ہوں۔ اس کا



کر کے کامنی کو بھی ایک نوجوان کی طرف متوجہ کر دیا۔ دوسری طرف اس نے کیلاش کے کان بھرنے شروع کیے اور اسے بتایا کہ کامنی کا ماضی عظیم نہیں۔ نہ ہی وہ اس میں لہر چڑھی رکھتی ہے۔ اس کی باتوں پر ممکن تھا کیلاش کو یقین نہ آتا۔ کیونکہ وہ خود کو بہت اچھی عورت نہیں مانتی لیکن بہت دھند و مباحثے میں ایک دوسرے کی ماں بہن سے ابا بڑا تعلقات معمول کی بات ہے اور یہ کیونکر غیر معمولی حرکت نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کیلاش اس کے کہنے میں آیا۔ پھر شانتی نے ایک اور دوا دکھایا۔ ایک دوا کا ماضی اور اس نوجوان کو کسی بہانے سے ایک چکر اکٹھا کر کے کیلاش کو یہ مان لے گئی۔ اس نے دونوں کو سنسن ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو اس کا شک شک یقین میں بدل گیا۔

شانتی کی سکیم کامیاب رہی اور دونوں کو اس نے ایسے شاندار طریقے سے بے وقوف بنایا کہ ایک روز کیلاش نے شراب کے نشے میں کامنی کو مٹری طے کر دیا۔ ڈالاکامنی کو کو غریب گھر کی لڑکی تو تھی نہیں کہ خاموش رہتی۔ وہ بھی ادھر کھیر کرانے کی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بھائی خاصے بد معاش قسم کے تھے۔ لیکن ایسے ویسے بد معاش نہیں تھے جو کوئی غلط دھندہ کریں۔ وہ صرف لڑنے والے بد معاش تھے اور اسے روز کسی ننسی کو پیٹتے رہتے تھے۔ کامنی پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس نے اپنے بھائیوں کو رسا کر ہی ماننا دیا۔ لڑکے غنڈہ بھڑکتے۔ وہ جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے کیلاش سے ملاقات کے بعد اندازہ لگایا کہ اصل شرارت کی بڑ شانتی ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر۔ شانتی کے ماضی کی تحقیقات کی تو اس کے بہت سے کامے کر توت اُن کے علم میں آئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا غلام بھی بڑے پیرا سوا لالت میں مرا تھا۔ جن لوگوں کے درپردہ تعلقات بھی شانتی دیوی سے رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شانتی جیوانی جذبات سے مغلوب رہنے والا شیطانی صفت عورت ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد سدا مٹے عیش و سرور کرنے کے اور کچھ نہیں۔ پھر انہوں نے کیلاش کو

یہ کہہ کر شانتی پر گرا دی کہ وہ کیلاش کی شادی کرنے والا ہے اور اس نے رشتہ پسند کر لیا ہے۔ کیلاش نے تو یہی سمجھا تھا کہ اب اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا شانتی نے بظاہر اس خبر پر بڑی خوشی اور گر مجاہد کا مظاہر کیا اور اپنے پیٹے کی شادی کی تیاری میں لگن ہو گئی۔

کیلاش کی لگائی ہوئی اور اس کے فوراً ہی بعد شادی ہو گئی اور کامنی، کیلاش کی دہس بن کر آگئی۔ کامنی کے آجانے سے کیلاش کی دلچسپی شانتی سے کم ہونے لگی اور اب وہ زیادہ تر اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ کیلاش کو اتنا شانتی کو تنہائی میں ملنے کا موقعہ ہی نہ دے۔

اس صورت حال نے شانتی پر بھی بھلا سہٹ طاری کر دی لیکن وہ تھوڑی عرصہ عورت۔ بجائے کوئی جذباتی قدم اٹھانے کے اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیا اور ایک مضبوط دل میں طے کرنے کے بعد اس پر عمل پیرا ہو گئی۔ اس نے پہلے تو کامنی کو سنبھالا اور جیسے بنانوں سے اس کے کان کیلاش کے خلاف بھرنے شروع کر دیے۔ اس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ ان دنوں کو اٹھے بیٹھے اور میاں بیوی کے تعلقات برقرار رکھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ وہ گھرانہ شہر کا کھیتی گھرانہ سمجھا جاتا تھا اور اسے روز کوئی نہ کوئی پارٹی اگر ان کے ہاں نہ ہوتی تو وہ کسی پارٹی میں چلے جاتے۔ شانتی نے کامنی سے بڑی گہری دوستی کر لی اور اکثر اسے اپنے ساتھ رکھتی۔ اپنے ساتھ اسے مختلف پارٹیوں میں لے جاتی اور رات کو اتنی دیر گئے واپس آتی کہ کیلاش سوچا جوتا۔ اگر وہ چاک رہا ہوتا تو شانتی کامنی کو اپنے کمرے میں باتیں کرنے کے بہانے لے جاتی اور رات کو دونوں وہیں سو جاتیں۔

اس دوران اس نے کیلاش کی کہ کامنی کے گروا گروا کیمرہ کیمرہ نوجوانوں کا جھگڑا لگا رہے۔ ان نوجوانوں کی رالیوں بھی نوجوانان اور حسین عورتوں پر لگی رہتی تھی اور وہ کامنی جیسی خوب صورت اور امیر عورتوں کے متلاشی ہوتے تھے۔

شانتی کو اس مقصد میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہو گئی اور اس نے کیلاش



لہنے والی یہی شانتی دیری ہے اور اس نے کیا لاش کو بیک میل کر کے اس سے  
لہا لٹنے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ کامی کو راستے کا روضہ سمجھ کر اس نے ایک  
لاش کے تحت یہاں سے بھاگنا ہے اور وہ صرف لالہ کی جائداد کے لالچ میں اس  
کی بری بنی ہوئی ہے۔

شانتی کی پہنچ و پکار پر توجہ دینے لالہ ددار کا داس نے اسے گھڑتے حال  
دیا۔ شانتی دیوی اتنی جلدی مار مارتے والی نہیں تھی۔ اس کی نظر ددار کا داس کی کرور وڑوں  
کا جائداد پڑی تھی۔ اس نے یہ بات نہ جان لی تھی کہ اس سب کچھ کے پیچھے کامی کے  
جائیداد کا ہتھ ہے۔ لیکن وہ اپنی لاکھ کرکٹش کے باوجود ان کا بال بھی ہلکا نہ کر سکی۔  
پر روت سے بائوس ہو کر اس نے ہندوؤں کی روایتی کموری یعنی صفیت لالہ لٹھاری کا  
سہارا لیا اور میں پرائس کی ملاقات نذیر سے ہوئی۔

نذیر دہلی کا بگڑا ہوا امیر زادہ تھا اور بچپن ہی میں غلط ماحول نے اسے گندی  
معیت میں بٹھا دیا تھا۔ باپ نے چلنے سے اسے ایف۔ اے کر دیا۔ جس کا نتیجہ  
یہ نکلا کہ وہ پہلے تو چوری چکار ہی کرتا تھا۔ اب پیشہ ور فراڈ یا بزن گیا۔ اس سلسلے  
میں اس نے محفوظ ترین راستہ یہ اپنا کر پڑھے لکھے گپائی دھبائی جوئی کا دپ دھار  
کر اسے ہندوؤں کی آبادیوں میں ڈیرہ ہانا پیشہ وضع کر دیا۔ اس کا یہ پیشہ خوب چکا اٹھا  
اس سلسلے میں نذیر نے باقاعدہ ایک کردہ ترتیب دے رکھا تھا جو اس کے لئے  
نمکھ نے پرستے ہی اس کے کٹھن و کمالات کے چرچے دہاں کر تیا جی سے متاثر ہو  
کر امیر گھرانوں کی ہندو خورتیاں اس کے گرد جمع ہونے لگیں۔

شانتی دیوی کے محلے میں اس کی آمد حال ہی میں ہوئی تھی اور اس کی شہرت کے  
افسانے شانتی کے کالوں تک بھی پہنچ چکے تھے۔ ایک روز وہ نذیر کے پاس اپنا دکھڑا  
شغلہ لائی۔

اس کی جہانی ساخت کو اور اسے  
زیرات سے لدا پھیل دیکھ کر نذیر صحت نذیر بلکہ اس کے چیلے چاشوں کے منہ میں بھی

بھی ڈرا دھمکا کر ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا پتہ لگا لیا۔ کامی کے بھائیوں  
نے شانتی کے بوڑھے خاوند لالہ ددار کا داس کو شانتی دیوی کے بارے میں کچھ بتایا  
فصول سمجھا۔ اس سے کئی باتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ایک تو کیا لاش کی بدنامی ہوئی جو ان  
کا بہر حال بہنوئی تھا اور خود لالہ ددار کا داس اس بری طرح شانتی کے شکنے میں بھینسا ہوا  
تھا کہ وہ ان کی کسی بات پر یقین بھی نہ کرتا۔

کامی کے بھائیوں نے اس صورت حال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک رات  
انہوں نے کسی بمانے سے شانتی دیوی کو گھر سے باہر نکالا اور اسے اغوا کر کے اپنے  
ایک بہم حال دوست کے ٹھکانے پر لے گئے۔ اسے انہوں نے شانتی کو سنبھالنے  
کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ شانتی دیوی کی پراسرار کشش کی پر لالہ ددار کا داس چکر کر رہ  
گیا۔ پہلے تو وہ اس خوف سے پولیس کے پاس نہ گیا کہ اس طرح اس کی اپنی بدنامی ہوگی  
پھر جب اس نے دیکھا کہ اب شانتی کے غائب ہونے پر لوگوں نے کیا تیاریاں تراشی شروع  
کر دی ہیں۔ تو اس نے پولیس سے رجوع کرنا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے ہی کامی کے  
بھائی اس تک پہنچ گئے۔

انہوں نے لالہ سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی پگڑی اپنے ہاتھوں نہ اٹھائے، اس  
کی بیوی کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنے ایک سابقہ آشنا کے ساتھ فرار ہو  
گئی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ جعلی ثبوت بھی آئے دکھا دیے اور چھوٹی  
مچی گو امہیاں بھی پیش کر دیں۔ ان کو انہوں نے حلف آٹھنا کر کہا کہ شانتی دیوی کامی  
بڑا ہی گھناؤنا رہا ہے۔

اس دوران کامی کے بھائیوں نے لالہ ددار کا داس کو یہ خبر بھی دی کہ انہوں  
نے شانتی دیوی کا پتہ لگا لیا ہے اور وہ اسے بہت جلد اس کے سامنے پیش کرنے  
والے ہیں۔ اگلے ہی روز وہ شانتی کو ملے کر گئے۔ اب شانتی نے لاکھ بچہ چاکر  
اپنی بے گناہی کی دہائی دی لیکن لالہ اس کی کوئی بات سمجھنے پر تیار نہ تھا۔ کیونکہ کامی  
کے بھائیوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کے بیٹے اور بہو کی زندگی میں زہر



خاندانہ کا ایک خادم جو کدورت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہمارے پاس آیا اور ان کدورت سے بولا۔ ”چلو! اپنا کام کرو، انہیں تو ایسا ہی غصے ہو چائیں گے“ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ لایا۔ ”بابو جی! بے چاری کامز پھرتا ہے۔ آپ اندر چلے جائیں اور حاضر ہو دیں“

حاضری دیں

میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ عورت بااجبی کے غصے کا سہنے ہی وہاں سے چلی گئی۔ وہ  
بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس کا انداز مجھے نارمل نظر نہیں آ رہا تھا  
سامانترے کا صحیح عکس انہی لوگوں کی آنکھوں میں چمکتا ہے جو نارمل نہیں ہوتے اور  
جنہیں ہم پاگل کہتے ہیں۔ میں نے اس عورت کے متعلق یقین چارمزدوں اور عورتوں  
سے پوچھا۔ میں ایسے ہی کرداروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ یہ میری ریسرچ کی ایک  
جزی ہے۔ جو چاہو پورا کر دیں گی یا ایک کہانی ہے۔ میرا تجسس بڑھنے لگا۔ اس کا  
نام کچھ اور بتایا گیا تھا۔ جسے آستے شاہزادہ کہوں گا۔

شاہدہ کا ایک درمیانی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک سرکاری دفتر میں  
سیکرٹری تھا۔ بڑی کوششوں سے وہ پھر پرنسپل بن گیا۔ شاہدہ کا باپ  
سارے خاندان میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت بھی جانے لگی۔ شاہدہ کا باپ  
ایسا نڈر آدمی تھا۔ وہ ایسے محلے میں کام کرتا تھا۔ جہاں کے چوڑے بھی لکھنوی کہلاتے  
ہیں۔ یہی وہ چارہ مشکل ہی گھر کا خورج چلا سکتا تھا۔

شاہد بہ کی مالی درمیانی طے کی ان کو ترقی جیسی تھی۔ جنہیں پھر جگہ گھومنے اور ترقی کر نمایا کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہو گیا ہے۔ بچپن ہی میں اس نے شاہد کو اس کا خوبصورتی کا احساس دلایا اور اس کی خوبصورتی کو چاہہا دیواری کی کونیا میں اپنا بہہ بڑھانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ خانہ خندان میں اور خانہ خندان کے باہر ہر دو صورتیں تیرے روز کسی نہ کسی تقریب کے بہانے اسے بجا سنا کر اپنے ساتھ لئے چلنے لگی۔ لیکن وہ اپنی خوبصورتی کو بھی بنایاں رکھتی تھی۔ بوابانہ

عبد الباقی بن محمد بن علی بن ابی طالب علیه السلام

تاج الملک

مشترکہ اور جراثیم پر سے پسندیدہ موضوعات ہیں، لہذا تینوں کی تلاش میں مجھے  
ایسی ایسی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں عام آدمی انہیں پہنچ سکتا۔ میں ان  
دنوں ایسے ہی ایک چرخہ کی تیاری کے لیے درگاہوں اور خانقاہوں کی خاک چھانتا چھڑتا رہا  
تھا۔ ایک روز پاکستان کے ایک دور دراز مقام کی خانقاہ پوچھا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہاں  
بے اولاد لوگ اولاد حاصل کرنے جاتے ہیں۔ مشہور تھا کہ یہاں پر حاضر فی دینے، نیانہ  
پڑھانے اور منست وغیرہ مانگنے سے بے اولاد کو اولاد ملی جاتی ہے۔ میں جیسا کہ وہاں  
گیا تو ارد گرد اور دور دراز کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ مزار ایک قبر کے ارد گرد  
چار دیواریں اور دائرہ چھت ڈال کر اور اس پر رنگ برنگ کے جھنڈے اور کپڑوں کی  
بچی ہوئی پجری کے کھینٹے والی ٹولہاں سے نایا لگا تھا۔

یہاں جو کوئی آتا۔۔۔ وہ نیاز بانٹتا۔ سزا سہرا رکھے ہوئے لوہے کے گلے میں پیسے ڈالتا اور سزا روئی کی دیباہوں سے پڑے کی گڑیا باندھ کر اپنی مسرت بوری کرتا۔ ابھی یہی سزا ملے سے پراس جگر کھرا تھا۔ جہاں نگر ویرانہ کا انتظام ہے مجھے وہ بیانی ہو کر کیا عورت دکھائی دی۔ کپڑوں اور شکل و صورت سے وہ کوئی امیر عورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کا نگہ عیب اور غفلت دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ یہ عورت جوانی میں حسین نہ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ میں جھاڑ کپڑا رکھا تھا۔ جبے رکھتے ہی وہ میرے فریب چلائی۔

”مے گی اولاد... بیٹا ملے گا بیٹا!“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔



رشتے کے امیدواروں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر روز نئے سے نیا رشتہ آنے لگا اور شاہدہ کی ماں کے ہاتھ ایک بزنس مگ گیا۔ اس نے جب اپنی بوکی کی اتنی مائگ دیکھی تو اس نے اسے کھانے پینے اور مروجہ اٹارنے کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ رشتے مانگنے والوں کے ہاں پہلے تو دعویٰ وغیرہ کھاتی۔ ان سے تحفے وصول کرتی اور بعد میں کسی بہانے سے انکار کر دیتی۔ اس نے اس کام میں اپنی بیٹی کو بھی خاما غائن کر رکھا تھا۔ شاہدہ بھی اپنی ماں کی طرح رشتہ مانگنے کے لیے ہر آنے والے کے ساتھ گھل مل جاتی اور اس کی ماں اپنا کاروبار شروع کر دیتی۔ دوسری طرف شاہدہ لوگ کی بہنوں وغیرہ کے ذریعے یا کسی اور طریقے سے زانیہ کلائی تعلقات کا ٹھکانہ بنی اور ان لوگوں کو جواب سننے سے پہلے لڑکے سے ودچارا چکے فاحے تحفے اینٹھ لیتی۔

ماں بیٹی اس کا دوبارہیں اتنی ماہر اور ذلیل ہو گئیں کہ ماں اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کسی کے ساتھ شاہدہ کی باقاعدہ منگنی بھی کر دیتی۔ جب وہ دیکھتی کر رشتہ مانگنے والے اس کے اور اس کی بیٹی کے حال میں بری طرح پھنس چکے ہیں تو وہ ان سے کہہ دیتی کہ ہم کچھ دینے کے قابل نہیں۔ دوسری طرف رشتہ مانگنے والے جو اپنے لوگ کے اصرار سے تنگ آچکے ہوتے تھے۔ کہہ کر وہ شاہدہ کے تیر نظر کا شکار ہو چکا ہوتا تھا۔ فوراً اسی بات پر صبر شکنہ کرتے کر لڑکی کی ماں مان توئی۔ لوگ والوں سے منگنی پر ہونے کی انگوٹھی ایک آدھ زیر اور اچھے بھلے کپڑے وصول کر کے وہ ڈیڑھ دو مہینے منگنی بڑا رکھتی۔ اس کے بعد کسی بہانے توڑ دیتی اس میں اسے کسی ایسے لڑکے کی تلاش تھی۔ جسے وہ ایک طرح کا گھرواد بنا کر رکھے اور جو صرف اس کی بیٹی کے بلکہ اس کے بھی بناؤ سنگار کا خرچہ سمجھا لے رکھے اور اس کی ذہنی عیاشی کا سامان پیشہ آتا رہے۔

شاہدہ کا باپ اپنے گھر میں یہ کاروبار ڈرامے دیکھتا رہا۔ آخر کیسے ایک برس بشت اتنا ایک روز اس نے مرد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک انتہائی ایما تار اور تربیت لڑکے کو جو اس کے دفتر ہی میں لوگ تھا اور اس کی بیوی کا دور کار رشتہ دار

پڑتی جا رہی تھی۔ وہ میکس اپ کے ڈار ایسے اپنی اصلی عکس کو دھو کر دیتی رہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کی باجی کھلو کر بہت خوش رہا کرتی تھی۔ دوسری طرف خاندان کے لوگ تھے۔ وہ بھی شاہدہ کے جسمن کی توفیقیں کرتے رہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہدہ اپنی ذات کے تغول میں قید ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو جسمن کی ملکہ سمجھنا شروع کر دیا اور وہ نمائش پسند ہو گئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ قدرتی امر ہے کہ لڑکی اپنی ماں کی شخصیت اور کردار کا عکس ہوتی ہے۔

شاہدہ کا باپ چوتھا ایما تار ملازم تھا۔ اس لیے دفتر کے لوگ اکثر کام اس کے سر قیود دیا کرتے تھے۔ وہ دفتر ہی میں نہیں گھر پر بھی فائلوں ہی میں سفر ماری کرتا رہتا تھا اور اسے اتنی فرصت نہیں ہوتی تھی کہ اپنی بیوی کے لمحوں پر نظر رکھ سکتا۔ جب اسے حضور ڈاہست احسا کہ ہوا کہ اس کی بیوی نے اس کی بیٹی کو نمائش کی چیز بنا کر رکھ لیا ہے۔ تو اس نے آپ دو مرتبہ دبی زبان سے اسے سخت کیا اور اس حرکت کے سنگین نتائج کا احساس بھی دلایا لیکن جواب میں اسے بیوی کی ایسی ڈانٹ پڑی کہ وہ اپنے آپ کو راقم سمجھنے لگا اور خاموش ہو گیا۔

شاہدہ نے لڑکیوں سے جو رانی کی سورت میں قدم رکھا۔ لڑکی ہونے کے زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ اس کے علاوہ ماں کے اثرات اور آنے والے مختلف محفلوں میں بن ٹھن کر آنے جلنے کی وجہ سے اسے ناز و ادا اور پائیں کوسنے کا فن بھی آ گیا تھا، اس چیز نے ہونے پر ہمارے کا کام لیا۔ درمیانے قسم کے گھرانوں کی یہ بڑی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں جو یا تو ان کا گھر صحرے یا پھر خوبصورت ہو۔ جو ان دودلے اپنی خوبصورت دامنوں کو محض نمائش کے لیے ساتھ لیے پھرتے اور خیر کرتے ہیں، دامن خواہ چھوڑی ہو۔

شاہدہ میں پہلی خوبی تو نہیں تھی۔ لیکن دوسری خوبی توقع سے بڑھ کر تھی اس کے



نہیں آتا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ شاہزادہ نے حالات کے آگے بھٹایا ڈال دیے اور وہ وقت بھی آگیا جب شاہی کے ایک سال کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بیٹا عطا کیا۔ اس دوران شاہزادہ کی ماں کی مسلسل کوشش رہی کہ اس کی بیٹی کا گھر لینے نہ پائے۔ اس نے بیٹی کی رخصتی کے بعد اپنے خاوند سے کہا تھا۔ ”وکیجی ہوں کس طرح اس کا گھر بنتا ہے۔“

”خدا کا خوف کرو اور ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔“ شاہزادہ کے والد نے کہا۔  
”خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ کسی شریف گھرانے کی ہو بل کر رہا رہی ہے۔ تم نے اسے بازار کی مال بنا کر رکھ دیا تھا۔“

جس دفعہ میں انور کا کم کرتا تھا، ماں کوئی کام رشتہ کے بغیر نہیں دیتا تھا لیکن انور اس کے کسے کے متعلق ہر شخص قسم کھانے کو تیار تھا کہ یہ لوگ بالکل حرام منہیں کھاتے۔ شاہزادہ کا دامخ اس کی ماں نے خواب دکھانے شروع کر دیے تھے اور اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اس کا جو کسم معوی گھر میں بیٹھنے کے لیے نہیں ہوا۔ وہ کسی راجے مہاراجے کی بیوی بن کر رہائے گی۔ اس نے ماں کی مرضی کے خلاف شادی تو کر لی تھی۔ لیکن آج اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے کسی نے اسے پکڑ کر لوہے کے پنجبے میں بند کر دیا ہو۔ کہاں وہ روز روز کی دعوتیں اور سیریاٹے، کہاں یہ چولہا چھو لکنا۔ شاہزادہ کے ذہن میں یہی بات سناٹے لگی کہ بس وہ بھی اپنی ماں کی طرح ساری زندگی بچے جیتے اور خاوند کی خدمت کرتے، ایڑیاں لوگوں کے گھر گر گزار دے گی۔ اس نے پہلے پہل تو انور کو دوسرے لوگوں کی طرح رشتہ سے لینے اور مرتے کی زندگی گزار دے گی۔ اس نے پہلے پہل تو انور کو دوسرے لوگوں کی ہرمان باتوں کا ذرہ بذر بھی اثر نہیں ہوتا تو بالآخر وہ یہ سب کچھ کھینٹتے سے باز آگئی۔ اب اس پر ہر وقت مخا مخا شاہزادہ کی ایک جھنجھلاہٹ سوار رہتی تھی۔

بھی تھا اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لوگ کے گھر والوں نے کئی ترتیب اس سے شاہزادہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگنا تھا۔ شاہزادہ کا باپ اپنی حیثیت کو بچا چتا تھا اور اسے اپنا ایمان عزیز تھا۔ اس روز جب شام کے وقت ماں بیٹی بن ٹھن کر کہیں رہی تھیں تو باپ نے انہیں روک لیا۔

پہلے تو شاہزادہ اور اس کی ماں حیران رہ گئیں کہ اس کو اتنی ہمت کیسے ہوئی ہو لیکن آج اس کے بیور بالکل ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے شاہزادہ کو بڑی درشتی سے باہر جانے سے روکا اور اس کی ماں کی چیخ بولانی پر وہ کیلے بغیر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ نہ کیا اس کے ساتھ ہی یہ دھکی بھی دے دی کہ اگر اس نے آئندہ کسی کو بھی اس سے پہچانیل کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کو کان سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ شاہزادہ کی ماں کی ایک زچہ۔

شاہزادہ کی ماں نے بڑا شور مچا لیا۔ اپنی بیٹی کے ساتھ گھر سے نکل جانے کی دھمکیاں بھی دیں۔ لیکن اس کے خاوند نے کسی بات کی پروا نہ کی۔ جب شاہزادہ کی منگنی اس نے حیران سے جسے کا نام انور تھا ہو رہی تھی تو اس کی ماں نے روز روز آسمان سر ہٹا ٹھٹھایا۔ اس نے انور کی ماں کی اتنی بے عزتی کی کہ بے چاری جو عورت بے بسی سے رو پڑی۔ لیکن شاہزادہ کے باپ نے انہیں پہلے ہی پکڑ کر رکھا تھا۔ اس نے سخت کے انڈاندر شاہزادہ کا نکاح بھی انور سے پڑھا دیا اور ایک مہینے بعد کی رخصتی کی تاریخ دے دی۔

یہ پورا مہینہ شاہزادہ کی ماں نے گھر میں اودھم پانے رکھا۔ لیکن اس کے خاوند نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا۔ شاہزادہ اور اس کی ماں نے باہر نکلنا سزا میں شادی کی قبول کر لیا اور وہ ایک مہینے بعد دس بن کر انور کے گھر چلی گئی۔ انور کے گھر میں اس کے علاوہ دوسرا واحد فرد اس کی بیوہ ماں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا گزارہ چلتا رہا اور وہ جو بنگلہ شاہزادہ نے اپنی ماں کے سکھانے پڑھا نے پر شادی کے پہلے ہی دن سے شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد انور کے لیے اسے اپنی بیوی بنا کر رکھنا ممکن نظر



اگر کچھ لاکر دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر خدا نے کوئی خوشی کا سامان پیدا کر دیا ہے تو اس میں بھی کبیرے سے نکلنے لگے۔ ہر قسم میں تاج دین کے تعلقات پر اس کا رد ہے۔ وہ تم سے زیادہ نیک اور مخلص ہے۔“

اور اس نے انور کو وہ کہنا نہیں کرے چارہ شریف آدمی کاں کیڑ کر لیا۔

اس وقت آہستہ آہستہ وقت بھی گزرا۔ جب تاج دین نے موقع ملتا ہی شاہد کو دعوہ معنی کے فقرے بھی کہنے شروع کر دیے۔ پھر وہ کبھی کبھی انور کی غیر موجودگی میں گھر آنے لگا۔ شاہد کی ساس نے ایک دفعہ جب ہو کر اس بات سے منع کیا کہ وہ اسے انور کی غیر موجودگی میں غیر مردوں سے نہ ملا کرے تو اسے شاہد نے اسی نے نقل لیا کہ میں انور کو دیکھنے کے لیے پورے عورت کے کالوں کو ماتھ لگا لیے۔ تاج دین چلے گئے۔ اسے ”بھائی، بھائی“ کہا کرتا تھا۔ پھر اس نے انور کی غیر موجودگی میں اسے شاہد کہنا شروع کر دیا۔

تاج دین آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں زہر گھولنے لگا۔ اس نے شاہد کو اس دلا نا شروع کر دیا اور اس کے قابل نہیں اسے تو کسی محل میں رہنا چاہیے، بادشاہ کی ملکہ بن کر۔ شاہد کے ذہن نے پہلی مرتبہ اپنے مطلب کی باتیں لیں۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھ گئی۔ دونوں میں ایک ذہنی رشتہ پیدا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ لالہ لالہ نے دالوں نے مجھے ایک عجیب بات بتائی کہ ان کے تعلقات جیسا کہ ہیں۔ وہ غالباً یہ بھی کہتا ہے کہ تاج دین کے دل میں بحث تھی۔ مگر شاہد کو تاج دین سے روپ میں وہ آدمی مل گیا تھا جو اسے شہزادی بنا کر رکھے گا۔ مال نے اسے یہ خواب لائے تھے۔ جو انور نے تباہ کر دیے تھے۔ تاج دین نے اسے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے ایک کوٹھی بنو کر اس کے نام گھوٹنے کو تیار ہے۔ وہ شاہد کی خاطر اپنی بیوی کو طلاق دیتے پر راضی ہو گیا۔ دونوں کی دوستی رنگ لائی اور ایک مددگار شاہد ایک بچے کی مال بن چکی تھی۔ اس نے تاج دین سے کہہ دیا کہ انور کو یہی حکم دیا کہ وہ آدمی بننے کے لیے تیار ہے۔ لیکن تھی بہر حال چالاک مال کی بیٹی سیلے اس

ٹھیکیدار تاج دین نے انور کو اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے انور کو رشور دینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو اس نے بہرہ راستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں انور کی لہجہ انداز کی بہت محنت کرتا تھا اور دونوں کے درمیان ایک طرح کے دوست ناز و نرمی قائم تھے۔ تاج دین کا آنا جانا انور کے گھر میں شادی سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ شادی کے بعد تو اس کی آمد رفت اور بھی بڑھ گئی اور اس کی وجہ شاہد۔

تاج دین بھی آخر کو رشور پرست کا انسان تھا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح شاہد کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جب بھی ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ انور کے ہاں جاتا خالی ہاتھ نہ جاتا۔ پھل اور میٹھاٹا وغیرہ ضرور ساتھ لے جاتا۔ پہلے پہل تو انور نے اس بات کا برا منایا لیکن تاج دین کی ضد کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنا پڑا۔ تاج دین کہتا تھا کہ میں تمہارے پاس ٹھیکیدار بن کر نہیں ایک بھائی اور دوست بن کر آتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی سگ بھائی ہوتا تو کیا تم اس کی لائی ہوئی شے قبول نہ کرتے؟

یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں سے اس نے انور کو مطمئن رکھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ انور اور اس کی مال سے جسے اس نے اپنی مال بنا رکھا تھا، لیتے کرتا تھا پھر آہستہ آہستہ فوجت ہو گئی کہ وہ صرف اور صرف شاہد کے لیے دالوں نے لگا اس نے چوٹی چوٹی باتوں اور تحفے تحائف کے ذریعے شاہد کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ انور اور شاہد کو اسے اپنے ساتھ لاکر رہنے پر مجبور کرانے لے جاتا اور انور کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہیں شاہد تک بھی لگا رہا دیتا۔ انور کو نہ کرنے کا موقع بھی کم نصیب ہوتا۔ اس کی بیوی فریادیں کرنا کہہ کر تحفہ وصول کر لیتی۔ ایک روز انور نے شاہد سے دینی زبان میں کہا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تاج دین تمہیں شہنشاہ بنا کر رکھائے۔

اس کے منہ سے یہ بات نکلنے کی دیر ہی نہ کہ شاہد نے ہر گز کھڑا کر دیا۔ ”تمہیں خود



اس کی حمایتی مال اس کی منتظاتی۔ شاہدہ نے تاج دین کا تعارف اپنی مال سے کر دیا  
تا اور مضبوطی میں نے مل کر طے کیا تھا۔ مال نے بیٹی سے کہا کہ وہ بالکل بگڑ گئے  
اور اپنی بات پر پکی رہے۔

شام کو جیب شاہدہ کا والد کا حکم سے والپسٹا یا تو اس کی مال نے اپنی طرف سے ٹوٹے  
ہماتے ہوئے انور کے ظلم پر حکم کی جھلی کاٹنے سے سنا دی اور بتایا کہ انور نے اس کی  
بیٹی کو طلاق دے کر گھر سے دھکے دے کر نکال دیا ہے۔ اس کے باپ کو کچھ سمجھ نہیں آئی  
تھی کہ کیا کرے۔ مال کے جیب ہوتے ہی شاہدہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور باپ  
پر یہ ظاہر کیا۔ جیسے وہ وہاں سے ہٹ کر جان بچا کر چلا گیا۔ بالآخر  
اس نے خود اصدیت جاننے کے لیے انور کے پاس جانا ضروری سمجھا۔ وہاں جا کر جیب اسے  
سچ حالات کا علم ہوا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر انور سے درخواست  
کی کہ وہ اس کی بیٹی کو مصافحہ کر دے۔

”چاچا جان!“ انور نے کہا: ”بے شک یہ کچھ میرا ہے اور اس نے محض مجھے  
ملیش دلانے کے لیے کہا ہے کہ یہ تاج دین کی والدہ ہے۔ لیکن ایسی گھٹیا ذہنیت کی  
عورت کو میں اپنی بیوی نہیں مان سکتا۔“

اس کے بعد اس کی مال نے شاہدہ کے باپ کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ انور نے  
اسے کہا کہ اب بھی اگر وہ اپنی بیٹی کو جیسا مندریں تو میں اسے مصافحہ کرنے کے لیے  
تیار ہوں۔ میں کل اس کا انتظار کروں گا۔ اگر وہ کل نہ آئی تو پھر اسے طلاق بھیج دوں  
گا۔ باپ پر اُمید ہو کر گھر پہنچا تو اس کی بیوی اور بیٹی غائب تھیں۔ دونوں مال کی گھٹیا ذہنیت  
تاج دین اپنی کار میں بھاگ کر سیر کر دانے لے گیا تھا اور کچھ ہی بجے جھوٹے باپ کی  
راہ دیکھ رہے تھے اس نے کچھ تک جس روگ کو انور پر اندر پالا تھا۔ اب وہ چھٹ  
گیا۔ اس حادثے نے تو اس پر بھی گہرا اثر کیا اور شاہدہ کے باپ پر پہلی مرتبہ دل کا  
”دھچکا“ محسوس ہوا۔ اسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔

ڈاکٹر نے شاہدہ کی مال سے کہہ دیا تھا کہ اگر ایک دوا دے اسے شدید نوعیت  
کے دورے اسے پچھلے دورے جیسے ہو جائیں گے۔ لیکن مال کی آنکھوں پر تو ہوس کی ٹپ بن گئی

لے تاج دین سے اپنے مستقبل کی ضمانت طلب کی۔

تاج دین نے فوراً اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ایک روز اپنی کٹھنی سے  
کاغذات بھی اس کے حوالے کر دیے۔ اب شاہدہ کو اس کی بات پر مکمل یقین آیا  
اس روز جیب شاہدہ نے انور سے طلاق دینے کے لیے کہا تو وہ جھوٹا  
کہہ گیا۔

”شاہدہ! بالکل نہ بنو۔“ انور نے اسے کہا: ”میں جانتا ہوں تم اپنی مال  
تاج دین کے ورغلا نے میں لگتی ہوں۔ سوچ کچھ فریاد کرو۔“

”میں نے سب سوچ کچھ لیا ہے“ شاہدہ نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا  
”میں ہمیشہ کے لیے اس ہونٹ کا بندھن بننے کو تیار نہیں۔“

انور نے پھر بھی اس کی بات پر کان نہ دھرے تو شاہدہ نے سرور کی کمزوری  
اس کی غیرت پر حملہ کیا اور بولی: ”انور! یہ کچھ تمہارا نہیں۔ یہ تاج دین  
کا بچہ ہے۔“

انور نے طنز پر قہقہہ لگایا۔ اسے یقین تھا کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس  
شاہدہ سے کہا: ”جو عورت اتنی  
کرلانے کا حق ہی نہیں رکھتی۔ اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ لیکن یاد رکھو

اس بچے کو بالکل بھول جانا اور کبھی اس کا نام بھی بھولے سے زبان پر نہ لانا۔“  
تمہیں پرسوں تک باقاعدہ طلاق مل جائے گی۔۔۔ میں جانتا ہوں تم طلاق لینے

لیے یہ جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے سو فریادیں کہیں کہ یہ کچھ میرا ہے۔ کچھ ایک سال  
ہو گیا ہے کسی کو دکھاؤ۔ یہ کچھ میرا ہے۔“

اندھے کو کیا پتا ہے دوا کبھی۔ اس وقت شاہدہ کے دل دماغ میں ٹھیک  
تاج دین کے دکھائے ہوئے خوابوں کے سوا اور کوئی شے سما ہی نہیں رہی تھی۔

”بیسے کہہ کر بھول جاتی تھی۔ اس نے اگلی بات کرنے سے پہلے اپنے کپڑے ایک  
میں رکھے اور جانے کو تیار ہو گئی۔ انور کی بوڑھی مال نے اس کی فیتیں کہیں ہاتھ

بین شاہدہ کا دل نہ بیٹھا۔ وہ دوتے جیسے کچھ چور کر چلی گئی اور سیدھی گھر  
آئی۔



ایمان فرق واد نہ رکھا۔ اس نے غلو جس اور خدمت سے انور کے تمام بھلا دیے اور اس وقت پر نگاہ کر ڈالتا رہا اور اٹھ دس سال گزرتے تیر ہی بچلا۔ اس دوران شاہدہ

اس کے خلاف نہ زندگی کی ہر سائنس ہم پہنچائی لیکن کبھی بھی ایک بے نام سی دانش شاہدہ کو بے چین کر دیتی۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگتا۔ جیسے اُس کے جسم سے ران لکڑا لگا ہو چکا تھا۔ پھر اسے یہ کمی شدت سے ڈسنے لگی۔ وہ ابھی تک اس جذبے کو اپنی نام دینے سے قاصر تھی۔ کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے تاج دین اُسے اچھا تو لگتا ہے لیکن پہلی سی بات نہیں۔ پھر کیا ہے؟ شاہدہ نہ جان سکی۔

تاج دین حیران تھا کہ شاہدہ نے ماحول اور زندگی کی دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کر دی تھی۔ وہ کچھ گھڑی اکھڑی سی نظر آنے لگی۔ اس کے رویے میں یہ تبدیلی ظاہر آہستہ آہستہ لیکن بڑی شدت سے وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ اب یوں ہونے لگا کہ تاج دین اسے فلم دیکھنے کے لیے لے جانا چاہتا۔ لیکن عین وقت پر وہ کوئی بہانہ کر کے انکار کر دیتی۔ کبھی اُس کے سر میں درد ہونے لگتا اور کبھی اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔

ایک روز وجہ تاج دین بڑی جاہلست سے اُس کے لیے ایک بڑی خوبصورت ساری لے کر آیا وہ اسے کہا کہ وہ ساڑھی پہن کر اس کے ساتھ ایک شادی میں شرکت نے چلے تو شاہدہ نے وہ ساڑھی ڈبے سمیت پرے چھینک دی اور خود بے کم ہی ہو کر موصوفے پر گر پڑی۔

گھر پر تیریت تو ہے شاہدہ! کیا بات ہے؟ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ ”ٹھیکیدار تاج دین نے اُس کے نزدیک بیٹھ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

جواب میں شاہدہ سکپاں لے کر دے لگی۔ تاج دین حیرت سے اُس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شاہدہ کو کیسے قسمی دے۔ اُس کے دل کی بات کیلئے سمجھے۔ اُس نے شاہدہ سے کہا کہ وہ کوئی فرمائش کرے وہ دنیا کے کسی بھی ملک سے جبر منگو کر حاضر کرے گا۔

تھی۔ اُس نے اپنی بیٹی کو حوصلہ دے رکھا۔ بلکہ اُس کی زبانی یہ بھی کہلوا دیا کہ اُس مشورہ پر تو مردانہ صفات سے بالکل محروم ہے۔ وجہ یہ بات انور تک پہنچی تو اُس نے فوراً غلطی لکھ کر بیچ دی۔

ایام عدت تو ایک شرعی پابندی تھی۔ جس روز ہی پوری ہوئی شاہدہ نے تاج دین سے نکاح پڑھا لیا۔ باپ نے محض بچوں کی خاطر اس گھروں رہنا قبول کیا۔ اُس نے گلا سے کہہ دیا اگر میں مر جاؤں تو میری بیوی اور بیٹی کو میرے جنازے کو بھی ہاتھ نہ لگانے دینا۔

تاج دین نے جو کہا پورا کر دکھایا۔ اُس نے نہ صرف ایک کوٹھی شاہدہ کے نام کر دی بلکہ وہ ہفتی مہون منانے کے لیے اُسے مری اور سوات بھی لے گیا۔ اس نے شاہدہ کو رات ہی ایک ٹھکانہ بنا کر رکھا تھا۔ لیکن اُس نے مہراں کی پہلی رات ہی شاہدہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اُس سے بچہ پیدا نہیں ہونے دے گا۔

”مجھے تمہارے سراپے سے عشق ہے شاہدہ!“ اُس نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ بچہ پیدا کرنے سے تمہارا جسم بے ڈھنگا ہو جائے۔ میں تمہیں اپنے متعلق بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جس طرح تمہیں روپے پیسے اور عیش و عشرت سے پیار ہے۔ اسی طرح مجھے اپنے رونماؤں سے عشق ہے۔ میں رد مان پسند انسان ہوں۔ تم میرے خواب کی تعبیر ہو۔ میں تمہیں بڑی لمبی عرصہ تک جوان رکھوں گا۔ بچہ پیدا نہیں ہونے دو لی گا، ورنہ تمہارا حسن اور میرا امن برکھ جائے گا۔“

شاہدہ تو خود بھی مستقبل کے ایسے ہی نئے نئے خوابوں میں کھوئی رہتی تھی۔ اُس کے لاشعور میں وہی شاہدہ گھوم رہی تھی۔ جس کا داغ اس کی ماں نے اُس کے منہ کی تصویریں کر کے آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ اُس نے تاج دین کے خیال سے مکمل اتفاق کیا کہ پہلے روز سے ہی خدا کی مسعود بندہ کی کے پابند ہو گئے۔

انور نے اپنی ماں کے بے حد مجبور کرنے پر اپنے بچے کی پرورش کی خاطر دوسری شادی کر لی۔ خدا نے اس مرتبہ آسے خوش شکل ہی نہیں نیک سیرت بیوی بھی عطا کی تھی اُس نے ننھے وحید کی پرورش اپنی سنگی املاک کی طرح کی اور کبھی اپنی اولاد اور اُس کے



”میری فرمائش پوری کر دے گا“ شاہدہ نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”تم جو ساڑھی لائے ہو وہ مجھے دل و جان سے پسند ہے۔ لیکن اب جی چاہا ہے کہ میرے کپڑوں کی بجائے تم چھوٹے چھوٹے فرائ، ننھے ننھے لپٹ کھونے لایا کرو۔“

”وہ کس لیے؟“ تاج دین نے پوچھا۔

”اپنے بچے کے لیے۔“ شاہدہ نے کہا۔ ”میں یہی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ میں اب بھی ہوں اپنے بچے کی غیر عورت نامکمل ہے۔ یہ عورت کے جسم کی اور اس کی فطرت کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر عورت زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے بچے سے ملادو۔ وہ اب گیارہ سال کا ہو گیا ہے۔“

شاہدہ کی اس بات نے ٹھیکیدار کو چکر کر رکھ دیا۔ اس نے شاہدہ سے کہا کہ یہ بالکل نامکن ہے کیونکہ نہ اس کا بیٹا اسے مان تسلیم کرے گا نہ ہی انور اسے ملنے کی اجازت دے گا۔

تاج دین نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن وہ شاہدہ کو منہ پر کر رکھا۔ اس کا اسب معمول ہو گیا کہ وہ اپنے بیٹے وحید کو چوری چھپے سکول سے آتے جاتے دیکھنے لگی۔ وہ ایک ہی اس کی چھٹی کے وقت سکول کے نزدیک پہنچ جاتی اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر بے بسی سے واپس لوٹ آتی۔ اس نے اپنے خاندان کی تقریبات میں اسے دیکھ رکھا تھا۔ لیکن انور نے اس بات کی خاموشی اختیار کر رکھی تھی کہ بھی اس کا اور وحید کا برابر راست سامنا نہ ہو سکے۔ اس نے جلد ہی پتہ چلا کیا کہ اس کا بیٹا کہاں پڑھتا ہے اور اس کے آنے جانے کے اوقات کیا ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ آتی اور روتی شاہدہ کا دل چاہتا کہ دوڑ کر اسے اپنی باتوں میں سمیٹ لے۔ لیکن وہ دل نہیں کر رہ جاتی۔ کیونکہ کوئی قانون یا اخلاقی ضابطہ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس نے خود اپنے بیٹے کو دھتکارا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے خاندان سے تقاضا شروع کر دیا کہ اب وہ اولاد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تاج دین کو اس کی حرکات کا علم تھا۔ لیکن وہ اسے وحید کو دیکھنے سے روک نہیں سکتا تھا۔

اس نے ماہرین نفسیات سے شاہدہ کا معائنہ کروایا تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ اپنی بیوی کا ہانا چاہتا ہے تو اس کے بلطن سے جو پیدا کرے۔

تاج دین نے شاہدہ کو ان مصنوعی طریقوں سے آنا کر دیا جو وہ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ تین سال تک اس کی مراد پر نہ آئی۔ ان کی تشویش بڑھی تو انہوں نے ماہر ڈاکٹروں کا رخ کیا۔ جنہوں نے شاہدہ کے سامنے کے بعد تاج دین کو بتایا کہ دس بارہ سال تک مصنوعی طریقوں اور برتنوں کی گولیوں کے مسلسل استعمال نے اس کی بیوی کا تولیدی نظام درہم برہم کر دیا ہے اور ان گولیوں کا ذہن پر بھی اثر ہے۔ اتنی لمبی خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی ڈاکٹر بھی مشورہ نہیں دیتا۔

ٹھیکیدار تاج دین کی ہدایت پر ڈاکٹروں نے اس بات کا علم شاہدہ کو نہ ہونے دیا۔ وہ امیر آرمی تھا۔ اس نے شاہدہ کو بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ لیکن مقصد ان کا کیا ہی حاصل نہ ہوئی۔ ایک ایک کے مکے کے قریباً سب ہی ڈاکٹروں نے مددوری ظاہر کر دی۔

شاہدہ اپنے بیٹے کو جھپٹ چھپ کر رکھتی رہی اور وہ جوان ہو گیا۔ اب شاہدہ کے سارے بے نکل بچے تھے۔ وہ ان سرگے تھے اور اسے اب احساسِ بافتلا سے اس حال تک مال نے پہنچا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ماں کو دھتکتی سمجھنے لگا اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔

ایک روز شاہدہ کو اطلاع ملی کہ اس کے بیٹے کی نسبت کسی جگہ طے ہو گئی ہے۔ اس خبر نے اسے تڑپا کر رکھ دیا کہ اتنے اہم موقع پر بھی وہ اپنے بیٹے سے دور ہے۔ اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر اپنے بیٹے کو خٹے کا فیملہ کر لیا اور ایک جگہ اسے جالی۔

”وحید؟“ اس نے بے قراری سے بائیں پھیلا دی۔ ”تم میرے بیٹے ہو ہیں تمہاری ماں ہوں۔ میرے بیٹے سے لگ جاؤ۔ میں نے تمہیں کھوکھو کر رکھا ہے۔“



## چرسی

گزشتہ ماہ ایک صاحب ہمارے دفتر میں آئے میرے انداز سے کے مطابق ان کی عمر ۶۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ایک سچی کہانی سننا چاہتا ہوں۔ یہ میری اپنی کہانی ہے۔ جسے آپ اپنے معاشرے کو کہانی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یوں خود پڑھا لکھا ہوں۔ یہ کہانی کئی بار لکھی اور پھاڑ کر پھینکی ہے۔ کیونکہ کہانی لکھنا ایک فن ہے۔ جو آپ ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔

”میں ایک مزدوری بات آپ کو چیلے ہی بتا دیتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”یہ کہانی سناتے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوڑھے اپنی نوجوان نسل کو گمراہ

براخلاقی اور خیانت کی بات کہتے ہیں۔ لیکن جو تجربہ فحش ہوا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر ری اکھتری ہونی نوجوان نسل میں بڑے اچھے اوصاف اور کردار کی ہندی موجود ہے۔ یہی اگر غلام سفر ہوتا تو فلسفے اور نفسیات کی زبان میں بات کرتا لیکن میں متوسط طبقے کا عام سا انسان ہوں۔ مجھ ایسے لوگ کہانیوں اور مشالوں سے اپنا مقصد بیان کیا کرتے ہیں“

انہوں نے کچھ اور تہمیدی باتیں بھی کہیں جن سے متاثر ہو کر کہیں نے انہیں کہا کہ وہ کہانی سنائیں۔ میری جو صدر افزائی سے انہوں نے جو کہانی سنائی۔ وہ میں انہی کی زبان میں پیش کرتا ہوں۔

میں ایسے ہی ایک محلے کا رہنے والا ہوں۔ جسے آپ چار دیواری کی دُنیا

پائے ہیں بیٹا؟“ وہ بخانے گیا کیا کہتی رہی۔ لیکن وحید اپنی جگہ پتھر کا ثبت بن کھڑا۔

”میں تمہیں بہت دیر سے جانتا ہوں۔“ نوجوان وحید نے حقارت سے کہا۔ ”لیکن کسی کو پہچان کر دینے ہی سے کوئی عورت اس کی مال نہیں بن جاتی۔ میری ماں وہ ہے۔ جس نے مجھے پالا پر سنا اور کبھی تمہاری کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔۔۔۔۔۔ جاؤ پھلی جاؤ۔ تمہیں دولت اور عیش و عشرت کی ضرورت تھی وہ تمہیں مل گیا۔ اُنہ مجھے کبھی ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں تو اُس وقت بھی تمہارا ہی بیٹا تھا۔ جب تم مجھے پھینک کر چلی گئی تھیں اور تم نے مجھے حرامی قرار دیا تھا۔ مجھے میرے ابا نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

شاہدہ کی باتیں پھلنی کی پھلنی رہ گئیں اور وحید اُسے ٹھکرا کر چلا گیا۔ اس حادثے نے تو اُسے مخموٹا کر اس کو دیا۔ وہ برعین بن کر رہ گئی۔ ٹھیک سیرا تاج دین نے اس کے علاج اور تیاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب وہ ڈاکٹر دن سے پانچ سو گینا تو اس نے سیروں، فیتروں اور خافقہ ہوں کا رخ کیا کیونکہ ڈاکٹر دن نے اُسے بتایا کہ شاہدہ کے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس سے کوئی بچہ پیدا کیا جائے۔

جس مزار پر وہ بچے ملی تھی۔ وہاں بھی اُس کا خافقہ اُسے ملے کر آیا تھا۔ لیکن اچانک اس کا داغ پھر گیا۔ اُس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اب وہ یہاں بولا کی پھرتی تھی اور سر اُسے جانے والے نے مجھے آخر میں کہا۔ در باوچی! اس کے خافقہ نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ وہ یہاں بھی مسلسل آتا رہا۔ لیکن پچھلے دو سال سے وہ نہیں آیا۔ یہ بگلی یہیں جھاڑو دیتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ آخر کوئی پاگل عورت کا خافقہ کب تک بن کر رہ سکتا ہے؟



اُس لڑکے کے لیے بیسے بالوں کو سُٹی میں سے کر زور سے جھینچوٹا اور اُسے کہا کہ اُنہو وہ میان رکھ لیا گیا میں بلا مقصد کھڑا نظر آیا تو میں اُس کی داغیں تیر توڑ دوں گا۔ لڑکا میرے ساتھ پیریزی پر اُتر آیا۔ میں نے اُسے پتھر رسید کر دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ جس طرح ہارسے فوجیوں کا شغل تاک جھانک کر نا اور بیوہ فحشی گانوں سے دل بہلاتا ہے۔ اسی طرح ہاری چار دیواری کی دنیا کے بچوں کا شغل یہ ہے کہ وہ آدمی یا دو خاندانوں میں ٹھن جانے تو وہ صلح صفائی کروانے کے بجائے جلتی پر لگ ڈالتے اور تما مشر دیکھتے ہیں۔ بچائے اس کے کہ محلے کے آدمی میرا سا تھ دیتے۔ یا مجھ سے ایک لڑکے کو پھیر داکر صلح صفائی کروا دیتے کسی نے اُنہو کے گھر والوں کو اطلاع کر دی کہ فقیر صہیں تمارے لڑکے کا رپیٹ ہا ہے

میں نے لڑکے کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہاں سے جا رہا تھا کہ اُس کا باپ اور دو بھائی ملکر اسے پُرسے اُسے اور یہ پوچھے بغیر کہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ بہشتی سے میرے دودھ مارے کے اندر لوہے کے پائپ کا ایک ٹکڑا لٹا ہوا تھا۔ تین آدمیوں سے مجھے لایا یہ ایک طریقہ تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہو اور ڈر کر پیچھے ہٹ جائیں۔ میں نے پائپ کا ٹکڑا پکڑ لیا۔ اُنہو کا بلجا بھائی سب سے اُگے تھا۔ اُس نے اینٹ اٹھالی۔ میں نے اسے ڈرانے کے لیے پائپ اس طرح گھمایا کہ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جانے۔ لیکن وہ بیزاری سے مجھ پر جھپٹ ہاتھ لگا۔ اس لیے لڑاکہ نہ سکا۔ میرا گھما ہوا پائپ اُس کے سر میں لگا۔ یہ بڑی سخت ضرب تھی۔ وہ پھرا کر گر ا اور اُس کے سر سے خون بہنے لگا۔

لڑائی اس پر ختم ہو گئی اور وہ لوگ تھانے جا پیچھے۔ مجھے محلے داروں نے کہا کہ میں بھی تھانے جاؤں اور پورٹ کر دوں کہ اُن کے لڑکے نے میرے دروازے پر ہاتھ بھر پیر حملہ کیا ہے۔ میں ان ٹانٹا میوں کا مشورہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ میری بوری اور بیٹی مجھے اندر لے گئیں۔ میں کچھ خوش بھی تھا کہ میں نے ہر کاردار کوئی کوئلہ دی ہے اور اب یہ لڑکا کا کم از کم میرے گھر کے سامنے اس

کھتے ہیں۔ آپ نے خود دیکھا ہو گا کہ محلے کے لڑکے گلیوں کے چوڑیوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں یا تھڑوں پر بیٹھ جاتے ہیں یا پان سنگریٹ والے کی دکان کے اُگے رکے ہوئے بچوں پر ڈھیر ہوجاتے ہیں۔ یہ اُن کا شغل ہے کہ وہ قریب سے گزرنے والی خواتین کو گھنور گھنور کریر نما نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسی دو کہلی خاتون کے ساتھ چھپر خلتی بھی گزرتے ہیں۔ یہ فلموں اور فلمی گیتوں کا اثر ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں کوئی قومی نصب العین نہیں دیا گیا۔ ہم بڑوں نے اپنے معاشرے کی افکار کو ختم کر ڈالا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جو آپ خود بہتر سمجھتے ہیں۔

مجھ میں ایک خرابی ہے۔ جسے میں خودی سمجھتا ہوں۔ میں اخلاق اور کردار کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہوں۔ جب کوئی لڑکا فلمی گانے گا تا ہوا گلی میں سے گزرتا ہے تو میرا خون کھونٹے لگتا ہے۔ یہی ارادہ کرتا ہوں کہ قاتل کر دوں۔ لیکن میری اس قسم کے لڑکوں کے ساتھ گراگرمی بھی جونی ہے۔

نوجوان تو بھی ایک چلے ہیں۔ میرے محلے کے یہ لڑکے تقریباً سو زانہ اکیا چھپر اکٹھے ہو جاتے اندر کچھ دیر بعد دھڑ دھڑ بوجاتے تھے لیکن ایک نوجوان جس کا نام انجیر ہے، ہر وقت ایک مقام پر کھڑا رہتا یا بلا مقصد رک کر ادھر ادھر جھانکے لگتا۔

میں نے پہلے پہل اسے کچھ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زیادہ دیر تک میرے گھر کے بالکل سامنے رکنے لگا۔ میری ایک بیٹی جوان ہے۔ اُن دنوں وہ دوسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ ایک روز بیٹی نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکا دو تین تیرے کمرے داسی پر اُس کا چھپا کر دیکھا ہے۔

اگلے روز جب یہ لڑکا میرے گھر کے سامنے اکڑ کر کواڑ سے معلوم نہ تھا کہ میں اُس کے انتقام میں بیٹھا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ مجھ میں غیرت ضرورت سے کچھ زیادہ ہے اور یہاں تو معاملہ بھی میری اپنی بیٹی کا تھا۔ میں نے



تم لوگوں کے ساتھ میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم ایک نہیں دس پر چے لکھو۔ میں  
 علالت میں اپنا بیان دوں گا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ جن کے بیانات مزوری تھے۔  
 وہ قتلے میں لیے جا رہے تھے۔ یہ سب کے سب میرے خلاف تھے۔ تین چار  
 روز بعد مجھے جیل کی حوالالت میں بھیج دیا گیا۔ میری بدقسمتی اور مجبوری یہ تھی کہ  
 میں ٹیٹھاکوٹ کا وجہ جرموں۔ میرا کل خاندان میری بیوی اور تین بچیاں ہیں جن میں  
 ایک جوان ہے۔ میرے تمام عزیز اور قریبی رشتہ دار ۱۹۴۷ء میں شہید کر  
 دیے گئے تھے۔ میں جیل میں بند ہو گیا تو میرے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنے  
 اور دانا نہیں وہ وقت مدنی کھلانے والا بھی کوئی نہ رہا۔ میرا چالان زیر دفعہ ۴۰  
 ہوا تھا۔ اس لیے میری ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ میری بیوی نے اپنے زیورات بیچ کر  
 اور مئے کے ایک ہزر گ کو ساٹھ لے کر وہیں کر لیا تھا۔

علالت میں تمام گراہیاں میرے خلاف گزریں۔ محلی کے ڈو آدمی میرے  
 خلاف گواہی دینے آئے۔ جنہیں میں شریعت اور مخلص سمجھتا تھا۔ میری صفائی بڑی کمزور  
 تھی۔ لیکن میرے وہیل نے اتنی ضد مند دی سے مخالفت گواہوں پر جرح کی کہ یہ ثابت  
 ہو گیا کہ مصدوب چارٹی حملہ آور تھی۔ اس کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جو دفعہ میرے گواہ تھے  
 اس کی مجھے انتہائی سوزنا دی گئی تھی۔ عدالت نے مجھے تین سال سزا دے قید با ضمانت  
 دے دی اور رعایت یہ تھی کہ میں جتنا عرصہ جیل میں رہا ہوں۔ وہ سزائیں شمال کیا  
 جائے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری سزائیں کے بجائے دو سال رہ گئی۔

میری بیوی نے سلائی مشین بنانے اور لوگوں کے کپڑے سینے شروع کر دیے۔  
 میری بڑی بیٹی نے جو مقدمے کے دوران میٹک پاس کر چکی تھی۔ پانچ سات بچوں  
 کی ٹیوشن رکھ لی۔ اس طرح ماں باپ نے ہانڈی روٹی کا مسئلہ حل کر لیا۔ دوسرے  
 محلی کے ایکے میرے دوست نے یہ کرسم کیا کہ دن میں ایک آدھ تیر میرے گھر آ کر  
 میرے بیوی بچوں کو دیکھ جاتا۔

بیوی اور میری بچیاں جیل میں جھڑپے ملنے آئیں۔ میں سی کلاس میں تھا۔ اس

طرح یہودی کی کا مظاہرہ کرتے نہیں گزرے گا۔ لیکن میری خوشی ایک گھنٹے سے زیادہ  
 قائم نہ رہ سکی۔ پولیس کے ایک کانسیبل نے اگر مجھے میرے زور مشورہ دیا کہ میں ٹھکاندار  
 کو کچھ دے دلا کر مصدوب پارٹی سے سمجھوتہ کر لوں۔ کانسیبل نے یہ بھی کہا کہ کچھ میرا  
 چائے پانی بھی کر دیں تو میں جو ہمدردی صاحب کر دنا لوں گا۔ چوہدری صاحب ہمارے  
 علاقے کے تھا نیدار تھے۔ میں نے کانسیبل کو ڈانٹ دیا کہ میں نے کوئی گناہ  
 نہیں کیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہے اور اس کی وجہ  
 کیا تھی۔

کانسیبل سنس پڑا۔ کہنے لگا۔ ”بھولے بادشاہو! بات وہ سچی ہوتی ہے۔  
 جو سب سے پہلے قتلے میں پہنچتی ہے اور وہ بات تو بہت ہی سچی ہوتی ہے۔  
 جس کے ساتھ سرخ رنگ کے چار پانچ نوٹ تھی ہوتے ہیں، کانسیبل نے  
 کہا۔ یہ آپ نے اگر اسی طرح چوہدری صاحب کے ساتھ بھی اکڑ کر بات کی تو مجھ  
 لیں کہ وہ کوئی معمولی سی دفعہ نہیں لگائیں گے۔ وہ ۳۰۰ روپے پر چر کریں گے اگر  
 آپ کو معلوم نہیں کہ ۳۰۰ روپے ہوتی ہے تو مجھ سے سن لیں، کوئی کہتے ہیں کہ ارادہ  
 قتل یعنی آپ نے ایک آدمی کو اپنی طرف سے قتل کر دیا تھا۔ لیکن قتلے اُسے چالیا۔  
 یہ دفعہ ناقابل ضمانت ہے۔“

میں پھر بھی ڈٹا رہا۔ مجھے پورا بھروسہ تھا کہ قانون میری بات بھی سنے گا۔  
 لیکن جہاں میری کسی نہ مٹنی مجھے گرفتار کر کے حوالالت میں بند کر دیا۔ شام  
 کو تھا نیدار نے مجھے بہت ڈرایا۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ مصدوب کی کھوپڑی  
 ٹوٹ گئی ہے۔ تھا نیدار حوالالت کے دروازے سے مٹا تو قتلے کا مختار آ گیا  
 اُس نے میرے کان میں کہا کہ کیوں اپنے بچوں کی زندگی تباہ کرتے ہو۔ کو تو قریب  
 چوہدری صاحب سے بات کر لوں۔ ابھی پرچہ نہیں ہوا۔ دو چار سو کی بات کیا ہے  
 آپ کی یہ رات حوالالت میں نہیں گزرے گی۔

میں دین دایاں کر اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا میں نے حر سے کہا کہ



کر سے اور اصل بات کا پتہ لگانے۔ مجھے اپنی بیوی اور بڑی بیٹی کے کردار پر بھروسہ تھا۔ لیکن مجبوریاں انسان کو گمراہ کر دی دیا کرتی ہیں۔

سوچتے سوچتے مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے کہیں — پڑھا تھا کہ لعین باپ اپنے بچوں پر قیدیوں کی طرح سلطانی کا سلوک کر کے گھر کو جیل خانہ بنا دیتے ہیں۔ ایسے بچے جو ان کو مروت سے ملنے ہی غلط آنا دی کی طرف پل پڑتے ہیں۔ میں خود ریاضت سخت گیر تھا۔ میں نے اپنی بیٹی کو ذریعہ عفت میں تربیت دیا تھا۔ میں نے گھر والوں کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ عورت کی آواز و درازے سے باہر نہ جانے پائے۔ میں نے تو گھر کی چھت پر بھی پردے کا سخت انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن میں نے اپنی بیوی بچوں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ نہس کی تھی۔ انہیں جلتی بھی شفقت نہ دے سکتا تھا۔ وہ دی تھی۔ پھر بھی مجھے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ ایسا تو نہیں میری بیوی اور جو ان بیٹی میری پابندیوں سے تنگ آکر میری غیر حاضری میں ان کا لالچہ چھو رہی ہوں۔ مجھے غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ دشمن کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت کیوں دی گئی۔

جیل میں قیدی بننے کو مرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک سے ایک خیال ذہن میں آتا ہے۔ قیدی اپنا خون پیتا ہے اور صرف آنسو بہا کر رہ جاتا ہے۔ دوست کے ساتھ ملاقات میں پندرہ دن باقی تھے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اگلی ملاقات پر مجھے وہ مکمل اور صحیح رپورٹ دے۔ یہ پندرہ دن پندرہ مہینوں جتنے لمبے ہو گئے تھے۔

پندرہ دن بعد میرا دوست یہ خبر لایا کہ امجد و دوستی تیسری رات میرے گھر چلا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میری بڑی بیٹی کسی دور کے محلے میں شام کو ٹیوشن پڑھانے بھی جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ دو تین مرتبہ جوہی میری بیٹی ٹیوشن پڑھا کر واپس آتی تو امجد بھی اس کے ساتھ جوتا تھا۔

اسپ خود تصور کریں کہ جیل میں بند ایک باپ کی کیا حالت ہوتی ہو گی یہیں نے

لے انہیں غاصا پریشان اور خراب ہونا پڑتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ دیکھیں یا کبھی تیسرے پوچھ بیٹھے اچایا کریں۔

ایک روز میرا یہ دوست مجھے ملنے آیا۔ وہ اکثر اٹا رہتا تھا۔ اس نے جیل کے کسی انفرسے دوستی کا نظری تھی۔ اس لیے وہ اندر آ جاتا تھا اور ہم الگ الگ میز پر بائیں کر لیتے تھے۔ اس روز اس نے مجھے ایک ایسی اطلاع دی، جس نے میرے خون کو کھولا دیا۔ میں اتنا بھڑکا کہ بار بار یہی ارادہ ذہن میں آتا کہ جیل سے فرار کی کوشش کروں۔ یا اس اونچی دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنے آپ کو ختم کر لوں۔

اطلاع یہ تھی کہ ایک دو روز پہلے میرا دوست رات دس بجے کے لگ بھگ میری بیوی اور بچوں کو دیکھنے میرے گھر گیا تو میرے گھر سے امجد برآمد ہوا اور اس کو دیکھ کر اگے گزر گیا۔ میری بیوی نے میرے امداد سے پردہ ہٹا دیا۔ میرے دوست نے امجد کی آمد کا قصہ پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں یہ گھر کی عورتوں کو دھمکانے ڈرانے تو نہیں آتا۔ میری بیوی نے میرے دوست کو بتایا کہ یہ تین چار مرتبہ پہلے بھی آچکا ہے اور ہر بار دعائی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر عیسیت آئی ہے۔ میری بیوی نے میرے دوست کو بتایا کہ امجد اور کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ ضرور پوچھتا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ میری بیوی امجد کے آنے جانے پر کچھ پریشان بھی ہے۔

اصل پریشانی تو مجھے تھی۔ میں جیل میں بند تھا اور مرنے کا سامنا کر رہا تھا کہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ امجد کسی اچھی نیت سے میرے گھر آتا ہے۔ اگر اس کی نیت نیک بھی تھی تو میں کیسے برداشت کرتا کہ جس نے مجھے جیل تک پہنچایا۔ وہ میرے گھر کے دروازے میں داخل ہو۔ کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا کہ میرا دوست جھوٹ بولتا ہے۔ لیکن یہ شخص جھوٹ بولنے والا نہیں تھا۔ اسے ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اسے کہا کہ جا ہو کی



سلبر بن گیا تھا۔ وہ جیل میں آگیا ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر میری خوشی ایسے غصے میں  
 بال گئی۔ جس کے سامنے میں بے بس ہو گیا۔ میری عقل جواب دے گئی۔ مجھ پر  
 لبر غالب ہوا۔ میں نے رجسٹر چھینکا اور ڈر کر امجد کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں  
 سے پکڑ لی۔ میرے دانت ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اگر زبان درمیان  
 میں آتی تو کٹ جاتی۔ منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ امجد کی آنکھوں کے ڈھیلے  
 ابر آ گئے۔ تین چار قیدیوں اور دو سفرتیوں نے امجد کو میرے ہاتھوں کی گرفت  
 سے نکالا۔ میں نے لکھ لکھ کر کہا کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ سفرتی مجھے گھسیٹتے  
 اور دھکیلتے ہوئے جیل کے دفتر میں لے گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیوں  
 اس شخص کی جان لینا چاہتا ہوں۔ سفرتیوں نے اور جیل خانے کے دو تین آدمیوں  
 لے بتا کر انہیں نے کتنے بڑا جبر کر دیا ہے۔ میں ایک حوالہ قی کو جان سے مارنے لگا  
 تھا۔ یہ کہیں کو رٹ میں جاسکتا تھا۔ جہاں سے مجھے ارادہ قتل کی انتہائی سزا ملتی۔ اگر  
 جیل والے مجھ پر زور کرتے اور کہیں نہ بناتے تو وہ مجھے اپنی سوا ضرور دیتے۔ پہلے  
 نوہ خود مجھے مارے پھر افسروں کے آگے پیش کر کے بچے میں تیس بیبیوں  
 کی سزا لاتے اور معمول کے مطابق قید سے جو معافی ملتی ہے۔ وہ بھی ختم کر دیا  
 دیتے۔ لیکن انہوں نے میرے حالات پڑتیں کھلیا اور معاملہ دفع  
 کر دیا۔

تین تین چار دن حوالہ قیوں کی سیرک کی طرف نہ گیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ  
 امجد جو اب ہی میرے سامنے آیا۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ لیکن میری ڈیوٹی ایسی  
 ملتی کہ مجھے جیل میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا ایک روز میں حوالہ قیوں کی سیرک کی طرف  
 گیا۔ قی بھی ڈعا کر رہا تھا کہ امجد میرے سامنے نہ آئے۔  
 مجھے کسی نے آواز دی۔ گھوم کر دیکھا، امجد تیر تیر چلتا میری طرف آ رہا تھا میں  
 رکی گیا۔

”کیوں بلایا ہے مجھے؟“ میں نے غصے اور نفرت سے کانٹیتی ہوئی آواز

اپنے درست سے کہا کہ اگر ملاقات پر میری بیوی کو بھیجتا۔ میں نے ان کی ملاقات  
 تک کے دن بڑی اذیت میں گزارے۔

بیوی آگئی۔ میں نے اس سے امجد کے ساتھ تعلقات کے متعلق پوچھا۔ بیوی  
 کے ساتھ ملاقات میں یہ دشواری تھی کہ ایک ہی جالی کے ساتھ کئی قیدی لگے ہوئے  
 ہوتے تھے۔ سب کے رشتہ دار باہر کھڑے ہوتے اور ملاقات کا وقت بہت  
 حقوٹا ہوتا تھا۔ میرا دوست تو ایک افسر کی دوستی کی وجہ سے اندر آ جاتا تھا۔ لیکن  
 میری بیوی کو یہ سہولت میسر نہیں تھی۔ اس قسم کی ملاقات میں بیوی مجھے کیا بتاتی مگر  
 نے اتنا ہی کہا کہ آپ دل میں کوئی دہم اور شک نہ پھرنے رکھیں۔ گھر کی عزت و آبرو  
 بالکل محفوظ ہے۔ ہم پورے وقار کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں جب آپ باہر  
 آئیں گے تو آپ کو صحیح اور مکمل بات کا علم ہو جائے گا۔

میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اصل اور مکمل بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو  
 خبر دیا کہ وہ گھر میں امجد کو آ جانا بند کر دے۔ ورنہ میں جیل میں اپنے آپ کو  
 ختم کر لوں گا اور اگر میں زندہ باہر آ گیا تو گھر میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں  
 گا۔

میری بیوی آنسو بہاتی چلی گئی۔

میرے لیے سکون اور نیند ختم ہو گئے۔ عریضے ہی زیادہ تھی، اب گھر کے غم  
 اور فکر نے جسم بے جان کرنا شروع کر دیا۔ میری عمر اور میرے چال چلن کو دیکھتے  
 ہوئے مجھے جیل کے دفتر میں منشی لگا دیا گیا تھا، یہ ایسا کام تھا کہ میں تمام جیل کے  
 اندر گھوم پھر سکتا تھا۔

بیوی کی ملاقات کے پندرہ سولہ ہی دن بعد کا واقعہ ہے۔ میں جیل کے اندر  
 سے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ قیدیوں کا دبھٹہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ  
 چار پانچ حوالہ قی جیل کے اندر آ رہے ہیں۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میں امجد بھی  
 تھا۔ میں خوش ہوا کہ جس شخص نے مجھے اس مصیبت میں ڈالا جو میرے لیے بڑی اذیت بنا



ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کی بڑی بہت خوبصورت ہے۔ میں لعل کا مرتبہ چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دو چار مرتبہ سکول سے آتے اس کا بیچا بھی کیا تھا۔ اسے بس میں سوار ہوتے بھی دیکھا۔ میں اسی بس پر اپنے محلے تک آیا۔ لیکن آپ کی بیٹی پر دے کی اتنی سخت تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہ آیا۔ میری نیت خراب نہ تھی۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہیں آپ کی نظر میں گناہگار ہوں۔ چہرہ میری لڑائی ہو گئی۔

”جب آپ کو جیل کی حوالات میں بند کر دیا گیا اور تیرہ چار آپ کی ضمانت نہیں ہوئی تو میری جو حالت ہوئی۔ وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ میری وجہ سے گرفتار اور قید ہوئے تھے۔ میں آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش نہیں کر رہا کہ میں شریعت لڑکا ہوں۔ بالکل اپنی جیسا ہوں جو گلیوں میں آواز دگر دی کرتے اور گلی محلے کی لڑکیوں پر آواز دے کتے ہیں۔ جب آپ کے ساتھ لڑائی ہوئی اس وقت تک میں کو خزاور لنگھتا تھا۔ مجھے نہ اپنی اور نہ کسی اور کی عزت کا خیال تھا۔ مجھے امید تھی کہ تھانے جانا کر میرے والد اور بھائی آپ کے ساتھ راضی نہ کر لیں گے۔ لیکن انہوں نے تھانے دار کی ٹٹھی گوم کر دی اور کہا کہ چوری صاحب اسی دفعہ لگاؤ کر یہ شخص دس سال سے پہلے جیل سے نکل کے گا۔ میرے بھائی جی تھوڑی دیر بعد ہوش میں آگئے تھے اور زخم کاری نہیں تھا۔ لیکن میرے اہلکے لے کر وہ ڈاکٹر کی مٹھی کر کے ضرب اور زخم شدید لکھوائیں گے۔ آخر انہوں نے جکھا تھا۔ وہ کر کے دکھایا۔ تھانے دار بھی ان کے ہاتھوں میں کھیتا رہا۔ دو گواہوں کو میرے آلو نے دو، دو سو روپیہ دے کر اپنی مرضی کے بیان لکھوئے تھے۔ میں نے بھی آپ کے خلاف بیان دیا تھا اور میں نے اپنے بیان میں کہہ دھا جھوٹ شامل کیا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو میرے آلو اتنے سخت اور ضدی آدمی ہیں کہ وہ مجھے گھر سے نکال دیتے۔۔۔ جب کہیں عدالت میں پہنچ گیا تو معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا۔ رات کو گری نیند سے آنکھ کھل جاتی اور یوں لگتا جیسے کسی نے

میں پڑھو۔

”میں آپ کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتا ہوں“ انجور نے میرے قریب آکر بڑی نرم آواز میں کہا۔ ”لیکن میری پوری بات سن لیں“

”میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“ میں نے دانستہ پیتے ہوئے کہا۔

”تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا“

”چاچا فیر؟“ انجور نے اٹھ کے لیے کہا۔ ”اگر آپ نے اصل بات سننے لیں مجھے قتل کر دیا تو میں اس دنیا کے جھٹ سے آزاد ہو جاؤں گا اور آپ بھی یہاں کے تختے کے ذریعے اس دنیا سے اٹھ جائیں گے۔ مگر آپ کی بیوی اور بچیاں درد ٹھوکریں کھاتی پھرنی گی۔ آپ کو اپنے گھر کی عزت کی قسم کہ میری بات سن لیں۔“

میں اس کی بات نہیں سنا چاہتا تھا، کیونکہ جھوٹ کے سوا اُسے کہنا ہی کیا تھا۔ پھر بھی ایک خیال دل میں آگیا کہ اس کی بات سن ہی لوں۔ میں نے اُسے کہا کہ جو کہنا ہے کہہ لے۔

”چاچا فیر؟“ انجور نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہمارے رزم و رواج ہی ایسے ہیں جن کی وجہ سے کوئی پاگل ہو سکتا ہے۔ مجھے آپ پاگل سمجھ لیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں آپ کی بیٹی کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر کے سامنے ٹوک جایا کرتا تھا۔“

”کیا تم نے میری بیٹی کو بھی دیکھا تھا؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔ مجھے یہ توقع ہی نہ تھی کہ جس بیٹی کو میں نے برتنے اور پھر پردے میں چھپا کر رکھا ہوا تھا اُس اس لڑکے نے نہیں دیکھا ہو گا۔

”نہیں چاہا؟“ انجور نے کہا۔ ”وہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ بڑے عزیز“

بلکہ۔ میری بات پر آپ کو غصہ آئے گا۔ لیکن میں آپ کو صحیح بات بتانا چاہتا



دروازے پر کھڑا تھا۔ میرے اندر سے کوئی طاقت اٹھی۔ جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر دروازے پر مارا۔ میری دستک پر دروازہ کھلا۔ میں نے نہ دیکھا کہ دروازہ کس نے کھولا ہے۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ خالہ (میری بیوی) اٹھیں۔ ڈیڑھ سی کی روشنی میں مجھے دیکھ کر وہ اتنا ڈریں کہ ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ سمجھی ہوں گی کہ میں اسیں تنہا دیکھ کر انہیں پریشان کرنے آیا ہوں۔۔۔

”میں نے جھک کر خالہ کے پاؤں پر بیٹھے۔ تب انہوں نے کہا کہ اس گھر سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں گلی میں نکل کر شور مچا دوں گی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر خالہ سے کہا کہ میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ فوراً بعد میں بچوں کی طرح رو نہ لگا۔“

اس نوجوان نے مجھے وہ ساری باتیں سنائیں جو اُس نے کہہ سن کر میری بیوی کے دل میں اپنا اعتقاد پیدا کر لیا تھا۔ میری بیوی نے اُسے بٹھایا اور کہا کہ اُس کے دل میں اُس کے (امجد کے خلاف) کوئی ناراضگی نہیں رہی۔ لیکن وہ آئندہ اس گھر میں رہے۔ اُس نے امجد کی پیشکش قبول نہ کی لیکن امجد تین چار روز بعد رات کے وقت پھر یہ گھر چلا گیا۔ میری بڑی بیٹی اُس سے بہرہ کرتی تھی۔

امجد نے میری بیوی کو ایک سو روپیہ دیا۔ میری بیوی نے قبول نہ کیا۔ امجد سو روپے کا نوٹ میری بیوی کے آگے پھینک کر چلا گیا۔ اس کے چند دن بعد میری بیٹی نے پویشن پڑھانے کا انتظام کر لیا۔ میری بیوی نے سلامتی سفینوں رکھ لی تھی۔ امجد نے میرے گھر جانا چھوڑا۔ وہ چندہ میں روز بعد میرے گھر شام کے بعد جاتا تھا۔ میری بیوی سے پوچھتا کہ گھر میں پیسے ہیں یا نہیں اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کبھی کبھی میری بیوی اُسے گھر کی کوئی ایسی ضرورت بتا دیتی جو وہ عورت ہونے کی وجہ سے خود پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا انتظام اسی کرتے ہیں۔

مجھے جکا دیا ہو۔ باقی رات کروٹیں بدلتے ہوئے اور سخت بے چینی کے عالم میں گزرتی۔“

مجھے اس طرح کے کی باتوں پر اتنی جلدی اعتدائی نہیں کر لیتا چاہیے تھا۔ لیکن وہ جس لمحے میں بول رہا تھا۔ اُس لمحے میں کوئی اثر تھا۔ جو میرے دل کو موم کرتا جالام تھا اور مجھے اُس پر اعتبار آتا جا رہا تھا۔ خدا کی قسم، میری زبان بند ہو گئی۔

”چلیا فقیر“ وہ کہہ رہا تھا۔ اگر آپ نے مجھے کہہ دیا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو میں پاگل ہو جاؤں گا اور یہ گناہ آپ کے سر ہو گا۔۔۔ میں نے عدالت میں بھی آپ کے خلاف جھوٹا بیان دیا۔ میری عمر یہی لیا ہے۔ مجھے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔ میں اپنے آپ کو ایسا دھوکہ نہیں دے سکتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ ٹھیک کیا ہے۔ میں بڑی ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے دلوں و دمنوں کو بتایا کہ مجھے کوئی طریقہ بتائیں جو مجھے اس حالت سے نجات دلا دے۔ دوستوں نے میرے ساتھ مذاق شروع کر دیے۔

”اور جب آپ کو سزا سنائی گئی تو میرے جسم کے اندر چیونٹیاں چلنے لگیں میری حالت یہ ہوئی۔ جیسے چیونٹیاں مجھے اندر سے کاٹ رہی ہوں۔ میں چار روز بعد شام کا کھانا کھانے کے لیے میرے گھر والے اکٹھے بیٹھے تو میرے ایک بھائی نے آپ کے گھر کے متعلق کہا کہ اب اُس کی یعنی آپ کی بیوی اور بیٹیاں بچوں کی پرہیز گاری تو اسے ہم جسدوں کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کا موزہ اٹائے گا۔ میرے گھر کے تمام مرد اس طرح ہتھے جیسے ٹمنوں نے کوئی قدمہ فتح کیا ہو۔ میری حالت یہ ہوئی کہ میں کانپ گیا۔ میں آپ کی نظر میں آوارہ اور گناہگار ہوں لیکن تکیہ اور غرور دہی بات مجھے بہت بُری لگی۔۔۔“

”کھانے سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو گھنٹے بعد میری بے چینی بہت زیادہ ہوئی۔ میں گھر سے نکل آیا اور سر تھکا کر ایک طرف چل پڑا۔ مجھے کچھ تیرہ نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ مجھے اُس وقت پتہ چلا کہ میں کہاں ہوں۔ جب میں آپ کے



اسے دیکھنا گیا۔ والہی کے وقت بھی میں چلا گیا اور اسے دیکھنا ہوا والہی اس گیا۔ میں  
میں دن جاتا رہا۔ چوتھے دن جب آپ کی بیٹی والہی آ رہی تھی۔ میں نے وہ نوجوان  
دیکھے۔ وہ میری عمر کے ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ وہ آپ کی بیٹی کے چچے تھے  
چل پڑے۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو ایک نے یہودہ کہا کہ اس کی۔ آپ کی  
بیٹی مر گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر رکی تھی۔ مجھے بھی پتا نہ تھی۔ اس نے مجھے کہا کہ یہ لوگ اسے  
اثر اسی طرح پریشان کرتے ہیں۔

”میں نے اسے کہا کہ وہ گھر چلی جائے۔ میں نے جواب دہ کر لیا تھا۔ اس کے  
پیش نظر آپ کی بیٹی کو دبا کر رکنا نہیں چاہئے تھا۔ ورنہ اس کی بدنامی ہوئی۔ بھئی  
آپ کی بیٹی نے پیٹھ پھیری، میں ان نوجوانوں پر ٹوٹ پڑا۔ پھر وہی ہوا جو آپ کے  
ساتھ ہوا تھا۔ وہ دوتھے اور میں اکلیا تھا۔ میرے ہاتھ میں اینٹ آگئی۔ میں نے اٹھا  
کر ان میں سے ایک کے کندھے پر پھر سر پہاڑی۔ اس کا خون بہنے لگا۔ دوسرا  
بھاگ گیا۔ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ورنہ میں اس لڑکے کو قتل کر دیتا پورٹ تھا نے  
تاک چلی گئی۔

میرا باپ اور بھائی اسے کوڑوں میں کر ڈالنا شروع کرتے۔ انہیں قتل کرنے سے  
میری گرفتاری کی اطلاع ملی تو وہ آگئے۔ انہوں نے ان دونوں لڑکوں کے خلاف روپوش  
لکھوا کر سپر جج کر لیا۔ چونکہ ایک لڑکا زخمی تھا۔ اس لیے گرفتار صرف مجھے کیا گیا۔ مجھے  
امید ہے کہ وہ لوگ راضی ہو کر مر لیں گے۔ ان میں مقدمہ لڑنے کی ہمت نہیں۔ ورنہ  
وہ دونوں لوگوں کے گرفتار ہو جائیں گے۔

میں ابجد کا بہت شکر اٹھاتا رہا۔ اس نے میری بیٹی کو ایک پریشانی سے بچا دیا تھا  
لیکن میرے دل میں طرح طرح کے دوسرے آئے گئے۔ باپ کو اپنی بیٹی کے متعلق  
ایسی بات کہنی تو نہیں چاہیے۔ لیکن میں کہہ دیتا ہوں کہ مجھے یہ سوچ پریشان کرنے  
لگی کہ ابجد نے شاید میری بیٹی پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ قیدی وہم اور دوسروں میں مبتلا  
ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس لڑکے نے مجھ کو اپنی ایسا اثر سیدھا کر لیا تھا

میری بیوی کو ایک سو روپیہ دیا۔ میری بیوی نے ابجد کی مندر پر یہ رقم  
قبول کی۔

”تم نے کہیں ملازمت کر لی ہے؟“ میں نے ابجد سے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔

”پھر یہ ایک سو روپیہ کہاں سے لائے رہے ہو؟“

”آپ اچھا نہیں سمجھیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں  
گا۔ میں یہ پیسے اپنے گھر سے چوری کر کے فالہ کو دیتا رہا ہوں۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چوری کے پیسے میری بیوی کو دیتا رہا تھا  
میرے گھر میں حرام کی رقم استعمال ہوتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ یہ گھر میں حرام کا ایک  
پیسہ اپنی جیب میں نہیں ڈالا۔

”جب آپ باہر نکلیں گے چاہا تو چوری کی رقم مجھے والہی کر دینا۔“ اس نے  
کہا، ”لیکن جو کر سکتا تھا وہ کیا ہے۔ یقین کرنا چاہا! میں اندر سے جل رہا تھا۔  
بھئی مینا آپ کے گھر میں داخل ہو کر فالہ کے پاؤں پکڑے، میری الگ بجلی گئی۔ مجھے  
سکون مل گیا۔“

”تم کس گھر میں پکڑے گئے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا، ”میرا خیال ہے  
”تم نے چوری کی ہوگی۔“

”میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔“ اس نے کہا، ”لیکن آپ نے مجھ پر چوری کا شک  
کیا ہے۔ اس لیے بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ میں کس گھر میں پکڑا گیا ہوں۔... آپ کی  
بیٹی چند ایک بچوں کو اپنے گھر میں پڑھاتی ہے اور دن کے پچھلے پہر وہ بچوں کو ان کے  
گھروں میں پڑھانے جاتی ہے۔ وہ نوٹ لکھ رہی ہیں۔ ایک سات میں آپ کے گھر  
گیا تو فالہ نے بتایا کہ کچھ دنوں سے آپ کی بیٹی کو دو لڑکے راستے میں پریشان کرتے  
ہے۔ مجھ سے آپ کی بیٹی پر وہ کرتی ہے۔“

”میں دوسرے دن آپ کی بیٹی کے راستے میں جا کھڑا ہوا اور وہ در در مڑ کر



ہوا کہ بیکسی اسی کہنی کے دفتر میں چلا گیا۔ مالکوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہی کہیں گے گرفتار ہوا ہوں۔ انہوں نے مجھے پرانی ملازمت دے دی۔ میں اب بھی اسی کلبھی میں ملازم ہوں۔ میں نے بیٹی کی باہر والی ٹیوشنیں چھوڑ دیاں۔ صرف ان بچوں کی ٹیوشنیں رہنے دیں۔ جو میرے گھر میں آکر پڑھتے تھے۔ اب میرے سامنے مسئلہ بیٹی کی شادی کا تھا۔ اپنا کوئی رشتہ دار نہیں۔ میں اور میری بیوی بیٹی کے رشتے کے سنے پہ تائیں کرنے لگے۔

ایک روز میری بیوی نے کہا کہ امجد سے بہتر لڑکا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن دشمنی ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ امجد کے مال باپ نہیں مانیں گے۔ بیوی نے کہا کہ کسی طرح یہ دشمنی ختم ہو جائے۔ امجد بھی یہی چاہتا ہے۔

میری بیوی نے دراصل میرے دل کی بات کہہ دی تھی، لیکن میں بیٹی کا باپ تھا۔ میں امجد سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنے باپ کو راضی کرے۔ دو چار روز میری بیوی نے مجھے کی کسی عورت کے ساتھ بات کی کہ امجد ہماری بیٹی کو پسند کرتا ہے اور ہم امجد کو پسند کرتے ہیں۔ میری بیوی نے اس عورت سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ امجد سے کہے گی کہ اپنے مال باپ کو راضی کرے کہ وہ ہم سے رشتہ مانگیں۔

آپ اپنے معاشرے کی عورتوں کو جانتے ہیں۔ اس عورت نے امجد کی مال کو جانتا یا کرتا تھا مال کا فقیر حسین کے گھر میں پھنسا ہوا اور مال امجد کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امجد کے مال باپ نے ایک چھتے کے اندر اندر اس کی شادی لیٹے رشتہ داروں میں کر دی۔ میں آپ کو صحیح بات بتاتا ہوں کہ مجھے اس کا اسورس ہوا۔

میں نے اپنے امجد فخر سے ملازم میرے گھر لایا۔ میں ایک شام گم کھڑا یا تو میری بیٹی مجھے بتا یا کہ امجد آیا تھا۔ وہ رو پڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنی مال سے کہا تھا کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ دشمنی ختم کر دیں۔ اس کی

کر میں نے اس پر اعتبار کر لیا۔

”امجد بیٹا“ میں نے کہا: ”تم میرے گھر جاتے رہتے ہو۔ تمہیں میری بھالی کے لوگوں نے دیکھا ہو گا۔ اور انہوں نے میری بیوی اور میری بیٹی کو بدنام کر دیا ہو گا۔“

”آپ نے بڑا لمبا زمانہ دیکھا ہے“ اس نے کہا: ”لوگوں کو باتیں بنانے کے لیے ذرا سا اشتہار کافی ہوتا ہے۔ میں تو آپ کے گھر جاتا ہوں اگر یہی لوگوں کی باتوں سے ڈر جاتا تو میں کبھی آپ کے گھر کی دیکھ بھال نہ کر سکتا۔ آپ کی بھالی والوں نے میرے گھر جانتا یا کرتا مال کا ٹنڈا سے دشمنوں کے گھر جاتا ہے۔ میرے باپ اور بھائیوں نے مجھ سے باز پرس کی۔ میں نے بھوٹ بولا کہ میں وہاں نہیں جاتا۔ میرا باپ میری بیٹی بھی کر چکا ہے۔ لیکن میں چوری چھپے آپ کے گھر جاتا ہوں۔“

امجد نوجوان تھا۔ وہ جذبات میں آکر میرے گھر جاتا رہا۔ اس نے میرے گھر کی بدنامی کا خیال نہ کیا۔

تین چار روز بعد مصافحت پر رہا ہو گیا۔ مجھے ایک ماہ بعد پتہ چلا کہ اس کا مال لوگوں کے ساتھ راضی نامہ ہو گیا ہے اور کسین علالت میں نہیں گیا۔ وہ میری قید کا تمام عرصہ میرے گھر جاتا رہا۔ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آیا۔ پتہ چلا کہ وہ میری بیٹی سے دور رہ کر اس کی مخالفت کرتا ہے۔ میری بیٹی نے مجھے بتایا کہ اسے معلوم ہے کہ وہ جب ٹوشن پڑھانے جاتی ہے تو امجد اس سے دُور دور اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

جیل میں میرا ریکارڈ اچھا تھا۔ میں چونک جلیں کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس لیے انصر کے ساتھ انجی راہ و رسم پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی پانچ مہینے معافی مل گئی۔ میں ماہر کہ گھر لایا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ امجد اس کے لیے اور میری بچیوں کے لیے کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

میں ایکس پریس پر سب کہنی میں ملازم تھا۔ قید ہو جانے سے ملازمت ختم ہو گئی تھی۔



97.95  
30-7

## غیر مرا نہیں کرتی

مہر ملک کے لیے دوسرے ملکوں کی جائوسوی اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنا اسلحہ اور بارود و خصوصاً ان ملکوں کے لئے جن کی آپس میں دشمنی کی فضا قائم رہتی ہے۔ مثلاً روس اور امریکہ پاکستان اور بھارت وغیرہ۔ ایسے ملکوں کو ایک دوسرے کے ملک میں جائوسوس بھیجنے ہی پڑتے ہیں۔ کیونکہ آدھی جنگ کا یہاں جائوسوی جیت لیتی ہے۔ اگر پاکستان میں بھارت کے جائوسوس موجود ہیں یا بھارت میں پاکستانی جائوسوس سرگرم ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اگر آپ جائوسوسوں کی دنیا میں جائیں تو عجیب و غریب ادب و بدابت کو بلا دینے والے اور ناقابلِ قبول بات واقعات رونما ہونے نظر آئیں گے۔ ایسی کہانیاں اظہارِ فساد نے لگتی ہیں لیکن یہ افسانے نہیں ایسی حقیقتیں ہیں جو افسانے سے زیادہ چونکا دینے والی ہوتی ہیں۔

اب مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ اس کہانی کے کردار مجھے کہاں ملے اور کہاں بھٹکے کس طرح پہنچی کیونکہ میں یہ بتاؤں تو ایک ٹوکھانی طویل ہو جائے گی۔ دوسرے امانت میں خیانت ہوگی۔

پاکستان اور بھارت کی سرحد پر جنگ کے بارے میں ٹلا رہے تھے۔ دونوں ملکوں کی جائوسوی کا نظام غیر معمولی طور پر سرگرم تھا۔ پاکستان کی ایشیائی جیس کا ایک ایجنٹ جسے میں کہانی سنانے کے لیے احمد خان کوں گا۔ سرحد پار جا رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو دشمن کا میانی سے انجام دے چکا تھا ان دونوں

مال نے اس کے باپ اور بھائیوں کو بتایا کہ اردو کا اپنے دشمن کے حال میں آگیا ہے۔ بڑے بھائی نے اسے مارا پیٹا اور سہارے "جالت" سے ٹکالنے کے لیے اس کی شادی کر دی۔ امجد نے میری بیوی کو بتایا کہ جس روٹی کی اس کی بیوی بنا دی گئی ہے۔ وہ اسے پسند نہیں اور لوہ کی بد تمیز اور کھیر چڑ ہے۔ امجد نے اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کر دیا اور وہ ددھنیوں سے اپنے پیٹے پیٹھی ہوئی تھی۔ مال باپ اور بھائی امجد کو برا بھلا کہتے تھے کہ اس کا دل کہیں اور تھا اس لیے اسے یہ بیوی پسند نہیں آئی۔

اس واقعہ کو چار سال ہو گئے ہیں۔ میری بیوی کی شادی میرے ایک دوست کے بیٹے کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ ادھر امجد دو سال ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے اور اس نے دوسری شادی سے انکار کر دیا ہے۔ مگر اسے کوئی اپنی بیوی دے گا ہی نہیں کیونکہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ زندگی کی پٹری سے اتر گیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ چرس پیتا ہے۔ میں نے اس عرصے میں اسے دو تین بار دیکھا تھا۔ پچانہ نہیں جاتا تھا۔ اس کا رنگ زرد اور چہرہ سرخا گیا ہے۔ اب سننے میں کہیں کوئی رگن نہ نہیں آتا اور گھروالوں نے اس کے نام پر اکیر پھیر دی ہے۔



موت کے قریب لیے جا رہا تھا۔ اُن پر خاموشی طاری تھی اور ایسی خاموشی جس میں طوفان پہنا ہوا ہوتے لگتا۔ چلتے چلتے دونوں ریخریز مڑ گئے۔ انہوں نے کہا۔ دوستو! ہمارا سفر تمہارے ساتھ ہمیں تک تھا۔ ممکن ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ چلتے مگر کام میں فرق ہوتا ہے۔ یہ سفر تمہیں اکیلے ہی طے کرنا ہو گا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو غدا کا نظر کیا۔ غلام محمد اور احمد خان چل چلے۔ ریخریز کھڑے اسی میں دیکھتے رہے۔ پھر شام کی تاریکی نے انہیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

غلام محمد کو ابھی طرح معلوم تھا کہ خطہ کہاں کہاں ہے۔ ایک تو حجاز کی بارڈر سکيورٹی فورس تھی اور انڈیلی جنس یونٹیں بھی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ کھیتوں میں کوئی بلا ہر پہلے سرسرا گسا گسا گھومتا پھرتا، کسان نہیں ہو سکتا وہ انڈیلی جنس کا ہی آدمی ہو گا۔ اگر آپ دشمن کے ملک میں چلے جائیں تو وہاں کے پتھر اور مٹی بھی آپ کے دشمن ہوتے ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ دیکھتے ہوئے انگاروں پر چلتے اس مقام تک پہنچ گئے۔ جہاں غلام محمد نے احمد خان کو چھپا کر اُن کے حالات معلوم کرنے تھے۔

غلام محمد نے احمد خان کو ایک جگر بٹھا دیا۔ یہ ایسی جگر تھی جہاں سے کسی کا لڑ نہیں ہوتا تھا۔ غلام محمد جانتا تھا کہ یہ جگر محفوظ ہے۔ اُس نے احمد خان سے کہا کہ جنگ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ اس لیے تمہارا کام ناممکن کی مدد تک دشوار ہو گیا ہے۔ یہاں کسی جانور پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تم بدبخت ہو گئے رہنا۔ میں آگے کے حالات اور ماحول دیکھ آؤں۔ احمد خان کے لیے اس کی باتیں نئی نہیں تھیں۔ وہ دوبارہ پہلے بھی ان خطروں سے گزر چکا تھا۔ کیا بھی تھا۔ والیس بھی آیا تھا۔ اُس نے ہنس کر غلام محمد سے کہا کہ تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے تمہاری فکر ہے گی۔ لیکن یہاں احمد خان کا تجربہ آج سے دھوکہ دے رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ کچھ عرصے سے غلام محمد وہ غلام محمد نہیں رہا جو کبھی ہو کرتا

سرحد پار کرنا ایسے ہی تھا۔ جیسے کوئی آگ میں سے گزر جائے۔ کیونکہ وہ دونوں ملات سرحدوں پر ایسی فریج موجود تھی جو عام شہری کو نظر نہیں آتی، لیکن اُس فریج کی نظر دشمنوں کے پتے پتے پر گرا لگھا س کی پتی پر ہوتی ہے۔ احمد خان اُن تمام خطروں سے آگاہ تھا۔ لیکن تنخواہ کے علاوہ جو جذبہ اُس کے اندر پیدا ہو چکا تھا وہ آج سے ان خطروں میں دھکیل رہا تھا۔

اس طرح جانے والے جاسوسوں کے استقبال اور رہنمائی کے لیے آگے آدمی ہوتا ہے جسے ”کوڈیر“ کہتے ہیں۔ سرحد پار کرنے کے لیے جو کوڈیر موجود تھا اُس کا نام غلام محمد تھا۔ وہ کچھ پانچ چھ سال سے پاکستان انڈیلی جنس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اُس کے فرائض میں پاکستانی جاسوسوں کو بحفاظت سرحد پار پہنچانا اور واپس لانا تھا۔ غلام محمد کو سرحد پار کا علاقہ اور اُس کے لوگ بخوبی جانتے تھے اور یہی اُس کی کامیابی تھی کہ اُس نے اپنے اوپر سب گناہ کا خول چڑھا کر اپنی اصدیت کو چھپا رکھا تھا اور وہاں کے لوگوں میں مقبول تھا۔

غلام محمد اور احمد خان کو جہاں اکٹھے ہونا تھا ہونے اور وہاں انڈیلی جنس کے آفیسر نے انہیں آخری ہدایت دیں اور خطہ کا نظر کر کے انہیں اُن ریخریز کے حوالے کر دیا جہاں کام کے لیے وہاں موجود تھے۔

”میرے دوستو!“ انڈیلی جنس کے آفیسر نے کہا: ”تم میرے حکم سے نہیں جا رہے۔ اس وقت یہ بھول جاؤ کہ تمہیں ایک افسر حکم دے رہا ہے۔ تم خدا کے حکم سے جا رہے ہو۔ اپنے ملک کی مدد تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جاننے کہ دشمن کے مقابلے میں ہمارے پاس اسلحہ یا ٹرڈ کمنٹا کم ہے۔ اس کمی کو صورت تم پورا کر سکتے ہو۔ تمہارے پاس ایمان کی قوت موجود ہے اور یہی قوت تمہیں فتح دے گی۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

سورج غروب ہونے کے بعد جب شام تاریک ہونے لگی تھی۔ گروشت پوست۔ چار انسان دشمن کی سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر قدم انہیں



غلام محمد کو نوادہ جانتا ہی تھا اور اس کی اس کو شش یہ تھی کہ غلام محمد جس پاکستانی جاسوس کو ساٹھ لایا ہے وہ اس کے حوالے کر دے تاکہ اسے وہ خود اپنی انٹیلی جنس کے حوالے کرے اور انعام و اکرام حاصل کرے۔

غلام محمد کو خیال آیا کہ جو کام وہ خود کر سکتا ہے، وہ کام چوٹی لال کے حوالے کیوں کر دے۔ لیکن چوٹی لال اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ چوٹی لال نے اسے کہا کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے شکا کر کسی جھاڑی کے پیچھے بچھایا ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں کریڈٹ نہیں میرے ساتھ جو کوئی بھی نہیں۔ وہ خالی ہاتھ نہیں اور تم یہ بھی نہ بھولو کہ تم میرے ملک میں ہو۔ شکا تم نہیں دو گے میں خود حیا کر لے لوں گا۔

غلام محمد وہاں لڑائی جھگڑے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے چوٹی لال سے کچھ بے بسی کے سے عالم میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ جو کوئی بھی تھا وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو بلا خود دیکھ لو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔

چوٹی لال نے بلند آواز سے کہا، ”جھوٹا ہے“ اور وہ چل پڑا۔ غلام محمد کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ دو تین آدمی تو ضرور ہوں گے۔ غلام محمد جلدی مارنے والا نہیں تھا۔ اگر جاسوس اس جتنی جلدی مار جائے تو وہ اپنا کام بھی نہ کر سکے۔ انہیں معلوم ہونا ہے کہ ہمارا مطلب گرفتاری، پھر انسانی اذیتیں اور موت ہے۔ چوٹی لال نے اس کی نظروں سے اوجھل ہوا۔ وہ دوسری طرف بڑی تیزی سے چل پڑا۔ وہ راستہ چھوٹا کر کے احمد خان تک پہنچنے کی کوشش میں تھا۔

احمد خان غلام محمد پر جھڑپ کر کے اطمینان سے وہیں بیٹھا تھا۔ جہاں وہ اسے بٹھالیا تھا۔ اسے جب قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا کہ اس کی طرف آنے والا ایک نہیں تین چار آدمی ہیں جو سیالوں کی طرح لمبے نظر آ رہے تھے۔ احمد خان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کے قابل تھیں۔ اسے شک ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ وہاں سے سو کر کہ ایک طرف ہوا۔ آنے والے بڑی تیزی سے

تھا اب وہ اپنا ایمان اور ضمیر فروخت کر چکا ہے اور اب اس کے چہرے پر ایک نہیں دو نقاب ہیں۔ ایک بھارت کا ایک پاکستان کا۔

اس کا منی کا یہ حیرت کچھ عرصہ بعد پتہ چلا تھا۔ یہ نہیں آپ کو اس کے ساتھ ہی سنا دیتا ہوں۔ غلام محمد حالات دیکھتے نہیں جا رہا تھا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کی ضخیم چوکی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں سے احمد خان کا سودا کرنا تھا۔ غلام محمد ڈرل کو اس راوغی جاسوسی کر رہا تھا۔ اس طرح وہ دونوں ملکوں کی انٹیلی جنس سے پیسے کم رہا تھا۔

غلام محمد ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا تو اسے کسی کی کھانسی کی آواز سنائی دی جو کھانسی نہیں تھی، ایک اشارہ تھا۔ ایسے اشارے عموماً سنگھار جاسوس ہی سمجھ سکتے ہیں۔ غلام محمد حرکت کر گیا، ایک آدمی اس کے قریب پہنچا۔ غلام محمد نے اسے پچان لیا۔ وہ چوٹی لال تھا۔

”ادوہ پیتم ہو گا“ چوٹی لال نے کہا۔ بھارتی علاقے میں غلام محمد گانے کے نام سے جانا پڑا ہوا تھا۔

چوٹی لال نے کہا، ”کوئی شکار لائے ہو؟“

”تیار، شکار کہاں؟“ غلام محمد نے جواب دیا، ”آج تو دیکھے ہی گیا ہوں۔“

”ادوہ گانے“ چوٹی لال نے اسے کندھے پر تھپکی دے کر کہا، ”ہمارے ساتھ بھی چکر پازر؟“

اب غلام محمد اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی شکار نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی آیا ہے۔ لیکن چوٹی لال نے اسے احمد خان کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ چوٹی لال کوئی عام قسم کا آدمی تو نہیں تھا جو غلام محمد پر فوراں حملہ کر لیتا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کا ”ٹاؤٹ“ تھا۔ جس کا یہی کام تھا کہ اسے جانے لوگوں پر نظر رکھے اور اپنے مطلب کے آدمی انہیں سے ٹکاش کر تار سے



دور ایک خانقاہ تھی، جو پیر سید، بھگیاں کا لڑا تھا۔ غلام محمد کبھی یہاں کشن لکھا نے  
آجاتا تھا۔

ایک سمرانی ہو خانقاہ تھی بڑا اب اڈہ ہی بن کے رہ گئی تھی۔ قریب کے گاؤں  
میں دو تین گھر بھی مسلمانوں کے رہ گئے تھے جو بے چارے صوفی نام کے مسلمان تھے۔

ان کے بچوں کے نام بھی ہندوؤں کی کھوں جیسے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ تو اب بھر  
کو بھی قبول گئے تھے۔ خانقاہ پورہ کیا جاتے۔

محمد خان کو اس خانقاہ تک پہنچا کر اس نے قبر کے قریب بٹھا دیا۔ اپنی چادر بٹھا  
کر اس کے ماتنگ کے زخم پر باندھ دی۔ خانقاہ کا مستولی ان کی آواز سن کر وہاں آ  
گیا۔ مستولی غلام محمد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن وہ اسے ہندو سمجھتا تھا اور مستولی یہ بھی  
جانتا تھا کہ گاگا مسلمان ہے جو کبھی کبھا مستولی کو چوس کی دو چاگ لیا دے جاتا تھا غلام محمد  
نے مستولی سے کہا کہ یہ میرا ساتھی ہے۔ زخمی ہو گیا ہے۔ مستولی نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ  
جانتا تھا کہ یہ سنگلوی ہیں۔ ان پر کبھی کبھا لڑائی چلی جاتی ہے۔ اس نے احمد خان کو لٹھایا اور  
خانقاہ کے ساتھ اپنے کوٹھے میں لے گیا اور اپنے بستر پر ٹٹا دیا۔

غلام محمد مستولی اور احمد خان سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ واپسی کا بندوبست کرتا ہے۔  
”دیکھتا ہوں کہ میں سے کوئی لڑکا گھوڑا مل جائے۔“ لیکن وہ انٹیلیجنس کی ایک چوکی کی  
طرف جا رہا تھا۔

چوکی پر پہنچا تو اس نے ہندو کیڈیشن کو اپنا منتظر پایا۔ جسے مات والے فائرنگس  
کے واقعہ کی اطلاع مل چکی تھی۔ اب ہندو کیڈیشن اس پر پرس پڑا کہ تم آگ کے ساتھ  
کھیل رہے ہو۔ مجھے پورٹ مل چکی ہے کہ راست تم نے ہمیں کیا دھوکہ دیا ہے۔  
غلام محمد نے تجھوٹ کی تلوار کو جھوٹ سے کاٹنا چاہا۔ اس نے کہا کہ میں نے نہیں  
بلکہ چوٹی لال نے راست کو چند روپوں کے انعام کے لالچ میں ایک پاکستانی کو جھکا دیا  
ہے اور ایک زخمی پڑا ہے۔ کام کا آدمی وہ تھا۔ جو جھگا گیا ہے۔ چوٹی لال نے میرے  
ساتھ راست کو زیادتی کی کہ میں دونوں پاکستانیوں کو کوپ کے پاس لا رہا تھا۔ میں ان

اس طرف آ رہے تھے۔ اسے ایک سال مار مار ڈالی۔ ”جو کوئی بھی ہوا ٹھٹھ کے  
بھارے سامنے آ جاؤ۔“ اب احمد خان کو یقین ہو گیا کہ غلام محمد دھوکے میں آ گیا ہے  
وہ اٹھا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ایک وقت دو تین گولیاں فائر ہوئیں  
احمد خان نے محسوس کی کہ ایک یا دو گولیاں اس کی ٹانگ میں سے گزر گئی ہیں۔  
لیکن وہ پھر بھی جھکتا ہوا ان سرکنڈوں میں قہقہہ پٹا گیا۔ جو قریب ہی تھے۔ اس کے بعد  
گولیاں پتی پتی ملیں اور احمد خان سرکنڈوں میں سے نکل کر اس طرف ہو گیا۔ بھر پور  
لال اور اس کے آدمیوں کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ اب چوٹی لال اور اس کے  
آدمی اسے سرکنڈوں میں تلاش کرتے رہے اور احمد خان دیکھتا ہر کچھ دور  
نکل گیا۔

غلام محمد نے گولیوں کے دھماکے سننے تو اسے افسوس ہوا کہ اس کا انعام  
اکرام ہاتھ سے نکل گیا ہے اس کا دوسرا نقصان یہ تھا کہ چوٹی لال اس کے  
خلاف رپورٹ کرے گا کہ غلام محمد بھارتی انٹیلیجنس کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسے  
گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے بلیک لسٹ بھی کیا جا سکتا تھا۔  
اس کے قدم ٹمکنے لگے۔ وہ سب دھک کی طرح چل پڑا کہ کہیں وہ بھی نہ مارا جائے  
اندھیرے میں اس نے اپنا تک دیکھا کہ کوئی لنگھاتا ہوا اس طرف آ رہا ہے وہ آگ  
پڑھا۔ دیکھا تو وہ احمد خان تھا۔

احمد خان نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ غلام محمد نے کہا کہ میں خود حیران  
ہوں کہ کیا ہوا ہے۔ اب غلام محمد نے سوچا کہ احمد خان کو وہ خود انٹیلیجنس کے  
حوالے کرے لیکن چوٹی لال اس کے آدمیوں کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں۔ اس  
کے دماغ میں ایک سیم آئی۔ اس نے احمد خان کو ساٹھا لیا۔ لیکن احمد خان چلنے  
کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ احمد خان نے پوچھا اب  
کہاں کا مارا رہا ہے؟ غلام محمد نے جواب دیا کہ میرا فرض ہے کہ تمہیں واپس بھیج دوں  
لیکن غلام محمد کی سہیت کچھ اور تھی۔ وہ اس علاقے سے واقف تھا۔ میل ٹیڑھ میل



اخراج۔ بڑھیا کی زبان رطاب ہو گئی۔ جیسے اس کا ٹکا ہوا غبار بے قابو ہو کر نکل رہا  
 دن کہنے لگی "میں وہ وقت ساری عمر نہیں بھول سکوں گی۔ میں اس کا دن  
 اپنے والی نہیں۔ یہاں سے گیا وہ بامہر مسل و درگورنہ پورہ کی رہنے والی  
 تھی۔"

غلام محمد یہ نام سن کر ذرا سا ہونکا جیسے اسے کوئی بڑی پرانی بات یاد آگئی  
 کہنے لگا۔ گو بند پورہ کچھ یاد آتا ہے۔ لیکن بڑھیا نے اس کی بات پر دھیان  
 دیا اور اپنی سناتی چلی گئی۔

مذرت کا وقت تھا کہ میرے گاؤں پر قباحت ٹوٹ پڑی۔ سکھوں نے حملہ کر  
 با تھا۔ مسلمان ایک تو سوئے ہوئے دوسرے غصے اور تیسیرے تعداد مختصر ڈریا  
 کر رہے تھے۔ جس کا جدھر منہ آیا بھاگ اٹھا۔ سکھوں نے کسی کو بچا گئے نہ دیا۔  
 بھینس اور کرپاؤں سے کاٹتے چلے گئے۔ بچوں کو انہوں نے نہ بچنا۔ دودھ  
 پیتے بچوں کو ماڈوں کی گولیوں سے چھینا اور بھینسوں کی آٹوں میں اڑھس کر قہقہے لگائے۔  
 ہان اڑھسوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر گئے گئے۔ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔  
 میں نے بعد میں سنا تھا کہ کچھ مسلمان لڑکیاں اپنی مصیبتیں بیان کرنے کے لیے کنوڑ میں  
 کورنگی تھیں۔ بعض نے اپنے آپ کو اپنے جلے ہوئے مکانوں کے شعلوں کی نذر  
 کر دیا تھا۔ لیکن ایسی خوش قسمت کم ہی تھیں۔ زیادہ تر کو سکھ آٹھا لے  
 گئے تھے۔

"یہ تو سیکھ لو کہ سکھوں کا حملہ تھا۔ جو رات کو رہا۔ دن کے وقت میرے پردوں  
 کی ایک نوجوان لڑکی جس کا نام ہنیہ تھا۔ گاؤں سے نکلی تو دن دھاڑے سکھوں نے  
 اٹھال۔ مسلمان چھینے پھالتے رہ گئے۔ سکھ لڑکی کو لے گئے۔"

غلام محمد یوں چونکا جیسے اسے کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ دیا ہو۔ گھبراٹے  
 ہوئے سے لیے میں بول رہا۔ "آقاں جی! آپ نے کیا نام بتایا ہے۔ رضیہ۔"

"ہاں جیسے۔ میں اس کا نام کبھی نہیں بھول سکتی۔ بڑھیا نے کہا۔ "بے چاری کا

پاکستان میں کے ساتھ نکل آیا تو چوڑی لال کے آدھیروں نے ہم پر فائرنگ کی۔ دونوں  
 پاکستانی بھاگ نکلے۔ چوڑی لال الگ غائب ہو گیا۔ میں ساری رات پاکستانیوں کو  
 ڈھونڈتا رہا۔ ان میں سے ایک زخمی حالت میں پڑا تھا۔ دوسرا نہ ملا۔ وہ قید بھاگ گیا  
 ہے۔ زخمی کو میں ایک جگہ چھپا آیا اور وہ میں اسے اپنے ساتھ اس لیے نہیں لایا کہ  
 چھریوں چوڑی لال راستے میں مر جائے جو ہمارے۔ میں اتنی شکل سے ہونا چاہتا تھا کہ  
 ہوں۔ وہ چوڑی لال کے کھاتے میں کیوں ڈالوں۔

ہندو کہیں غلام محمد کی بات مان گئے اس نے چوڑی لال کو درد چار گایاں بھی  
 دیں اور کہنے لگا کہ میں تمہارے سامنے چوڑی لال کو جوڑنے والوں کا نام اس  
 کو کھ لے آؤ۔

غلام محمد خائفانہ لہجہ میں چاہا جو وہاں سے ٹہپٹیں تھیں پائریل و درختی جہب  
 وہ خائفانہ پہنچا تو صبح کی سفیدی صاف ہو چکی تھی۔ وہ ستروں کے کوٹھے میں داخل ہوا  
 تو وہاں ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی اور احمد خان پائے پا رہا تھا۔ اس کے آگے  
 کئی روٹی بھی رکھی تھی۔ یہ ستروں کا انتظام تھا۔ اس نے احمد خان کے لیے ناشتہ  
 اپنے گھر سے منگوایا تھا۔

غلام محمد اس بڑھیا کے جانے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے کہا کہ یہ لڑکا  
 بتاتا نہیں کہ یہ کس طرح زخمی ہوا ہے۔

"اماں جی! کیا بتائیں؟" غلام محمد نے مایوسی کے عالم میں کہا اور ایک گاؤں  
 کا نام لے کر بولا "ہم دونوں بھائی رات کو ایک ماتم پر گئی گاؤں جا رہے تھے  
 راستے میں سکھوں نے جو شراب پیتے ہوئے تھے ہم سے پوچھا کہ کون ہو؟ ہم نے  
 بتایا کہ ہم مسلمان ہیں تو ایک سکھ نے قہقہہ لگایا اور سبوں نکل کر گولی فائر کر دی اور  
 اسے زخمی کر کے ہٹے ہوئے چلے گئے۔"

بڑھیا نے لمبی آہ بھری اور کہنے لگی کہ یہاں ہار نہ زندگی ہے ہی کیا۔ جیسے کبھی  
 ماری ایسے یہاں مسلمان کو مار دیتے ہیں۔ تمہارا دن وقت یاد ہو گا۔ جب ملک تقسیم



لے لیں محسوس ہوا جیسے کوئی دکھ اور غم نہیں رہا۔ ایسی باتوں کو چھوڑ دو۔ یہ بھی بات ہے انہوں نے مجھے چوکس پلا دی تھی، اس کے سوا علاج ہی کیا تھا۔۔۔۔۔

”ایک سال گزرا تو میں نے یہ قبول کر لیا کہ اب میری یہی زندگی ہے۔ میرا ایک بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے چوکس چھوڑ دی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا خاندان ہلکا ہی ہے۔ لیکن مسلمان تو بچے سکھ نہیں ہے۔ مگر بیٹے، گھر بیٹے، گونہ بند میرے دل سے اُترا نہیں۔ رضیہ کو میں بھول نہیں سکتی۔ میں اس رات کو نہیں بھلا سکتی۔ جیسے دل ہر طرح مطمئن رہتا ہے۔ لیکن ایک کانٹا سا دل میں جھکا رہتا ہے کہ مسلمان اپنی عزت فیرت کو کیوں بھول گئے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ پاکستانیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے ان پڑھ چوسلیوں، بھنگیوں میں عمر گزار دی ہے۔ حکومتوں کے معاملے حکومت کرنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ میں اتنا کہتی ہوئی کہ مسلمان کو اپنی عزت اپنی غیرت چھٹی نہیں چاہیے۔ ان سے تو وہ غیرت والی نہیں۔ جو کوڑوں اور شکنوں میں گور گئیں۔ میں بھی کوڑوں میں ہی گور گئی تھی۔ سمجھو کہ ایک منگ کا پانا خداوند بنا لیا اور خوش ہوئی کہ جلد مسلمان ہے سکھ نہیں“

پڑھیا نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ غلام محمد نے اپنا مک کہا۔ ”اٹھو اور چلا“

”ہیں فوراً جانا ہے“

اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہوئی تھی کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ دن دھاڑے دشمن کے علاقے سے نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ موت اور عورت موت۔ اس نے احمد خان کو کندھے پر ڈالا اور باہر نکلا اور اندھا دھند مسجد کی طرف چل پڑا۔ سب سے بڑا خطہ جو اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ دو آدمیوں کی صورت میں تھا جو ہندو کیڈین نے اس طرف بھیجے تھے کہ جا کر دیکھو گا آیا کیوں نہیں؟ وہ ایک زخمی کو لے رہا ہے۔ آخر مسلمان ہے۔ دھوکہ نہ دے جائے۔

سمرھدیلی ڈیڑھ میل دودرہ گئی تھی۔ غلام محمد ایک جوان آدمی کے بوجھ سے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دودرہ پیچھے سے آئے لٹکا رہا تھا۔ کوئی اسے روکنے کے لیے

کوئی بڑا بھائی گھر نہیں تھا اسے آگے بڑھ کر چھوڑا۔ اچھٹا سا ایک بی بھائی تھا۔ اس کا بھی نام یاد ہے۔ غلام محمد خام تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ اپنے دروازہ میں کھڑا اپنی بہن کے لیے بک بک کر رہا تھا۔ اس پر ترس کھانے والا کوئی نہ تھا۔ بے چاروں کا باپ اندر بیٹا رہا تھا اور بھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جا کر دیکھا وہ مر رہا تھا۔ بیٹی کے صدمے سے مر گیا تھا۔ اس رات حملہ ہوا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میری قسمت اچھی یا بری۔ میں انہی شعلوں میں سے اٹھو چھو و پکار میں سے اور ان سکھوں کی دزدوں میں سے زندہ سلامت نکل آئی۔

”میں اندھیرے میں دوڑتی چلی گئی۔ گری اٹھی پھر دوڑی اور پھر اس وقت خدا کے دروازے پر ایسی گری کر اٹھ کر سکی۔ صبح ان منگوں نے مجھے اٹھایا۔ مجھے پریم بے ہوشی طاری تھی اور اس کو کھٹے میں چارپائی کے نیچے انہوں نے مجھے پھینک دیا۔

صبح ہونے کو باہر سے مجھے آوازیں سنائی دیں۔ ”او منگو! دیال کوئی مسلمان تو انہیں چھو۔ ایک منگ نے کہا۔“ خلاصہ جی، ہم کہاں کے مسلمان ہیں کہ ہمارا پاس کوئی چھینے آئے گا۔ ہمارا دین مذہب تو چوکس اور بھنگ ہے، سکھ چلے گئے۔۔۔۔۔

”مجھے معلوم نہیں وہ قیامت کس طرح آئی اور کس طرح چلی گئی اور کتنے دن بیت گئے۔ میں حیران ہوں ان منگوں پر جو کہتے تھے کہ چوکس اور بھنگ ہمارا مذہب ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی لڑکی سمجھ کر چھپائے رکھا۔ کھانے کو دیتے رہے اور کچھ عرصہ بعد انہوں نے میری رضا مندی سے ایک آدمی کے ساتھ ساتھ دیا۔ میں پاگوں کی طرح اٹھ کر بھاگی تھی کہ میں اپنا گونہ بند پورہ دیکھوں گی اور یہ لوگ مجھے کہتے تھے کہ وہ ہاں اب اکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہ گیا اور اس را کھ کے نیچے تمہارے خاندان کی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن میرے پاگل پی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک دن ایک بوڑھے منگ نے مجھے حقے کا کش گوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد



سے گزر گئی تھیں۔ اسے اٹھانے لگے تو اس نے کہا۔ ”نہیں، میں اب جا رہی ہوں۔“

گرٹا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں پاک مٹی میں اکڑ کر رہا ہوں۔“

اُس نے احمد خان کو لٹ دیکھا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے احمد خان سے کہا: ”احمد، تم نے اس بڑھیا کی کہانی سنی تھی نا۔ اس نے جس ضمیر کا نام لیا تھا

وہ میری بہن تھی اور جو چھوٹا سا غلام محمد دروازے میں کھڑا اپنی بہن کے لیے بالک

بک کر رہا تھا۔ وہ کہیں تھا۔ مجھے اس بڑھیا کی جوانی یاد ہے۔ اس نے میری نیت

کر بیدار کر دیا ہے۔ میں تو اپنا ایمان پیچ چکا تھا۔ تمہیں میں بھارتی ایشیا جنس کے حوالے

کرتے جا رہا تھا۔ اچھا ہو اٹھا اس نے بڑھیا کو پیچ دیا اور اچھا ہوا کہ میں مر رہا ہوں۔ ایمان

پیچے والوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ لیکن میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اب شاید یہ

میرے گناہ معاف کر دے اور میری جان کا فائدہ قبول کر لے۔ بڑھیا نے پوچھا تھا کہ

مسلمانوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔

احمد خان نے غیرت مراد نہیں کرتی، غیرت کو کوئی جگہ نہ دلاتا تو ہوتا اور اس کا

آنکھیں پتھر آگئیں۔

کہہ رہا تھا۔ وہ اور تیرنہ دوڑنے لگا۔ احمد خان نے اسے کہا کہ اتنا تیرنہ دوڑو

پڑو گے۔ احمد خان نے بھی کہا کہ شوک جاؤ۔ میں جینے کی کوشش کرتا ہوں۔

غلام محمد نے غصے سے کہا: ”نہیں، خاموش رہو احمد خان، مجھے چاہیے

دونوں“

انہیں اب اپنی ایک سرحدی چوکی نظر آنے لگی تھی۔ پیچھے سے پھر ملکا

سنائی دیتی تھی۔ ”شوکت جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے۔“ وہاں کچھ کھڈا نالے بھی تھے

زمین اونچی پٹی تھی۔ جس نے غلام محمد کی خاموشی مدد کی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے غلام

میں کوئی مافوق الطبیعت قوت خود کو دکھائی ہو رہا ہے۔ وہ اپنا دماغی توازن کمزور بیٹھا ہو۔

وہ تو وہ غلامی بچہ تھا، لیکن وہ پاکستان کے راستے پر دوڑا آ رہا تھا۔

ایک خشک برساتی نالے سے اوپر چڑھتا تھا سے اپنے ہاتھ زمین پر پڑے

اور پر کا کرچیب اس نے سانس دیکھا تو اپنی سرحدی چوکی وہاں تھری پر نظر آ رہی تھی

لیکن پیچھے سے تین چار گولیاں اکٹھی فائر ہوئیں۔

احمد خان نے اس سے پوچھا: ”غلام محمد، تم ٹھیک تو ہو۔ گولی تو نہیں لگی؟“

”نہیں۔ نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ گولی نہیں تو نہیں لگی۔“ غلام محمد بولا۔

پیچھے سے شاید اور گولیاں بھی آئیں۔ کسی عذاباتی ریچر نے جس نے انہیں پہچان

لیا تھا۔ احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس طرف ایک دو ٹوٹا فائر کر دیا

اس سے غلام محمد اپنے عقیب کے خطرے سے محذور ہو گیا۔ غلام محمد کرچیب چوکا

کے قریب پہنچا تو اس کے قدم اڑ کھڑا لے گئے۔ وہ پتھر بھی پھینکا گیا اور چوکی سے چند

گزر کے فاصلے پر پہنچ کر منہ کے بل گر۔

احمد خان ایک طرف ٹوٹھک گیا۔ وہ اپنی سرحد میں داخل ہو چکے تھے تین چار

پاکستانی ریجنلرز دوڑ رہے آئے ایک ہوا لار نے غلام محمد کو پہچان لیا۔ دیکھا گیا تو

اس کے تمام کرچیبے خون میں بھیگ رہے تھے۔ دو لڑکے گولیاں اس کے کوسوں میں



تھی۔ اُسے بی۔ ایڈ کی ڈگری کی بدولت ————— ایک سرکاری سکول میں ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ تھوڑی تھی۔ ذمہ داریاں زیادہ تھیں۔ اُس نے دو تین طلباء کی ٹیوشن رکھ لی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد سکول کی نوکری سے اُس کا دل بیڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ایک ماسٹر نے بیس بیس ٹیوشنیں رکھی ہوئی ہیں۔ کلاسوں میں بس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ وہ کوئی ڈھکاکٹھا محاضرات نہیں۔ بچوں کو زبردستی ٹیوشن پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ کاروبار بن گیا تھا کہ جن بچوں کی ٹیوشن رکھی جاتی ہے انہیں مل ملا کر پاس بھی کر دیا جاتا ہے۔

اس ماسٹر نے جسے میں اصلی نام کے بی۔ بی۔ نے زیر لکھوں گا۔ اس کا دوبارہ سے دامن بچائے رکھا۔ لیکن اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ کاروبار ناجائز اور غیر قانونی بھی ہے، لیکن سکول بچوں کو قبل تنخواہ اور ہوشروہ اگر ان کی نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اور انہیں بچائیوں سے بچانے رکھنے اور اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے اُسے سیدھے ماتحت ماریں۔ زیر کرنے پاؤں اتنے ہی تھیلے جتنی خدا نے اُسے چادر دی تھی۔ لیکن پاؤں لمبے اور چادر چھوٹی ہو گئی تھی۔ ماں باپ نے لہیر کی شادی صرف اس بنا پر کر دی کہ لڑکا ملازم ہو گیا ہے۔ برادری میں کوئی یہ نہ کہنے کو انہیں کسی نے رشتہ نہیں دیا۔ دو بہنیں شادی کے قابل تھیں۔ جن کے رشتے طے ہو چکے تھے۔ لیکن رشتے طے ہونے سے شادی نہیں ہو جاتی تھی۔ بہن کا پہاڑ جیسا مسئلہ سر پر اٹھا تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ اپنا مکان چلی ڈالیں۔

لوکبھوں کی عمر بڑھتی جاتی زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ چھوٹی چندرہ سال کی اور لڑکی سترو سال کی تھی، لیکن رواج کے مطابق بھائیوں کی شادی بہنوں سے خالص ہو کر کی جاتی ہے۔ زیر پر اب یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ برادری طعنے دے گی کہ اُس نے بہنوں کا خیال نہ کیا اور اپنا بیواہ رہا لیا۔ اُس وقت تک زیر نے دیا تھوڑی

## جب بہن نے دھتکارا

کہا نفی سنانے والے صاحب نے مجھے کہا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس خاتون کو اس کے خاوند کو دیکھ لوں اور ان کے پردیسیوں سے پوچھ لوں کہ ان کی ازدواجی زندگی کس طرح گزر رہی ہے اور خدا نے کہاں کا تیر کس مٹی سے جا لایا ہے۔ میں اُن کے ساتھ اُس قصبے میں چلا گیا۔ جہاں یہ میاں بیوی رہتے ہیں۔ میں نے انہیں دوسرے دیکھا۔ اُن کے دو بچوں کو بھی دیکھا۔ کہا تھی کہ مرنے والے صاحب نے مجھے اپنے گھر بٹھلایا اور ایک صاحب کو بلا لائے۔ پھر جہاں تک تصدیقی کی ضرورت تھی۔ وہ میں نے نہ کر لی۔ معلوم ہوا کہ اپنے معاشرے کی یہ بولہاں تھے سالہا گئی ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ قدرت کا یہ مظاہرہ سب نے دیکھا کہ یہ خاتون جیسے بی اُس کے اصلی نام کے بجائے راشدہ لکھوں گا کس طرح دولت کے زور پر آسمان تاں پس چلی اور دولت ہی نے اُسے زمین پر پہنچا دیا۔

یہ ایک خاندان کی کہانی ہے جو ہمارے پورے معاشرے کی حکایت کرتی ہے۔ ایک باپ تھا جو بڑی مشکل سے روٹی چلاتا تھا۔ خدا نے اُسے دو بیٹیاں دیں۔ کرمزیا سخاں میں ڈال دیا اور بیٹیاں ایک ہی دیا۔ اُس نے اپنی امتیاز اور اپنی بیٹیوں کا مستقبل اپنے بیٹے کے ساتھ والیہ کر دیا۔ بیٹے کو اُس نے پیٹ باندھ کر تعلیم دلائی۔ محنت مزدوری اتنی کی کہ اُس کی کردہری ہو گئی۔ بیٹا تھوڑی تھلا اور دیا تھلا رہی۔ اُس نے بی۔ اے کر لیا اور تین چار ٹیوشنیں لکھ کر ان کی آمدنی سے بی ایڈ بھی کر لیا۔ مگر اُس نے اپنا آپ کو جس قیمت پر بیلا کر لیا۔ وہ بہت تھوڑی



لوگوں سے پیدا ہو گئی۔ ان میں ایک دو آدمی ایسے بھی تھے جو اُسے بیرون ملک بھجوا سکتے تھے۔ اُس وقت تک پٹرولروں پاکستانی باہر جانے کے اور باہر سے پیسہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ دو آدمی زبیر کی بلوری کے بھی تھے۔ جن کے ہاں ماڈرن بھی بڑی مشکل سے پتی تھی۔ لیکن اب ان کے گھروں کے آگے کسی نہ کسی تقریب کے سامنے دیکھیں چڑھی جاتی تھیں۔

زبیر کے بھی دن بھر گئے۔ اُسے ان نوروں و رخ والے واقعات کا دل سے ایک عرب ملک میں لو کر دی دلا کر بھجوا دیا۔ دن تو بھر گئے۔ لیکن تیل کا موسم دیکھ کر زبیر کے گھر والوں کے دماغ بھی پھر گئے۔ یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ زبیر کتنی رقم گھر بھینچا ہے۔ اس کا اندازہ زبیر کی بیوی اور اُس کی دونوں بہنوں کے نت نئے کپڑوں اور غوروں و فائش کے اوچے طرہیزوں سے ہوتا تھا۔ ایک سال بعد زبیر مزیدہ دلوں کی پھٹی آیا۔ اُس کے ساتھ بے شمار سامان تھا۔ یہ چیزیں درپردہ فروخت ہوئیں۔ زبیر کے گھر کی حالت ایسی ہو گئی کہ اُسے امیر گھرانہ کہا جانے لگا۔

چھڑا بیٹا گیا کہ نین سال گزار گئے لیکن وہ نہ بولتا۔ ان تین برسوں میں زبیر کے گھر میں انقلاب اُٹ گیا۔ پیسہ بے اندازہ آتا رہا اور اسی رفتار سے زبیر کی بیوی اور بہنوں کا اخلاق اور کردار بھی بگڑنے لگا۔ زبیر کے والدین سے صورت اتنا پتہ چلا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے چھٹی نہیں لیتا۔ والدین سے پریشانی تھی۔ کہہ نہ سکتے تھے کہ ان کی ہوا نہیں بالکل غلط نہیں لاتی تھی۔ اُس نے اب یہ دلچیز اختیار کر لیا کہ میک اپ کے برسوں آٹھ کر لوری کے دو چار گھروں میں گھر چھڑاتا اور شام کو کمرہ پہنچے۔ یہ نکل جاتی۔

گھر میں دو لوگوں کا جواں تھا۔ وہ بھی اپنی بھائی کے نفیس قدم پر میل ڈرتی۔ اور اُس سے بڑھ کر شہو باز نہ ہوتا۔ موتوں۔ ماں باپ کی نوکونی کیفیت ہی نہیں رہ سکتی۔ محلہ نے مکان کی برت کر دانی گئی اور محلے کے ساتھ ہی ایک خالی گھر خرید

اور صلاح کی کمائی کا واسطہ نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن چار میلہ لڑائی کی مڈیا کے حکم و رواج ذمہ دار لڑائی اور نمائش پسندی میں وہ اس طرح گھبر گیا جیسے وہ میدان لڑائی و لڑائی ایک نئے پیرے مٹھا بتا جا رہا ہو اور اس کی کوشتش میں ہو کہ اس پر پانی کے پھیلتے۔ پڑی۔ آخر جو بیلوں نے اُسے لڑا ہے پڑا لڑا دیا۔ جتنا محنت اور دیانتداری پہنچی تھی چیزیں بن کر رہ جاتی ہیں مگر ایک سال گزرا ہے کہ اب اُسے اس کے راکھ کچھ بھی حاصل نہ ہوا کہ پہلے وہاں بھٹتے ہیں ایک آواز مرتبہ کوشتش کہتا تھا۔ اب ہر روز سڑے دن کوشتش کہنے لگا۔ غمی شادی اور رختے وغیرہ یہاں یہ لوگ لاپرا روپے دیتے تھے اب اکس اور کیا دن دینے لگے۔ بہنوں کے بہنیز دہلی کے وہیں رہ گئے۔ البتہ برادری میں کچھ تنہیت بن گئی اور ان کی آؤ بھگست ہونے لگی۔

زبیر کی ایک پڑوسی یہ بھی ہوئی کہ اُسے جو بیوی ملی اُس میں بن بھن کر کسے کی بھی عادت تھی اور

بھی زیادہ تھی۔ وہ کسی اسپر کیڑے گھرنے کی بلوکی بھی نہیں تھی۔ دریا سے دریا سے بھٹے بھی کچھ دم دے کے گھرنے کی بلوکی تھی۔ ایسے گھرانوں میں خود بھروسہ کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اُس بلوکی نے اُس قسم کی محرومیوں کو شام کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ جب غارت گرد کی آمدنی میں بالائی آمدنی کا بھی اضافہ ہو گیا تو اُس نے یہ پیسے آٹے دن کپڑے سلوا لئے اور بنا دس گھانڈا کر کے شہر و رخ کر لیا۔ یہاں ہشتادویں پر ملائیاں دیتے ہیں بھی وہ خاصی فیاصل تھی۔ اُسے اپنے خاندان کی ہونٹوں کی شادیوں کا کوئی حکم نہ تھا۔ زبیر کو ابھی بیوی کی یہ غلط عادتیں بڑی نہیں لگتی تھیں۔

زبیر نے بیوی کو ان ناروا خواہات سے منع کیا۔ لیکن یہ محسوس کیا کہ اس کے جو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے اپنے دین و ایمان کو کرک کر دیا تھا وہ وہاں کی توں پڑی ہیں۔ حرام کی کمائی کے میدان میں اُس کی ماہ و دھم طرح طرح کے



بہنوں کے رشتے نہیں دینا چاہتا۔ اس نے لکھا کہ برادری میں اسے کوئی ایسا خاندان نظر نہیں آتا۔ جو مالی لحاظ سے اسے ان کی برابر ہی کر سکے۔ لہذا رشتہ اس لڑکے کو دیا جائے گا جو باہر کے کسی ملک میں ملازم ہو۔

حقیقت یہ تھی کہ جن گھروں میں ان دونوں لوگوں کے رشتے طے ہوئے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی یہ تقاضا نہیں کیا تھا کہ شادیاں جلد ہی ہوں۔ وہ تو برادری کی پابندیوں کی وجہ سے چپ تھے۔ ورنہ وہ ان لوگوں کو قبول کرنے کو بھی تیار نہ تھے کیونکہ لوگ ان شریف گھرانوں کے قابل نہیں رہی تھیں۔ انہیں جب زیر کی طرف سے جواب ملا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

انہو بڑی لڑکی کے لیے جسے آپ عارف کہہ لیں، ویسا ہی ایک لڑکا مل گیا۔ جیسا زیر چاہتا تھا۔ وہ کسی عرب ملک میں ہی ملازم تھا۔ زیر حیدر دونوں کی چھٹی لے کر آیا۔ دونوں طرف باہر کا پسیر تھا۔ شادی ایسی ہوئی کہ لوگوں نے انگلیاں منہ میں دے لیں۔ نوٹ رڈی کا غنوں کی طرح پھینکے گئے۔ شادی ہوئی اور عارف چند دنوں بعد اپنے دو لہما کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی۔ زیر کی بیوی چلے پھر نے میں خاصی شرمور ہو گئی۔ اس کے ساتھ دوستی لگانے کے لیے کار اور سب سے اونچے پیر پیار کے ہوٹل میں کھانا لازمی تھا۔ زیر کے والدین نے یہ کمال کر دکھایا کہ چھوٹی لڑکی کو اپنی خیروں میں باندھ لیا۔ بدنام تو وہ بھی بہت ہوئی تھی لیکن جلد ہی سنبھل گئی۔

بمشکل ڈیڑھ سال گزرا کہ عارف باہر سے اکیلے واپس آ گئی۔ سب نے دیکھا کہ وہ اپنے سسرال ختوری سی دیر کو بھی نہ گئی۔ سب نے یہ بھی دیکھا وہ تقریباً خالی ہاتھ واپس آئی اور وہ کچھ بھی سی نظر آ رہی تھی۔ پانچ سات دنوں بعد عارف کے سسرال نے یہ خبر ساری برادری اور محلے کو دے دی کہ ان کے بیٹے نے عارف کو طلاق دے دی ہے پھر ساری بات کھل کر سامنے آ گئی۔ یہ قصہ کچھ اس طرح ہوا کہ عارف کے خاندان کی ملازمت اس قسم کی تھی کہ وہ

اس پر نئی لڑکا دو منزلہ مکان بنایا گیا۔

یہ ماڈرن اور بڑا شہر تھا، جہاں بڑے بڑے کھلاڑی ہو جود تھے۔ ان میں سے ایک نے زیر کی بیوی کو اپنی کار میں لفظ دینی شروش کر دی۔ کار اور شراب کا نشہ ایک سا ہوتا ہے۔ پلاٹ کار کا نشہ زیر کی بیوی کو چڑھ گیا۔ پھر لوگوں نے جو تماشے دیکھے وہ بیان سے باہر ہیں۔ مختصر یہ کہ زیر کی بیوی بد چلتی اور ذہنی ہیستردی کے فراق کو بھول گئی۔ جن باتوں پر غیرت مند لوگ دوسروں کے سر کھول دیتے یا اپنا سر پھوٹ لیتے ہیں۔ ان پر زیر کی بیوی ادھر نہیں فخر محسوس کرنے لگیں۔

زیر تیرہن سال بعد نیدرہ ہٹیں دونوں کے لیے آیا۔ اگلے روز سامان سے لدا ہوا ایک ٹرک ان کے گھر کے سامنے آڑکا۔ جس برادری میں وہ کم مائیگی کی وجہ سے دب کر رہتا تھا۔ اب اس برادری میں یوں آٹھے بیٹھے لگا۔ جیسے کوئی سپر و مرشد ددرے پسایا ہو۔ لوگوں کو توقع تھی کہ وہ اپنی بہنوں کی شادی کر کے چائے گا۔ لیکن ٹرک میں جو سامان آیا تھا۔ وہ بیچ بٹا کر چلا گیا۔ یوں سمجھیں کہ زیر اس مقام پر جا پہنچا تھا۔ جہاں پسیر دھرم ایما بن جاتا ہے اور اخلاقی قدریں دھور پیچھے کہیں رہ جاتی ہیں۔ اس کی بیوی اچھی خاصی خوبصورت تھی۔ اس کے خیالات میں ذرا سی بھی گہرائی نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں عورت جسم تھا۔ جسم کی زیبائش، جسم کی فطری ضرورت، اس اخلاقی کیفیت میں خاوند اور خاندان کی عزت اور کہو بے معنی سی چیز بن کر جاتی ہیں۔

زیر کے باپ نے برادری کے ایک دو بزرگوں سے بات کی کہ اس کے بہو اور بیٹے کو اس کی بیٹیوں کے بیاہ شادی کی کوئی گہرائی نہیں چپ کہ وہ خود بیٹیوں کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ بزرگوں کے کہنے پر زیر کے باپ نے اُسے خط لکھا کہ لوگوں کے رشتے کبھی کے طے ہو چکے ہیں اور وہ لوگ اتفاقاً کر رہے ہیں کہ شادیاں جلد ہی ہو جانی چاہئیں۔ زیر کا جواب آیا کہ وہ برادری میں اپنی



کر پولیس کے مخبروں کی پورٹوں کے مطابق عارف نے بیک وقت تین آدمیوں کے ساتھ تاجپانہ مدرسم قائم کر رکھے تھے۔ اُسے حوالات میں بند کر کے اُس کے حالات مقدمہ نمٹا کر دیا گیا۔ ان ملکوں میں اُس قسم کے مقامات کے فیصلے بہت جلدی کر دیے جاتے ہیں۔

اسی طرح نئے قید خانے کے رکھنا بدکردار جاتا ہے عارف کو بھی عریضوں نے چھڑنا ہرگز نہ قید رہی اور اُس کا سپورٹ دیگر مضبوط کر دیا۔ سرائیں یہ بھی شامل گرفتار کر لے کر اسے ملک بدر کر دیا گیا۔

عارف چوہدری سرائے قید خانے کے کڑواں کی پولیس کی نگرانی میں واپس پاکستان پہنچ دی گئی۔ اُس کے چھپے چھپے ملاقات نامہ بھی پہنچ گیا۔ عارف نے کچھ دن تک سنا یا پھر وہ بھائی کے ماتھے پر چل پڑی۔ برادری میں اب اُسے کوئی بھی جوار کر کے نہ پاز نہیں تھا۔ اُس کے سابقہ مشرک اُس نے اُس کی برکاری کی کہانیاں سارے شہر میں پھیلا دیں۔ لوگ اب بھی جوان تھی اور خدا نے اُسے سُن سے بھی نوازا تھا۔ اُس کی دوسری شادی ہو سکتی تھی۔ لیکن اُس کے سابقہ مشرک اُس نے اعلان کیا کہ ہاں میں بھی اُس لوگ کا رشتہ ہوا وہ وہاں جا کر لوگ کی اصلیت بتا دیں گے۔

زیر اور اُس کے والدین پر یہ عجب ایسی کاری پڑی کہ چھوٹی بہن کی شادی اس نے وقت انہوں نے یہ پابندی ہٹا دی کہ لوگ ملک سے باہر ملازم ہو چھوٹی بہن بیٹے ہی بھول چکی تھی اور برادری میں اُس کی نیابت نامی مشہور ہو چکی تھی۔ اُس کی شادی داہجی سے طرے سے کر دی گئی۔ لوگ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگ کی کسرال جاتے جہاں لوگوں میں گھل مل گئی۔ اُس نے ایسا انڈلرز بنایا کہ لیکر ظاہر ملک نہ جھونے دیا کہ وہ اسی کیسٹ گھرانے سے آئی ہے۔ وہ اپنی

میتے میں بیٹکل مودن اپنے گھر رہ سکتا تھا۔ باقی دن اور آدیں اُسے گھر سے دور "سائٹ" پر گزارنی پڑتی تھیں۔ اُسے ایک دورست نے بتایا کہ وہ اپنی ڈیوٹی تبدیل کر دے گی کوکوشش کرے یا اپنی بیوی کو پاکستان بھیج دے۔ دوست نے دہریہ بتائی کہ ایک پاکستانی کبھی بھی رات کو اُس کے گھر میں جاتے اور خامنی در پر بعد برآمد ہوتے دیکھا گیا ہے۔

خاندان نے اپنے اس دورست سے کہا کہ وہ اُس کے گھر پر نظر رکھے اور جب کبھی وہ آدمی اُس کے گھر میں داخل ہوا وہ اُسے ٹیلیفون پر اطلاع کرے تین چار روز بعد اُسے اطلاع ملی کہیں یہ اطلاع اُس کے دورست کی نہیں تھی۔ بلکہ پولیس اسٹیشن سے بلا دیا تھا۔ کبھی کے دفتر سے اُسے جانے کی اجازت مل گئی۔ ٹیلیفون پر اُسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا کہ اُسے کسیراں پایا گیا ہے رات کا وقت تھا۔ وہ کبھی کی گاڑی پر شرمیں آیا اور رختا نے چلا گیا۔ وہاں اُس نے اپنی بیوی کو دیکھا پھر پولیس کی حراست میں بیٹھی تھی۔

رختا نے کے اخبار سے اُسے بتایا کہ بہت دنوں سے اُس کی بیوی کی پولیس بل رہی تھیں کہ اُس کے پاس رات کو غلط آدمی جاتے ہیں اور اُسے اُن کی آگے کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہے۔ وہ کوئی پاکستانی تھا جو رختا نے کی حوالہ میں بند تھا۔

"کیا تمہاری بیوی یہ پیشہ تمہارے کھنچ پر چلا رہی ہے؟" رختا نے کے اخبار سے کے عارف کے خاندان سے پوچھا۔ "یہ میں علم ہی نہیں کر تمہارے گھر میں تمہاری غیر حاضری میں کیا ہوتا ہے؟"

عارف کا خاندان جل اٹھا۔ اسے بہت غصہ آیا۔ لیکن وہ پولیس پر غصہ نہیں نکال سکتا تھا۔ اُس کے نسوٹوں آئے۔ اُس نے بیوی کی ذرا سی بھی دکالت نہ کی۔ اُس نے پولیس آفسیروں کو بچے صحت الفاظ میں بتایا کہ وہ اس لوگ کے ساتھ معلوم نہیں کس خیال سے شادی کر بیٹھا تھا۔ یہ لوگ پاکستان میں بھی بدنام تھی۔ مختصر



بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس روز اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کیا ہو گیا ہے؟“ دانی نے اس سے پوچھا۔

”وہ ایسے ہی خیال آگیا ہے کہ میری بھی کیا زندگی ہے؟“ عارفہ نے کہا۔ ”میں کل رات ایک بڑی خوبصورت طواغیت کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ جس پر اسے چاہئے والے سونے چاندی کا مینڈر سارے تھے۔ لیکن اس کی عمر ابھی بیس سال ہوئی تھی کہ اس کے اُمیدوار بچہ پڑنے لگے اور وہ اُن کا لاکھ دیکھتی رہی۔ میں اس موقع میں غرق ہو گئی کہ چند برس بعد میں ان لوگوں کے لیے جو مجھ پیغام بھیجتے ہیں۔ بوری ہو جاؤں گی۔ آج جو میرے پیچھے پھرتے ہیں۔ کل میں انہیں ڈھونڈتی پھروں گی۔“ دانی نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے ساتھ دو چار باتیں کہیں۔

”نہماری باتیں سب تجھے تسلی نہیں دے سکتیں۔“ عارفہ نے آہ بھر کر کہا۔ ”آج میری سگی بہن نے مجھ پر یہ الزام لگا کر مارنے پھرنے سے روک دیا کہ میں اس کے پاس چار پائی پڑھتی تھی، جس پر اس کا خادو بیڑی بٹھا ہوا تھا۔۔۔ خالہ! میرے پاس ابھی بہت کچھ ہے، جوتی ہے، حُسن ہے اور سپر بھی ہے۔ کسی بچے آدمی کے ساتھ میری شادی کرادو۔ ہر کوئی جو مجھے مانتا ہے، اگر مجھے بدنام کرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔ مگر میری سگی بہن نے مجھ پر جو بھڑا الزام لگایا ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ میری بہن کو بھی کچھ پرہیز و سیر نہیں ہے۔“

”عارفہ بیٹی؟“ دانی نے کہا، ”صورت تم ہی نہیں جو جس کی میں رازدار ہوں۔“

پرسینے میں گھوگر کے راز کھفہ ظاہر ہیں۔ ”نہماریے متعلق دو سرے گھوگر ہیں جو بائیں ہوتی ہیں۔ وہ مجھ سے سن لو لیکن کیا کر دو گی سن کر۔ میں تمہیں سپر بھی بتا سکتی ہوں۔ تمہیں جو کوئی قبول کرے گا۔ وہ حضور ہی سی دیر کے لیے کرے گا۔ اگر تم کسی کی بوی بن گئی کہیں تو دو چار دولہا ہی میں تمہاری یہ کمائیاں تمہارے سوال تک پہنچ جائیں گی۔ یہ تو میں بھی کہوں گی کہ تمہاری بخت صورت شادی میں ہے، لیکن تم خود چاہتی ہو کہ تمہاری شادی ہو سکے گی یا نہیں۔“

اصحیت میں والین علی گئی۔

عارفہ اس کے گھر اکثر جایا کرتی تھی، رشتہ ہے کہ شاہدہ اسے پرے کاموں سے روکتی تھی۔ پھر شہر چلا کر دونوں بہنوں میں لڑائی چھلگوا ہوا ہے۔ کچھ دنوں بعد اس جھگڑے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ عارفہ نے اپنی بہن کے خاندان پر ڈور سے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ یہ چھوٹی بہن کا الزام تھا۔ لیکن اس کی کسی نے یقین نہ کیا۔ کیونکہ شاہدہ کا خاندان شریف انسان تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ خدا کو معلوم ہے۔ ہوا یہ کہ شاہدہ نے عارفہ کو اپنے گھر آنے سے روک دیا۔

ایک وقت تھا کہ ہر محلے میں ایک دانی ہوا کرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی بکری نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہ مران کا آرائی پیشہ تھا۔ ان دائیوں کو اتنا تجربہ ہوتا تھا کہ ان کے ہاتھوں پر کچھ کھولیں گے کھولیں گے اور کوئی پیچیدگی یا خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ آج کل وہ دائیاں دیہات یا کسی قصبے میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ شہروں میں یہ کام ایسی عورتوں نے سنبھال لیا ہے جو خود کو سند یا فتنہ زبیل کہتی ہیں، لیکن ایسی عورتیں نادر ہوتی ہیں نہ دوائی۔ جب سے زمانے نے ترقی کی ہے۔ اکثر دلہنیں اتنی جلدی مائیں نہیں بننا چاہتیں، زمانے کی ترقی نے دوسرا گل یہ کھلایا ہے کہ ہاؤز تعلقات بڑھ گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں غیر قانونی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں جو نذرک میں ہیں نہ دائیاں۔ ان میں سے اکثر درپردہ اسقاط کا دھندہ اپنائے ہوئے ہیں، ان کا طریقہ غیر سائنسی ہوتا ہے۔ جس سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ایسی ہی ایک عورت کو عارفہ نے اپنا راز دان بنا دکھا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ وہ عارفہ کے لیے آشنائی کے پیغام بھی لایا کرتی تھی۔ اس کمائی کا انجام اسی عورت نے رشتہ یا تھا جو کمائی سننے والے سے

کے ذریعے چھٹانک پہنچا۔

جس روز شاہدہ نے عارفہ کو اپنے گھر سے دھتکار دیا۔ اس سے اگلے ہی روز یہ دانی عارفہ کے پاس اس کے ایک خفیہ دوست کا پیغام لائی۔ عارفہ ایسے پیغام



عارف بیٹی! اسے کوئی بھی رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ میرے اپنے دوسرے پار کے رشتہ داروں نے بھی مصائب جواب دے دیا ہے۔" <sup>۱</sup>

"کیوں؟" عارف نے پوچھا، "اس کی تنخواہ تھوڑی ہے یا وہ بد صورت ہے؟"

"تنخواہ اتنی زیادہ تو نہیں لیکن اتنی تھوڑی بھی نہیں کہ کوئی غریب گھر لڑا سے تھوڑی کہے۔" دائی نے کہا۔ "اور وہ بد صورت بھی نہیں۔ اس میں دو چھوٹی ننھاٹیں ہیں ایک یہ کہ اس کی پائیں ٹانگ دائیں سے دو تین انچ چھوٹی ہے اور اس کے پائیں ہاتھ کی انگلیاں ٹیڑھی ہو کر اکڑ گئی ہیں۔ رشتہ دینے والے یہی نفی بنا کر جواب دے دیتے ہیں۔ اگر تم اس کا جسم اور اس کی شکل و صورت دیکھو تو اسے پسند کر دو، لیکن تم شہزادی ہو اور وہ غریب بیوہ کا بیٹا ہے۔ سوچ عارف! میں نے نانا دیکھا ہے۔ لوگوں کو اسے اٹھتے اور گرتے دیکھا ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں قبول کرنے والے بہت ہیں یہی بیوی بنانے والا کوئی نہیں!"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دائی بہت چالاک عورت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دائی نے عارف کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو یا یہ ایک انقلاب تھا یا معجزہ تھا کہ عارف نے دائی کے بیٹے کے ساتھ بڑی خاموشی سے شادی کر لی اور دونوں اس شہر سے غائب ہو گئے۔ دائی نے بعد میں سب کو بتایا۔ یہ معاملہ اس طرح طے ہوا تھا کہ عارف نے دائی سے کہا تھا کہ اس کا بیٹا اس شہر سے کہیں دور لے جائے جہاں وہ اپنا کوئی کاروبار کر لے۔

دائی نے اسے دوسرے کے ایک قصبے کا نام بتایا اور کہا کہ وہاں اس کے عزیز رشتہ دار رہتے ہیں۔ جو اس کے بیٹے کا کاروبار بھی چلاویں گے۔ عارف خاموشی سے اور اپنا زیور سارے گٹھ ملے گئی تھی۔

اس واقعہ کو سات آٹھ سال گزر گئے ہیں۔ عارف نے نیک نام بن کر دکھایا ہے اور اپنے خاندان کو کاروبار میں کامیاب کر دیا ہے۔ اس کے دو بچے بھی ہیں اور محلے والے اس گھر نے کوثر لپٹ گھر بنا رکھتے ہیں۔

دائی نے اس کے سامنے اس کے مستقبل کی تصویر ایسی بچھایا کہ بنا کر کھی کر عارف کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر کچھ عارف نے کہا، کچھ دائی نے کہا اور عارف نے میسافست کر کہا کہ اسے جیسا کیسا خاندان بھی مل جائے وہ قبول کر لے گی اور اس کی وفا دار رہے گی۔

جس طرح عارف نے یہ بات بے ساختہ کہی تھی ایسی ہی بے ساختگی سے دائی نے کہا۔ "وہ خاندان میرا بیٹا ہے"

"عارف نے پورا کک کر حیرت کے دائی کی طرف دیکھا۔

"عارف بیٹی؟" دائی بولی، "میرے دل میں تمہاری ہمدردی ہے۔ لیکن تم مجھے خود غرض کوگی۔ تم جو کچھ بھی کہو مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو۔ معلوم نہیں تم جانتی ہو یا نہیں کہ میرا ایک بیٹا ہے۔ اس کی عمر تم سے سال چھ ماہ کم یا زیادہ ہو گی وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ تب میں جوان تھی۔ میں مصائب بتاتی ہوں کہ خاندان کے مرنے کے بعد میں نے بھی تمہاری طرح دوسرے تیار کیا لیکن تھیں۔ لیکن شادی کی بات جس کے ساتھ بھی کی، اس سے ہنس کر ٹال دیا۔ میں فوراً سمجھ گئی اور دائیوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر اپنی زندگی اپنے بچے کے لیے وقف کر دی۔ جس طرح میں آج تمہیں شرافت کا ایک راستہ دکھا رہی ہوں۔ اسی طرح ایک بڑھئی دائی نے مجھے جو وار کیا تھا اور میں بہن مل گئی تھی...."

"میں نے اپنے بیٹے کو بی۔ اے کر لیا۔ ایک تو میرے دائیوں کا کام تھا جو میں نے کیا، دوسرا کام یہ تھا جو میں تمہارا کرتی رہی ہوں یعنی خفیہ۔"

بیٹا نام سنا۔ اس کام میں بھی میں نے بہت پیسے کمائے اور اپنے بیٹے کے مستقبل پر غور کیا۔ بی نے کرنے کے ایک سال بعد اسے ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ہم ماں بیٹی ہی تھے، کوئی بیٹے چوڑے اخراجات نہ تھے۔ بی نے کئی مرتبہ کہا کہ ماں! اب تم گھر بیٹھو۔ میں تمہاری خدمت کروں گا۔ لیکن نانا بیٹھنا مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے بیٹے سے کہا تمہاری شادی کیسے گھر بیٹھوں گی، لیکن



منظر اپنے اعوا کے ساتھ اس طرح نعرہ مار کر مصافحہ یا مصافحہ کرتے جیسے کوئی بڑا کانا  
انہوں نے انجام دیا جو جبکہ دوسری قسم کے بے چارے سر جھکائے ہاتھوں میں جھکادی  
اور شہر پر گناہوں کا بوجھ سنبھالے لوگوں کو لاتے قدموں سے باہر نکلتے اور دایاں پیٹے سے موقد  
ناظرین سے نظریں ملانے سے احتراز برتتے تھے۔

میں ہونٹوں کی طرح منہ اٹھانے پر قسم کے ملزبان کو ٹٹلی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جب  
اپنا ایک میری نظریں ایک چہرے پر پڑ گئیں۔ میں کو بخشش کے باوجود اس چہرے سے  
نظریں نہ ہٹا سکا۔

کون ہے یہ؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور میرے قدم خود بخود اس  
کی طرف بڑھنے لگے۔ جو حالت اس کی نظر آ رہی تھی۔ اس سے میں بچنے لگا۔ لڑکھٹا  
تھا کہ اس قسم کے ملزبان کو گارد کے سپاہی احاطہ کچری کے کسی ہاتھ میں نہیں پٹھائیں گے  
بلکہ سیرے میں انہیں موجود حالات میں لے جا کر اس وقت تک بند رکھیں گے۔ جب تک کہ  
ان کے نام کی آواز عدالت سے نہ آئے۔

پکڑی کی حالات کی طرف جاتے ہوئے مجھے جیسے ساری بھولی ہوئی کہانی یاد آئی  
یہ دیکھ تھا۔

میرا ہم جماعت اور سکول کی آنکھ کاٹا ملا سیم۔ قدرت نے اس میں کسی بات کی  
بجھ تو کسی نہیں رکھی تھی۔ امیر مال باپ کا اکلوتا بیٹا، اور ہر طرح ذہین اور فطین، سکول  
کی کوئی ٹیم بھی اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ میٹرک کے بعد ہم الگ ہو گئے۔ میری اس  
سے پھر بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر پیش حالات نے اتنی مدت ہی نہ دی کہ اسے پھر ملا سکوں  
میں دوسرے کسی شہر کے کا لٹھ میں پڑھتا تھا۔

دیس سے میری ملاقات پھر اس روز ہوئی جب میں نے قریباً اسی سال بعد ایک اخبار  
میں اس کی تصویب اس خبر کے ساتھ دیکھی۔

اپنی مصروفیت کی کو گلا دیا کر مارنے والا، "شقی القلوب باپ پلیس کی حراست

میں۔"

## پچھتاوا

خدا نہ کرے آپ کا واسطہ کبھی عدالتوں سے پڑے اچھے یا بُرے کسی بھی مقصد  
سے ایک مرتبہ عدالتوں کا رخ کر لینے کے بعد آدمی کو واقعی خدا یاد آ جاتا ہے۔

میرا قصور و عورت یہ تھا کہ میں نے زخمی کو مرگ سے اٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا اور پچھلے  
تین ماہ سے اس انسانی ہمدردی کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ دس بندہ دن بعد مجھے گواہی  
کے لیے طلب کر لیا جاتا اور دو دہائی گھنٹے انتظار کروانے کے بعد دس بندہ دن کی  
الگ الگ تاریخ دے کر رخصت کر دیتے۔

اس روز بھی اس پکڑ میں عدالت کا طواف کر رہا تھا۔ جب حوالاتیوں کا کارڈ میری میڈل ڈال  
ہوئی۔ لاری اسی عدالت کے قریب سنبھلے اگر ٹھہری جس میں میری تاریخ پڑتی تھی۔ میں یہاں  
قریباً ایک گھنٹے سے کھڑا کھیاں مار رہا تھا۔ اب جو ایک دلچسپ مشغول تھا آیا تو میں بھی دوسرے  
انتظار کنندگان کی طرح اس میں محو ہو گیا۔

جی ہاں۔ یہ دلچسپ نظارہ ہی تو تھا۔ لاری سے اترے ہوئے ملزموں کو انکھیں  
پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔

لاری سے اترے ہوئے اکثر ملزموں کو لایے تھے۔ جنہیں دیکھ کر مجھ کے بجاٹے، رشک  
آتا تھا کہ جیل میں ان لوگوں کو کتنی محنت مند اور باوقار بنایا ہے، کچھ بے چارے مرنے والا  
ایسے تھے جو واقعی مجھ پر ملزموں نظر آ رہے تھے۔

پچھلے قسم کے ملزما ایک شانِ ظافتانہ سے لاری سے قدم باہر نکالتے اور پیٹے سے



ان کے بے تحاشہ کھانسنے کی آواز سن کر سنا تھا والے کمرے سے ایک ملازم اور ایک نوجوان گرت بھاگے جب انے اس کمرے میں آئے اس لوگ کی پرچے حالات نے وقت سے پہلے ہی عورت بنادیا تھا۔ نظر پڑنے ہی میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا کہ یہی حکیم کی بیوی ہے۔ لیکن یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ اب یہ سوچ مجھے پریشان کرنے لگی تھی۔

حکیم کی بیوی نے سریش کے سر ہانے رکھی وہ انہوں کی پیشکشوں کی نظر میں سے ایک پیشگی باہر نکالی اور اس میں سے دوا ڈالی انڈلیں کر انہیں ملائی تو عرض کر چیسے سکون آگیا۔

”مصافی چاہتا ہوں بزرگوار آپ کو میری دہر سے ....“ میں نے کہنا چاہا لیکن میری بات ا دھوری ہی رہی۔

”کوئی بات نہیں جھانی صاحب! اگلے کو اکثر ایسا دورہ پڑتا ہے۔ آپ ذرا دوا دیکر تشہیف لے آئیں۔ اس نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ شاید وہ کوئی نشتر اور دوا تھی۔ کیونکہ حکیم کے والد پرچندو گئی ظاری ہوئے گی تھی۔

میں شرمندہ سا اس کی رہائشی میں دوسرے کمرے میں آگیا میں خود میں اتنی حسرت نہیں پہنچا تھا کہ دوست بھی مزید یہاں ٹھہر سکوں! لیکن تجسس سے انہوں مج پر جو کر دیا ان رکاوٹ۔ حکیم کی بیوی نے مجھے سنا رسہ واقعات سنائے۔

حکیم کی بیوی اس کے رشتے کی خالزارا دین تھی اور خالصی انڈیا والٹس فیملی سے اس کا تعلق تھا۔ حکیم سے شادی کے بعد بھی اس کی حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی وہی مضبوط شخصوں میں آ جا تھا ہونٹوں اور سینا ڈان کے پیکر اور سر محض میں خود کو نمایاں کرنے کی عادت ہو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اب بھی جوں کی تو ان پر قرار تھی۔

ایسے ماڈرن خاندان کی لڑکیوں میں ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خاندانوں کو اپنی سہیلیوں میں منتقل کر داتی ہیں اور خود اپنی سہیلیوں کے خاندانوں

آٹ میرے خدایا! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر سوچا یہ کیوں اور حکیم ہم کو؟ میرا ہم جماعت حکیم گرگر نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرے ایسا سوچنے سے حقیقت تو بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ حکیم ہی تھا۔ میرا ہم جماعت اور سارے سکول کی آنکھوں کا تارا۔

دو تین سال پہلے مجھے اس کی شادی کی خبر تو ملی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ وہ ایسا ہی افسانہ بھی ہو گا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ دل دوا کر کے میں نے خبر کی تفصیل بھی پڑھ لی لیکن یہ خواہش بڑی شدت سے میرے اندر پیدا ہو رہی تھی کہ خود اس کی زبانی صحیح واقعات جان سکوں، لیکن یہ خواہش بھی دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

مزید دو تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ میرا تیار ملاشی شرمیں ہو گیا۔ جب یہاں آیا تو بھولا ہوئی کہانی پھر یاد آئی اور سوچا کہ حکیم کا حال دریافت کروں۔ یہی عزم لے کر میں ایک روز جب اس کے گھر پہنچا تو اس کے والد سے ملاقات ہو گئی۔

آج سے آٹھ دن پہلے جب میں نے اس کے والد کو دیکھا تھا تو کبھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص بوڑھا بھی ہو گا اور آج جب میں نے اسے دیکھا تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص زندہ بھی ہے۔

ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ایک بوڑھے اور ڈھال مزلیں نے جس کی بینی کی شتم ہر چکی تھی۔ اپنا تالان اور لرزتا ہوا کھڑکیوں سے بھرا ہوا مخمیر طرک بڑھا دیا۔

”کون ہو تم بیٹا؟“ انہیں پوچھنے میں بھی وقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”میں حکیم کا دوست ہوں اگلے“ میں نے اپنا تعارف کر دیا۔

”وہ! وہ تو، وہ تو مر گیا ہے بیٹا! وہ تو ....“ میری بات سننے ہی ان کی حالت غیر ہوئے گی۔ شہرت جذبات سے ان کا بدن لرزنے لگا تھا اور وہ اپنی بات ابھی مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کی کھانسی کا شدید حملہ ہو گیا۔ اس صورت حال نے مجھے گڑ بڑا کر رکھا یا سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں میں تو ان کے سامنے جزم سمجھے لگا تھا جیسے پوسٹ کچھ میری ہی وجہ سے ہوا ہو۔



ہائے کیا بات سائی۔ وہ اپنے اور فوزیہ کے درمیان اپنی بچی کو رکھا دے سمجھنے لگا۔ فوزیہ کے ہاں سے وہ سیدھا اپنے گھر آیا۔ بچی کی ماں کسی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ دستیم نے ہانگ پڑنے کی کیفیت میں اپنی دو سالہ معصوم بچی کا گلا دبا دیا اور اسے مار کر جزئی کیفیت میں گھر سے نکل گیا۔

گھر سے نکلنے کے بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے اور نشہ اترنے لگا تو اسے ہوش آیا اور احساس ہوا کہ اس سے کتنا گستاخانہ ہر سوز و گمراہ ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح روئے اور پھٹنے لگا۔ لیکن اب صرحت چھینا وا باقی رہ گیا تھا۔ جب بچی کی بد قسمت ماں گھر واپس آئی اور اس نے بچی کی لاش دیکھی تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھی اور کئی دن تک اس کی بیخفت کاشفاں رہی۔ ہوش حواس کی دنیا میں وہ اپنی لوشنے کے بعد جب اسے یہ علم ہوا کہ اس کی بیٹی کا قاتل کوئی اور نہیں۔ اس کا سہراک ہی ہے۔ تو اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔

بھرا پورا گھر گٹ گیا۔ دستیم کے والد پر پہلے دل کا دورہ پڑا پھر فالج کا حملہ ہوا۔ انہوں نے ایک ہی منہ باندھ لی تھی کہ وہ اب سرتے دم تک دستیم کی شکل نہیں دیکھیں گے۔ اس کی بیوی کے دل میں غجائے کیا مائی کر اس نے اپنے والدین کے بعد ہونے کے باوجود اپنا گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا اور دستیم کے باپ کی بیماری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور میر میں کی ہو رہی۔

دستیم کے مقدمے کی کسی نے پیروری نہ کی۔ اس باعث تو اس کی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تو پہلے ہی جسم اس گناہ کے جہنم میں جا رہا تھا۔ اپنے کو شہر چاکو کر اپنے ہاتھوں موت کی نیند سلائے کے بعد وہ خود بخود زندہ درگور ہو چکا تھا۔ اس نئی خبر نے اس پر سب بڑا اثر کیا۔ وہ تو اپنے گھر والوں کے پاؤں پکڑ کر رو کر مدد مانگا چاہتا تھا لیکن گھر والے اسے یہ وقت ہی دینے کو تیار نہ تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہشت گھنٹہ تک دستیم اب نیم پاگل ہو چکا تھا۔ پہلے پہل تو انجانوں میں اس کے سعی کی کچھ بڑھنے کو مل رہا تھا۔ مرنے کا ٹھنڈے کے بعد عدالت نے اسے جیل کی

سے تدارف حاصل کرنے کی خواہشمند رہتی ہیں۔ مقصد سوارے خود کو نمایاں کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن بسا اوقات معصومیت میں کی جانے والی حرکت کوئی نقصان نہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ عموماً اس وقت ہوتا ہے۔ جب پانی سر سے گزر چکا ہو۔

دستیم کی بیوی کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا۔ اس نے فوزیہ سے اپنے خاندان کی تعارف اپنی سو سالی میں مرد جاہ اخلاقیات کے مطابق ہی کروایا تھا۔ یہ اگر بات کہ دستیم کی دلچسپی فوزیہ میں بڑھنے لگی اور برہنہ بھی چلی گئی۔ فوزیہ عام شکل و صورت کی لڑکی تھی اس نے اپنے پہلے ہی تعارف میں اپنی باتوں اور زرخیزے کا جادو دستیم پر چلا دیا۔ اس دوران دستیم کے گھر کی بھی پید ہو گئی۔ لیکن وہ گراہی کے جس دلدل میں پھنس چکا تھا۔ اس سے باہر نکلنے کے بجائے اس میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اپنی بیوی میں اس کی دلچسپی کم ہونے لگی اور فوزیہ میں بڑھنے لگی۔ دونوں میں شادی کے عہد بیان بھی ہو چکے تھے کہ دستیم ہانگ پڑنے کی پیدائش نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔

فوزیہ نے اس کے سامنے نئی شرط رکھ دی کہ وہ دستیم سے اس وقت شادی کرے گی جب وہ اپنی بچی اور بیوی سے بغاوت حاصل کر لے۔ اس دوران دستیم کی زندگی حالت بڑی عجیب سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر کسی نے کچھ پڑھ کر رکھ رکھا۔ دریا اس نے زندگی میں کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ لیکن اب شہرت سے شراب نوشی بھی شروع کر دی۔ پھر شراب بھی اس کو سکون نہ دے سکی تو فاشی ایشیا کا استعمال اس نے شروع کر دیا۔

اس کی بد قسمت بیوی نے مجھے بتایا کہ ایک روز نشے کی حالت میں وہ فوزیہ کے گھر چلا گیا اور اس سے بعد ہوا کہ ابھی وہ اس کے ساتھ نکلا جا کرے۔ فوزیہ نے شہر پر جان چھوڑنے کے لیے اسے کہہ دیا کہ وہ اس کی جائداد میں کسی کا ہتھیار وراثت نہیں کر سکتی۔ کل صبح اس کی بیٹی جو ان کی ملکہ بیوی کی اولاد ہونے کے ناطے جائداد میں اپنا حصہ مانگے گی۔ دستیم نشے کی حالت میں تھا۔ اس کے دماغ میں نہ



## کرمو دارا تیا

کرمو دارا تیتے سے میری پہلی ملاقات بڑی پہلکار میری تھی :

میں موٹر سائیکل پر کسی کام سے جا رہا تھا لاہور کی ایک مادر ن آبادی کی کشادہ اور مضبوط لکین ویران سڑکوں پر میں بظاہر سامنے سے آنے والی ٹریفک سے لاپرواہ موٹر سائیکل اڑائے چلا جا رہا تھا۔

مگر میوں کی جان بھرا دھوپ اور اس پر گرم ٹو۔ تجھے علم تھا کہ اس قیامت کی گرمی میں ان شاخہ نڈار اور ٹخڑے بنگلوں سے کوئی باہر چھانکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرے گا۔

سڑکوں پر انسان تو کیا کوئی گاڑی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن اچانک ہی میں گڑبڑا کر رہ گیا اگرچہ سیکر کی غفلت ہو جاتی تو یہ کسی پولیس ٹینین میں اور حرکت کے درمیان موجود دیگر سہیتا میں نہ تھا۔

وہ اچانک ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے اس کی سائیکل گری پڑی تھی اور قریب درمیان میں مٹی ہوئی سڑک پر وہ ایٹھا ہوا تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر موٹر سائیکل روک لی۔ پہلے تو جی چاہا کہ جنم میں جائے سب کچھ میری بلاتے چسپاں نکل جاؤں۔ اگر زخمی ہے تو میں نے نہیں کیا۔ اگر کوئی مریض ہے تو بھی میں اس کی سہائی کرنے سے رہا۔ لیکن انسانی ہمدردی کا جذبہ اٹھ اٹھے آیا اور میں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے پیدل چلتا اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس کے منہ سے جھانک رہی تھی شامی سرنگی کا دورہ تھا۔ میرے تو اکتانہ پاؤں تھیل

حوالات کے سپرد کر دیا اور اب وہ غیر دیوانگی کی کیفیت میں تار پھیں جھکتا رہا تھا۔

میں خود میں اتنا حوصلہ بھی نہیں پاتا تھا کہ اس سے جیل میں جیل ملاقات ہی کر سکوں۔ اس شہر میں کچھ کئی ماہ بیت گئے۔ میں نے اس کے گھر سے آنے کے بعد اسے بالکل بھارا تھا لیکن آج جب وہ اچانک میرے سامنے آیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں حوالات کے دروازے پر جا پہنچا۔ وہ حوالات کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سر اور ڈائری کے بال بے تحاشہ پھرتے ہوئے تھے۔ اسے نہانے شایر کئی ماہ بیت گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی وہ چمک پورا اس کی شخصیت کا فاضل تھی، مگر پڑھ چکی تھی۔ میں بھی دوسرے ”ملاقاتیوں“ کی طرح حوالات کی سلاخوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے پر موجود سنہری نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر گردن جھکا لی۔

میں نے دسیم کا نام لے کر اسے آواز دی لیکن وہ بالکل لا تعلق بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا۔ شاید یہاں کھوپا ہونا محقق تلاش کر رہا تھا۔ مینا ڈیوی یہ تو سائیکل لوگ ہے۔ بس یونی چسپ بیٹھا رہتا ہے نہ کسی سے بولتا ہے نہ کسی کی منتہا ہے ”ایک حوالاتی نے مجھے بتایا۔ میں پڑا دنگی ہو کر واپس پڑا ہی تھا کہ قسیم کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ”کوئی نہیں آیا۔ کوئی نہیں آئے گا اور اس نے اس فحشے کی کھول اور مشورہ کر دی پھر خاموشی ہو کر وہ دوبارہ خلاؤں میں گھورتے نکلے۔ میں دلمان سے ہٹا اور پوچھتی قیروں سے عدالت کا رخ کیا۔ یہاں میرے نام کی آواز پڑنے والی تھی۔



اٹ چکا تھا۔

میرا عزیز دکاندار بھاگ کر میرے ساتھ اس کی مدد کو پہنچا تھا نہ اُسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ میرے عزیز دکاندار کو اس پر پڑا ترس آیا اور وہ مقامی دکانداروں کے عقائد سے ہندہ کر کے اس کا نقصان پورا کرنے کی تم شروع کرنے لگے۔ ابھی انہوں نے اپنے اس ارادے کا اظہار دیا کہ اگلے ہوجانے والے دکانداروں کے سامنے کیا ہی تھا کر ایک نوجوان مجھے چھپے چھپے ہٹا کر سامنے آگیا۔

”سیاں جی؟ کیا رہ رہے ہو۔“ اس نے میرے عزیز کی طرف دیکھتے کے بجائے منظرِ مکر لگے رالے کی طرف دیکھ کر کہا: ”یہ تو فرڈا ہے۔“

اب جو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو پایا کیا کر رہی وہ محسوس نہیں ہوا اس سے پہلے مرگی کا ڈور سر رکھا فتح بے وقوف بناتے ہیں۔

یہ میری اور کروڑا مردار دیتے کی پہلی ”باقاعدہ ملاقات“ تھی۔ اپنی شخصیت کے اکتشاف پر اس نے نہ تو ہر سنایا نہ کسی گھبراہٹ کا اظہار کیا، بلکہ اس نوجوان کو ہر اچھا کہنے لگا جس نے اس کی امدیت ظاہر کر دی تھی۔ وہ ہلکے کر رہا تھا کہ اکتشاف کرنے والے نے اس کی دہانہ مری مراد دی ہے۔

اسی نوجوان نے جیب یہ بتایا کہ اس فرڈا کے کاغذ ایک معزز گھرانے سے ہے۔ نہیں مجتہس ہوا۔ یہ جاننے کے لیے کہ آخروہ ایک معزز گھرانے کا فرد ہونے ہوئے فرڈا کیوں بن گیا۔ اس نوجوان سے جیب میں نے کروڑا پتہ دریافت کیا تو وہ تھمر لگا کر ہنس پڑا۔ اور بولا: ”بنا آپ شہیت آدمی ہیں کسی پکڑ میں پڑنے لگے ہیں۔“

نوجوان نے فہمیت چھپائی تھی۔ لیکن میں اپنی مجتہس طبیعت کے ہاتھوں مجبوراً اس پکڑ میں پڑ گیا۔ کروڑا کی شکل سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی غلط آدمی ہے عام حالات میں وہ ایک معزز نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ جتنا کھاسیا بڑا تھا، اس سے مجھے یہ حیرت صرف ہوئی کہ وہ ایسے گھٹیا فرد کیوں کرتا ہے؟ کوئی لبا ہاتھ کیوں نہیں مارتا؟

نئے۔ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کروں کیا نہ کروں؟ پھر چاہا کہ جیسے ایک کو ہنداس میرے ذہن میں لپکا۔ مجھے یاد آگیا۔ بچپن میں سن تھا کہ مرگی کے مریض کو اگر چوڑے کا چوٹا سونگھایا جائے تو وہ نارمل ہوجاتا ہے۔

اسی خیال کے تحت اپنے پاؤں پر نظر ڈالی تو اپنا سامنے لے کر وہ گیا کہ میرے پاؤں میں ربر کے بجائے کینوں کے جوتے تھے۔ یہ شکل بھی اسی نے مل کر دی کہ بونیک مرگ زندہ نے پاؤں میں دینا کی گرافٹی نہیں رکھی تھی۔ میں نے اس کے پاؤں سے جوئی گھسیٹ کر الگ کی اور اسے سونگھائی چند ہی منٹ بعد وہ نارمل ہو گیا۔

پہلے میں وہ جبری طرح نہار ہا تھا میری اپنی حالت بھی اس سے کوئی مختلف نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح اسے سہارا دے کر میں قدر سے سایہ دار عکس پہ لے آیا۔ اب ایک نئی بنیاد پر پڑی۔ اس نے اوسان بگال ہوتے ہی دھار میں مارا کہ مردانہ شریعہ کر رہا میرا جی چاہا کہ فرڈا بھاگ جاؤں لیکن اب تو بھاگنے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی تھی میرا کیا نہ کرتا کہ مصداق میں نہ کار ہا اور اسے جو ملو دے کر پھینک دیا۔

”باپو جی؟ مزدور آدمی ہوں۔ صبح سے مزدوری ڈھونڈ رہا تھا۔ گھر پہنچے سہارا ہے لیکن میری قسمت؟ یہ کہہ کر اس نے دوبارہ رونے کا اشارہ لینا چاہا۔ لیکن اب مجھے میں صبر کا یا نہیں تھا۔“

میں نے اپنی شبیب سے دل کو اکڑا کر کے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کی مٹھی میں ”زبردستی“ چھادیا کہو کہو مصروف تجارت لینے سے انکار ہی تھے۔ اسے جو ملو دیا اور خدا خدا کر کے گھر پہنچا۔

اس واقعے کے قریباً تین چار ماہ بعد کا ذکر ہے کہ میں اپنے ایک عزیز کی دکان کی کام سے بیٹھا تھا۔ یہ دکان خاصہ بابا داور کاروباری لحاظ سے مصروف کاریٹ میں تھی۔ دکان کے نزدیک دھڑا رام سے کسی شے کے گرنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دیکھا تو ایک بچہ گول گول گپے پہنچنے والا اپنے خوارچے سمیت ہوا اس نے مٹھاپا اٹھا رکھا تھا۔ زمین بوس تھا۔ اس کے گول گپے کھٹائی والے پٹے اور لوہے کی تاروں کا خوارچہ



پرے قابو نہ آیا۔ ہم کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی زبان فحش  
لمحہ اک وہ سیرک پاس ہے۔ میں نے کہا اچھا صرف یہی بتا دو کہ اتنے کامیاب اداکار  
ہونے کے باوجود تم صرف معمولی اور گھٹیا قسم کے فراڈ ہی کیوں کرتے ہو۔

میری بات سن کر اس نے دانشوروں کی طرح سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور  
دھوئیں کے مرعوبے فضا میں بکھیرتے ہوئے کہنا لگا۔ ”سمر! جھوٹی گفتگوں کو ناسرے  
کے نزدیک ہی رہنا چاہیے۔ یہ پراگرا سمنڈ ہے۔ بڑے بڑے مگر حقہ خورد ہیں اس میں۔  
میرے جیسی جھوٹی فحش کی ان کے نزدیک اہمیت ہی کیا ہے۔“

میں نے کہا: ”یاد رہی مجھ داری کی باتیں کرتے ہو تمہارا تعلق بھی شریعت گھرانے  
سے ہے۔ پھر کیوں ایسے گھٹیا کام کرتے ہو، لعنت چھو۔ میں تمہیں نوکری دلا دیتا  
ہوں۔“

میری بات سن کر اس نے کھوکھلا ہنسنے لگا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا: ”سمر!  
اب میں اس کہل چھوڑنا بھی چاہوں تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ آپ سمجھ و ادراک ہی میں  
ایک تیرہ پالیس کے کاغذوں میں آنے کے بعد کوئی لاکھ شریعتی بناتا ہے۔ یہ لوگ بھی تسلیم نہیں  
کرتے کبھی سعادت نہیں کرتے! ہے۔“

یہ بات کہتے ہوئے اس کے لیے میں ایک جہان کی یاسیت سمجھ کر آئی۔ میں نے اسے  
نزد چھٹیٹنا مناسبت نہ سمجھا اور ہاں سے چلا آیا۔ کئی دن تک کمزور میرے ذہن پر  
سوار رہا۔ پھر میں کاروبار حیات میں ایسا لچکا کر کر صرف غلطی کی طرح ذہن کی تختی  
سے ٹٹنے لگا۔

ایک روز وہ پھر میرے لاشعور سے نکل کر اخبار کے صفحات پر سیرا منہ پڑانے لگا۔  
اس مرتبہ وہ کسی کے ”نوٹ دو گئے“ کرتے ہوئے ”کیڈا گیا تھا۔ میں نے سوری انداز سے  
شیرٹھی اور کوکریا کو کر کے بھول گیا۔

اس واقعے کے تقریباً تین چار ماہ بعد میں ایک جسٹینڈرٹ نے نوکری کھڑا تھا کہ  
ایک شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی طرف متغالب کیا میں گھوما اور جب شکل سے واسطہ

یہی سوال نے کہ ایک روز میں اس کے گھر پہنچا۔

اندرون شریکری پر پہنچے اور ڈیرھمی بیڑھی گلیوں میں دھکے کھانے کے بعد جب میں  
ایک بریدہ مسکان تک پہنچا تو دروازہ کھٹکھٹانے پر جس شخصیت نے میرا استقبال کیا۔ اسے  
دیکھنے کے بعد یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اس بزرگ عورت کا بیٹا ہو گا۔ میرے منہ سے  
کرمو کا نام گھسنے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بے چاری نے یہی سمجھا ہوا  
کہ میں اس کا کوئی ”شکار“ ہوں، لیکن میرے یہ تسلی دلانے پر کہ ”ایسی کوئی بات نہیں“  
اس بے چاری نے سکھ کا سانس لیا۔

کرمو، جب اس اطلاع پر سہرا اٹھ کر آئی اس سے ملنا چاہتا ہے تو اسے یہی  
اٹیرتھی کہ آنے والا تو تھا نہ کا کوئی پیا سہر ہو گیا پھر اس کا کوئی ”شکار“ جس نے  
کرمو کا سراغ لگایا ہے۔ لیکن اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ حیران  
ہی تو رہ گیا۔

”کیا بات ہے جناب؟“ اس نے بڑے شرمناک لہجے میں مجھ سے پوچھا۔  
”کچھ بات نہیں بھائی صاحب بہن آپ سے ملنے کا شوق ہے۔“

میرا ”اور کرمو وار داتیے“ کا پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ اس کی حیرانگی اب ختم ہو چکی  
تھی۔ وہ آؤ سیریک پاس فراڈ یا تھا اور انسانیت پر خاصی کڑی نظر سے  
حاصل تھی۔ جلدی سمجھ گیا کہ میں نہ کوئی غیر ہوں نہ خفیہ پولیس کا آدمی بلکہ اس کا  
ایک طرح سے ”مداح“ ہوں۔

میں اسے جانے کے ایک معمولی سے ہوٹل پر لے آیا۔ جہاں پہلے سے موجود  
لوگوں نے اٹکھیل پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ شکل سے تو یہ میری حال  
شریعت آدمی نظر آ رہا تھا اور کسی شریعت آدمی کا کرمو وار داتیے کے ساتھ کیا کام چاہے  
کی چیز کیاں لیتے ہوئے اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ وہ اپنے متعلق کوئی بات  
مجھے نہیں بتائے گا۔

بڑا اگر آدمی تھا۔ میرے لاکھ کر دینے اور گھبرا کر بات کرنے کے باوجود



ہو میرے ہاتھوں لٹ گیا۔ میں نے واردات دوسرے علاقے میں بھی تھی۔

فدا جانے ایک پولیس ٹاؤن نے کیسے مجھے چھایا اور ملے وعدے میں پکڑا لیا۔

اس دوران ساری قریب میں نے بانٹ دی تھی۔

اتنا کہہ کر اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے اٹکھوں میں آئے اُسے صوبہ کرتے

نے مجھے کہا: "باڈی۔ وہ بے چارہ جو میرے ہاتھوں لٹا تھا۔ دل کا بعض تھا

اس نے اس کی جان لے لی کہ اب وہ گاؤں واپس جایا کر کیا بندہ کھائے گا۔

وہ روتے ہوئے میرے سامنے نہیں کھانے لگا کہ اسے علم نہیں تھا کہ وہ

سب بڑھا اپنی بیٹی کا جہیز خریدنے آیا ہے۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور یقین

ارکریچے دل سے "اٹھ ہو گیا تو اللہ اس کے گناہ منور بخش دے گا ضرورت اس

نہ کی ہے کہ اٹھ وہ ایسی حرکت نہ کرے۔

باڈی: "اس نے بڑے عزم سے کہا کہ "مرد واد حوائی مر گیا ہے۔ اب میں

ن کر دین ہوں۔ موت کو دم دین۔"

میں اسے حوصلہ دے کر آ گیا۔ اس بات کی مجھے بے حد خوشی تھی کہ اللہ نے بالآخر

سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے دی۔ وہ پہلے بھی میرا انسان نہیں تھا۔

اور سچی سے اس نے خود پر ایک نوجوان چھارکھا جو بالآخر ماریا اور اس کی صحیح شخصیت

کھڑک سامنے آئی۔

اس واقعے کے بعد میں اپنی فیہریت کے لیے کمزور رہنے لگا۔ کبھی کبھی اس کی تاریخی

بھی یاد آتا۔ دو تین مرتبہ جلی میں بھی اس سے ملاقات کی۔ کروڑوں اب ڈاڑھی رکھ

نا تھی اور باقی انداز نمازی میں بھی جوں جوں گڑے جانتے تھے۔ انہیں یقین نہیں کہ ہر حال

کو کبھی سدھریں سکتا ہے۔ وہ یہی کہتے تھے کہ یہ بھی کروڑوں کا نیا چکر ہے اس کے ایک

وقت کارنے ایک روز مجھے بڑی راز داری سے بتایا۔

پلا۔ وہ میرے اوسان دکھا کر دینے کے لیے کافی تھی۔

پولیس کا سپاہی مجھ سے مخاطب تھا۔ وہ آپ کو بلارہا ہے۔ اس نے سرکل کے ایک

سائڈ پر کھڑے ہوئے کی طرف اشارہ کر کے مخاطب کیا۔

"تائے کی طرف نظر اٹھاؤ تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پچھلی سیٹ پر۔ دو

سپاہی بیٹھے مجھے گھور رہے تھے۔ میں ڈرتا ڈرتا وہاں نکل گیا۔

تائے کی اگلی سیٹ پر کروڑوں سپاہی کے ساتھ مندر حوالہ میں چھپا بیٹھا

تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے چھپا کر رکھا اور یہ بھی کہ اس کی ضروریات یا

میں ہے

"باڈی اب میں یہ سارا دھندہ چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے نادانگی میں بہت بڑا گناہ

سوز رہ گیا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا کہ جو جرم کی فطرت بن چکا تھا۔ مجھے کیا

کہہ رہا ہے؟ میں نے سوچا اور پولیس کے سامنے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے

اسے کچھ پیسے دیے اور کہا کہ میں یہ کہہ رہی اس سے ملے گا۔ اس کی عدالت پر چھ

کریں چلا گیا۔

دوبارہ کو جب کہہ رہی تھی تو کروڑوں سے ملنے والوں کے ساتھ ایک باغیچے میں بیٹھا

دھوپ سینک رہا تھا۔ سڑکی اس روز کچھ زیادہ بھی تھی۔ میں نے یہاں کے دستور

کے مطابق چائے منگوائی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ گارڈ کے سپاہی چائے پینے میں لگے

تھے اور کروڑوں کچھ کے سے فیہریت چلے اپنی مافی سارا تھا۔

"باڈی" اس نے کہا: "پچھلے دو مہینے سے ہفتہ بہت تنگ تھا اور نیا تھا نیا

جان کو کر رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک مرتبہ جو ان لوگوں کے کاغذات میں آ گیا۔

اس کی جان چھٹی ہی نہیں۔ میں نے لاری اڑے یہ ایک اسامی ٹاڑی ایک دیباقی سا

آدمی تھا۔ خدا کی قسم مجھے علم نہیں تھا کہ یہ اپنی بیٹی کا جہیز خریدنے آیا ہے۔





119

مارڈال۔ مارڈال اے ظالموں نے مارڈال۔

سورجی بھٹا

کھلے کی عورتیں بھی وہاں جمع ہو کر کھیں۔ ان میں سے اکثر اب میری  
 واقفیت بن چکی تھیں کہ یہیں کرمو کا دھڑ شریف درست ہوں۔  
 باؤجی و دامائی کے پیسے ہی دن میں پچیس شیعے میں بک کر کمرے کی تقی  
 اُن میں سے ایک نے روتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”چار پانچ روز بعد  
 جب گھر واپس آیا تو حالت بہت مجرب تھی۔ پہلے تو محلے کے ڈاکٹر صاحب سے  
 دوا لے اتے رہے۔ پھر ایک روز زیادہ حالت بگڑی تو ہسپتال لے گئے۔ پیسے نہ  
 کرمو گیا۔“ وہ بھی دھڑ ٹریں مار مار کر روتے گئے۔



ساتھ پاکستان پہنچنے کے لیے نکلا تھا۔

ان کے ساتھ لگاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ تھے یہ الگ بات کہ پاکستانی

مہرحر تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

اس کو صحت اتنا یاد رہ گیا تھا کہ آخری محلے کے بعد جب اس کا آپ ایک کھڑکی کرپان

سے کوٹ کر گرا تو وہ دیوبند وادی چچا ہوا غورزدہ ہو کر ایک طرف بھاگ نکلا تھا۔ پھر وہ

بھاگتا ہی چلا گیا۔ زندگی کی شاہراہ پر اس کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے کھیتوں

سے ایک مہاجر کیمپ تک کا سفر کتنے جان لیوا تھا۔ اس کا تصور کر کے وہ آج بھی کانٹہ

اٹھاتا تھا۔

اس کی عمر تیرپہنچ سال تھی۔ ہنزہ زبان سے لوگ آئے اور میرپانے چلے جانے

تھے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ اپنے گمشدہ عزیزوں کو کھرتے یہاں آئے اور

اپنا گھر مقصود پر واپس لوٹ جاتے۔ لیکن اسے کوئی لینے نہیں آیا۔

وہ صبح سویرے ہی کسی آنے والے کا منتظر ہو جاتا اور رات ڈھٹے پھر اگلے

روز کی آنے والے کے انتظار میں سو جاتا۔ دن بھوتوں اور مہینوں میں ڈھٹے لگے

اندر دیا کو قیدیں ہو چکا تھا کہ اسے لینے کوئی نہیں آئے گا۔ لیکن اس روز وہ حیران ہی

رہ گیا۔ جب کیمپ کے انچارج نے اسے بلا کر ایک مہاجر بان صورت سے اس کا

تعارف کروایا۔

”یہی ہے اللہ دیا“... نوارو نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی خوشی

سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر حیران پریشان اللہ دیا کو اپنے ساتھ چلا۔

کیمپ انچارج حیرت سے بھی نوارو اور کبھی اللہ دیا کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک

اللہ دیا کی طرح سے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔

”یہ بے چارہ مجھے کیسے پہچانے گا جناب؟ ساری زندگی تو میں گاؤں سے باہر

رہا ہوں قسمت کی بات ہے جناب؟ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کلنٹر نوکر کی کمرے

مڑ جاتا تو میں بھوکا نہیں مرنے لگا تھا۔ لیکن...“ اسے رسی قسمت ”وہ چپ

## لسانِ حق

اللہ دیا کا گھر کبھی نہیں سکھایا۔ شاید یہی اس کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اس مرتبہ

تو اس نے جی جان سے یہی کوشش کی تھی کہ وہ اس مڈیا سے نکل جائے اور پریکٹون کو شہر

اپنے لیے ڈھونڈ لے۔ جہاں اسے مان پیسہ آ سکے۔ اب یہ اس کا مقدر کے اس عالم پر کلاں

میں کوئی ایک جا بٹا ہوا بھی اسے پیسہ نہ آ سکی۔ اس جو ہر روز زندگی کے لیے اس نے فتنی مسلسل

دھڑ دھکیلا تھا اس نے اللہ دیا کو اب ٹھہرا کر دیا تھا۔

بزم اس کھیل کی طرح اللہ دیا کے بزن سے چٹ گیا تھا۔ جوتا اسے نہ اتر سکے۔

اس نے کچھ اور جوانی وقت کے دھند کو دیں کہیں کم ہو چکی تھی۔ کوئی نیا نہیں تھا

اس کا۔ کوئی مستقبل اسے اپنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ حال کو سدھارنے کے لیے وہ اندھوں

کی طرح چادریں طوت اٹھتا پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن وقت نے سوائے کچھ پتھار کے اس کی

جھولی میں کچھ نہ ڈالا۔

اس مدد جب وہ سب کچھ بڑھ چکا کہ ایک دولہا نہ کیلئے بیچو وال پہنچا تو اسے

یقین تھا کہ شاہدہ فردوس کی منتظر ہو گی۔ لیکن وہاں رہیو سے شیش پر اس کے مقدر کی طرح

برقی و شمع کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

پاکستان کے ایک بڑے شہر کے ہٹانے سے ایک چھوٹے شہر کے دیوبند میں تک

سفر اس نے یوں ہی طے نہیں کر لیا تھا۔ اس مختصر سفر میں اس کی ساری زندگی کی مہر و جہر

سمٹ آئی تھی۔ اس کے لاشعور میں ابھی اس کا بچپن زندہ تھا۔ وہ شام اس نے بھلائی

نہیں کی تھی۔ جب مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں سے وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے



اے شاگرد نکلے گا۔

الشریو! پھر آگے بڑھا جاگیا۔ پہلے پہل تاجو اس کے ساتھ جایا کرتا تھا پھر وہ دریا کر الشریو سارے اکیلے وارادہ کرتے گا۔ ایک ترہہ پہلے جانے پر جب وہ چلی پہنچا تو پہلے سے اندر موجود اتار دوں نے اسے اپنے فن کے وہ اسرار و معجز سکھا دیئے کہ الشریو! اب اٹھ کھڑی ہو گیا۔

دو تین ترہہ چلی جاگنے کے بعد وہ تاجو سے الگ ہو گیا۔ اب وہ اپنی محنت میں سے کسی کو ہر دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک روز وہ ایک بڑے شہر کی معروف شاہراہ پر کسی شاگرد کے انتظام میں کھڑا تھا۔ جب اس نے ایک ٹوٹے آدمی کو برہنہ کیوں نہ خیال کرنا کہ سے برآمد ہوتے دیکھا۔ الشریو! سارے بھانسیا نے بھاگنے لپکا کر سڑک پر

اسی کی بے قرار نظریں برہنہ کیسے پر گم گئیں۔ پیچھے ہی وہ بزرگ ایک قدرے غیر معروف شاہراہ کا طرفت بڑھا جہاں اس نے غالباً اپنی گاڑی پارک کی ہوئی تھی۔ وہ بے قدموں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ الشریو! کیا کرتا رہتا تھا۔

اس کی جوارب میں چھپا خچر ہاتھ میں آگیا اور اس کی آنکھیں بزرگ کے چہرے پر جم گئیں۔

لیکن یہ کیا؟

الشریو! کیا کوئی دیکھا جیسے ان آنکھوں سے کوئی برقی دو ضامع ہو کر اس کے جسم کو

چھیدنے لگی ہے۔

”تم محمد بن کے ایک حیرت بزرگ کی آواز اسے کسی کنوئیں سے آتی تھی وہی ہاں ہاں۔“ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

اسے یاد آگیا کہ اس کے باپ کا یہی نام تھا۔۔۔۔۔ لیکن یہ شخص

کون ہے۔

”خچر واپس رکھ دو اور میرے ساتھ آؤ۔“۔۔۔۔۔ حکم نہ لے بھی لے

کہا گیا۔

ہو گیا۔

الشریو! اے چھوٹے سے ذہن میں تب یہی خیال آکر تھا کہ صلیب غلط فہمی ہی کی بنا پر یہی کوئی اسے لینے لویا۔ کیسے پانچ بھی خوش تھا کہ بچے کا کوئی حارس آ رہا ہے۔ سب سے زیادہ خوش تو لودر و کوئی کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی اور اچھا جھلکا رہا تھا گیا۔

وہ شخص الشریو! کو اپنا بیٹا بنا کر بھی گھڑ لایا تھا۔ لیکن بے اسرار الشریو! سارے اس کی اہمیت کو نہ جان سکا۔ یہ ہمدرد صورت آدمی۔ انسان کے لباس میں بھیڑ یا ٹھکانا۔ اسی نے جلد ہی الشریو! کو اپنی لائی پرت لگایا۔ اس جیسے دو اور بیٹے یہاں پہلے بھی موجود تھے۔

نیا نیا ملک بنا تھا۔ لوٹ مار کا رگڑا گرم تھا۔ وہ عظیم مقامہ مجوس کی بھیڑ بے چارہ گئے۔ جو اس ملک عزیز کی اس کا کس تھے۔ لوٹ کر آنے والوں میں سے بہت سے غور لیٹر سے بنا گئے۔ انہوں نے الشریو! یا جیسے بے ہمارا لوگوں کو بھی لوٹ کا مال سمجھ لیا تھا۔

ما جو تقسیم ملک سے پہلے ملک میں ورغلا کر آیا غزا کر کے لائے گئے بچوں کا ایک ایسا ہی کردہ چلا رہا تھا کہ پرستان بن گیا۔ بادل خزا سزا ہے بھی پاگستان آتا پاتا۔ جہاں تھڑی محنت ہی سے کام کے تین چار بچے اس کے ہاتھ آگئے تھے۔

اس نے الشریو! کے ذہن میں جلد ہی یہ بات طال دی کہ اسے نہ صرف خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے بلکہ اپنے چاہنے والے کے لیے بھی کھانا لانا ہے۔ اور کہانے کا سامان طریقہ فطری طور پر پادور اور ذہنی الشریو! یا اس نے دونوں میں بھجھایا۔

پہلی ترہہ جب اس نے الشریو! کو ایک خالی مکان میں جس کے کین کسی حکام سے گئے ہوئے تھے۔ داخل کیا تو خوف سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ لیکن پہلی ہی دھڑا اس نے اتنی کامیابی سے ہاتھ کرتا جیسا جسے عجیب خداوندوں نے کھائے تھا۔ اس نے ریکھ لیا تھا۔



نے چند ہی دنوں میں اسے اتنا پیار کر دیا کہ سب کچھ بھول گیا۔

اس نے اللہ وسایا کو اپنی فرس میں اپنے بیٹے کی حیثیت سے مقناوت کر دیا۔  
ریٹائرمنٹ کے بعد سے فوجی چاہا نے کا دہار شروح کر دیا تھا۔ اللہ وسایا اچھے  
لوگوں کی طرح اس کی دکاں پر پیٹھا رہتا لیکن وہ قبول چکا تھا کہ اس کی مصیبت  
کچھ اور ہے۔

دس بارہ روز بعد ہی ایک دن ایک سپاہی اسے اپنے گلیاں: ”چوہدری صاحب نے طواریتاً“  
اللہ وسایا سمجھ گیا کہ کسی تعافی ملاؤٹ نے اسے چکان کر اس کی۔ پورٹ کر دی ہوگی۔  
تھانیدار نے شریفانہ لہاس میں ملہوس اللہ وسایا کو سر سے پیر تک بچے غور سے دیکھا  
پھر ایسا رجز و کسول کو اس کے سامنے رکھ دیا۔  
”یہ تمہاری تصویر ہے نا۔“ اس نے بڑے طنز سے ایک تصویر پر انگلی مار کر کہا۔  
”جی سرکار۔۔۔ میری ہی ہے لیکن اب میں۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔  
”اب کی بات چھوڑ دیجیے۔۔۔ ہمیں کیا تم کہہ کرتے ہو۔۔۔“ ویسے ہاتھ دیا۔

مارا ہے استاد تم نے۔۔۔“  
تھانیدار نے مسکراہٹ اس کی طرف اچھال۔  
اللہ وسایا کی قمیوں پولیس والوں کے لیے نئی نہیں تھیں۔ ان کے اپنے کچھ اصول تھے  
ایک مرتبہ جو پولیس کے کافروں میں آگیا۔۔۔ آگیا۔ تھانیدار نے اس کے رونے اور قمیوں  
کھانے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ”مطلب کی بات کرو دسیا۔۔۔ مطلب کی بات  
کرو۔ ہمیں بے وقوف بناؤ گے کیا؟ پھر تمہیں گرفتار کر نہیں رہے۔ بس فلا خیال  
رکھنا ہمارا بھی۔۔۔“ آج کل تو بڑے آدمی بن گئے ہوندا، ”تھانیدار کی طنز پر باتیں اسے  
کھا گئیں لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ اس دنیا کے قوانین جانتا تھا۔ اب اس کے سوا اس کے لیے  
اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پولیس ٹاڈٹ بن جائے۔ لیکن اس نے تو قسم کھائی تھی کہ دوبارہ اس  
زندگی میں واپس نہیں ملے گا۔ جسے اس نے چھوڑ دیا ہے۔

اللہ وسایا کچھ پندرہ کر سکا۔ آٹھ روز تھا نے اس کی پیشانی ہونے لگی۔ پولیس کا جب جی

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے جانے دو۔“ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے۔۔۔  
نہ کرے۔ کسی بھی لمحے بیان کسی کی آواز کا خطرہ موجود تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ یہ پولیس  
کی توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس سے چھل کر وہ اپنے ارا سے  
عملی ہمارہ بنائے ایک آہنی شکنجے نے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ ہونٹوں کا  
طرح اس کا منہ دیکھتا رہا۔

”مجھے اپنا ہمدرد سمجھو۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ تم جان بھی نہیں سکتے۔“  
اسی بزرگ نے نزدیک کھڑکی کار کا اگلا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھا دیا اور ڈرائیونگ سیٹ  
خود سنبھال لی۔ تمام راستے وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش رہا۔ اس دوران اسے یہ احساس  
ہو چکا تھا کہ یہ شخص اس کی عمر ہوسکتی تھی اور آٹھ نو سال اسے اپنے گاؤں سے نکلے  
ہوئے تھے۔

گھر پہنچا پر اس نے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا بھی پہلا سربراہ  
اب اللہ وسایا کو وحشت زدہ کرنے لگا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص کون  
اظہار انیس سال اس کی عمر ہوسکتی تھی اور آٹھ نو سال اسے اپنے گاؤں سے نکلے  
ہوئے تھے۔

”تمہیں فوجی چاہا ہے۔“ مہربان بزرگ نے گھر پہنچ کر اسے ایک عجیب  
کمرے میں بٹھا دئے ہوئے کہا۔

”فوجی چاہا۔۔۔“ وہ بڑبڑایا اور اسے یاد آگیا۔ اس کی والدہ کا ایک دور  
کار شتر دار فوجی تھا۔ شاید فوج کا کوئی بڑا افسر تھا۔ کبھی کبھی انہیں لے آیا کرتا تھا  
کمال کا مشاہدہ تھا فوجی چاہا کا۔۔۔ جس نے آٹھ نو سال بعد بھی اسے پہچان  
لیا تھا۔

اللہ وسایا کو یہیں علم ہوا کہ اس کا قوسا رکنہ مارا گیا تھا۔ وہ اکیلا کھنے کے لیے زندہ  
رہ گیا۔ فوجی چاہنے اسے اپنے گھر پہنچا دی۔ اس نے اللہ وسایا سے کہا کہ وہ اپنا نام  
بھلا کر اچھا انسان بننے کی کوشش کرے۔ اللہ وسایا کب نہ بڑبڑاتا چاہتا تھا۔ فوجی چاہا



ایک تاریخ منور کے شاہدہ کو دہاں پہنچنے کے لیے کس دشاہدہ نے بھی اس کا دل رکھنے کے لیے ہان کر دی۔

اس کی زندگی میں، اللہ وسایا پہلا ایسا آدمی نہیں تھا۔ جس نے اسے نئی زندگی کی راہ دکھائی تھی۔ ایسے دو تلخ تجربات وہ کر چکی تھی اور تیسری مرتبہ دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اس روز جب اللہ وسایا کی زندگی کے خواب دیکھنا وہاں پہنچا تو اسے یقین تھا کہ شاہدہ وہاں موجود ہوگی، لیکن یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے دو گھنٹے تک وہ ایک بچی پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران وہ درگاہوں و دہانوں میں گھوم رہی تھی۔

سٹیشن مارٹر پر سے غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شخص پہلی ہی نظر میں اسے شبہ لگا تھا اور اب تو خاموشی دیر ہو چکی تھی۔

”کہیں کوئی لبا پھیلا نہ ہو جائے۔۔۔ کوئی قتل وغیرہ۔“ اس نے اپنے ہاتھ سے شہرہ کیا اور اسے اس اطلاع کے ساتھ پولیس چوکی کی طرف دوڑا دیا کہ سٹیشن پر ایک شخص ہجوم مارا ہے۔ اللہ وسایا نے اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ خود کشی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کا مینا بھی مرنے ہیسا ہی تھا۔ وہ اپنا سر ہموٹ سے بیٹھا تھا۔ جب ایک حوالدار تین سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔

”کون ہو تم ادے۔“ پوڑھا حوالدار لالہ لکھار۔

اس نے سر اٹھایا تو حوالدار کی آنکھیں جھپکے گئیں۔ ”او ہو! یہ تو اللہ وسایا ہے پوڑھو۔“ اسے اورے۔۔۔۔۔“ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا، ”کوئی لبا پھاٹھا نہ لیا ہے۔“

دو سپاہیوں نے اس کے دونوں بازو اپنی گرفت میں لے لیے۔ اللہ وسایا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ حوالدار اور سپاہی بہت خوش تھے۔ جیسے انہوں نے کوئی چارگانا سوا بام دیا ہو۔

چاہتا اسے شک میں گرنا کر کے لے جاتی۔ ایک روز بالآخر اسے غنڈہ اکیلے میں بند کر دیا گیا۔ آج تک اس نے جی جان سے کوشش کی کہ فوجی چاہا کہ اس کے لیے پریشانی نہ ہو تو ہلاک نہیں ایسا ہو سکے گا۔

جب وہ تین مہینے کی نظر بندی کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلا تو گھر کے بجائے اپنی دنیا میں واپس لوٹ لیا۔

پھر وہی چوچیاں، ڈکیتیاں اس کا مقدر بن گئیں۔ اس نے بڑے شہر کی چوڑی ٹریڈیاں دیکھا۔ ایک اور بڑے شہر کو اس نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ کئی تاجو بیاناں بھی قہم قدم پر مابہیں پہنچائے اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے اللہ وسایا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تھامے اور جلی اب اس کے لیے کھیل قماش بن چکا تھا۔

دن بھر کی کمائی وہ رات کو لٹا دیتا تھا۔ انہی راستوں پر پہنچتے پہلے ایک روز شاہدہ اس سے مل کر گئی۔ شاہدہ کی داستان کوئی الگ نہیں تھی اس سے۔ وہ بھی اسی کی طرح مختلف ہاتھوں سے گزرتی یہاں پہنچی تھی۔ پہلے روز اللہ وسایا اس کا کام بن کر گیا تھا۔ لیکن پہلے ہی دن اس کی جماندہ نظروں نے انکار نہ لگایا کہ یہ فاضل بھی ایک اندر سے ملے ہوئے ہے۔

جب اسے شاہدہ کے عورت چوٹے کا دار کا ہوا تو ایک روز وہ اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے اوپر چڑھا خولی اتار کر پھینک دیا اور شاہدہ کو بتایا کہ وہ صرف ایک مسلمان دیہاتی بچہ ہے۔ جسے لٹیروں نے لوٹ کا مال بنا دیا ہے۔۔۔ شاہدہ خود مرگم گزیر یہ تھی۔ نہ ان کی بلک پڑی۔ چوڑ شاہدہ ان کی دنیا کو چھوڑ دی۔ نکلی جائیں یہاں سے۔۔۔ اس نے سر پرے دھکی دیا لیکن بڑے عزم لے کر مینا لیا۔

”لیکن کہاں؟“ شاہدہ نے پوچھا۔ ”اس کی ساری بہت دور تک پہنچتی ہوئی ہیں۔ یہاں سے فلز مرتوت سوچا جاسکتا ہے وسایا۔۔۔ صرف سوچا جاسکتا ہے۔“

اللہ وسایا اپنی بہت کا چکا تھا۔ اس نے شاہدہ کو بظاہر قائل کر لیا کہ وہ یہاں سے نکلی کہ کسی دیہاتی علاقے میں چلے جائیں گے۔ اسے یاد آئی کہ یہاں سے اتنی میں دوزخ بھرا لہا لہا کا ایک دردست موجود ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور اس نے بڑے غلوں سے



اپنے عروج پر تھا۔

یہ سنگ لنگ و دوطبقوں سے ہوتی تھی کہیں تالپوں میں مل ملا کر اور کہیں بلوہ راست ان دونوں میں حوالدار بن کر اس علاقے میں نیا بنایا تھا۔ میری ڈیوٹی تھی جس سے صدی چوکی پر لگی تھی۔ وہ ایسے علاقے میں تھی جہاں ارد گرد سنگ لنگ کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے مذہب پر جاننا ہے کہ یہاں لوگ مل کر کام کرتے تھے۔ یا اس علاقے کے لوگ اس میں ملوث نہیں تھے۔ بہ حال یہ ضرور تھا کہ میرے آنے پر یہاں چوگٹیاں شروع ہو گئیں۔ میں مہم وصلوہ کا پابند تھا اور منتشر شکل بھی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے کام کے بائے ہر جگہ مولوی صاحب ہی پکارا جاتا تھا۔ میرے متعلق یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ میں غلط کام کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اچھے بڑے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں ایک مشہور سنگ لنگ رہتا تھا۔ جس کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ ہمارے پوسٹ والوں سے مل کر مال کر پا لاتا اور اسے مانتا ہے۔ میں چونکہ رات کو نکلنے والی گشت کا انچارج تھا۔ اس لیے وہ لوگ جو اس کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ مجھے بھی اعتقاد میں لیں، لیکن یہاں صورت حال ایسی تھی کہ ہر کوئی دوسرے پر شک کرتا اور محتاط رہتا تھا ان میں سے کسی نے بھی میرے ساتھ اس دور سے بات نہ کی کہ اس طرح وہ خود بے نقاب ہو جائے گا پھر یہی نیک نامی بھی اڑے آئے۔

ان لوگوں نے مجھے خود میرے سامنے آنے کے اس علاقے کے سنگ لنگ مجھے کو میرے متعلق بتایا کہ میرے مولوی بڑا سخت قسم کا آدمی ہے اور رشوت نہیں لے گا۔ اس ضمن میں میری شہرت پہلے ہی خاصی بڑھ چکی تھی اور میں نے دو تین دفعہ ایسی حرکت کرنے والوں کو پکڑ دیا بھی تھا۔ ان لوگوں کو مجھ سے صرف یہی خطرہ نہیں تھا کہ میں خود رشوت نہیں لوں گا۔ بلکہ وہ خوف زندہ تھے کہ میں ان کو ہلا دوں گا۔ یہ ساری صورت حال جب مجھے سنگ لنگ کے سامنے آئی تو وہ ضرور سمجھتا ہو گا کہ ایسا بے وقوف کون ہے جو گھر

## پہلا مرحلہ

میں جو واقعہ آپ کو سننا چاہتا ہوں اس پر جاننا ہوں کہ آپ کو مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا کہ بڑھ لکھ جانے کی وجہ سے میں بھی ایسے واقعات سننے والوں کا مسخرہ اڑا کر کرتا تھا۔ لیکن خود ان کا نشانہ بننے کے بعد سے میرے خیالات میں خاصی تبدیلی آ چکی ہے۔ ممکن ہے آپ بھی میری طرح سوچنے لگیں۔

میں نے آپ سے اپنا تعارف تو کر دیا ہی نہیں۔ میرا نام فواز خان ہے اور میں ریجر کا سابقہ حوالدار ہوں عمر کے ایسے حصے میں ہوں۔ جہاں سب چل چلاؤ والا ہی معاملہ میں نے بیس سال تک اس کہانی کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن ایک عجیب بے گناہ ہمیشہ مجھے لگی۔ یہی آج جب آپ کو یہ کہانی سنا رہا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں کچھ پس بڑوں سے جو چٹائش ہی میرے گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ نکل گئی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد بدقسمتی سے حکم نے ان علیین مقامات کو جھلکا دیا جہاں کے لیے یہ مملکت خداداد وجود میں آئی تھی۔ قائد اعظم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ملک دست کی شہادت کا سانحہ ہو گیا۔ اس کے بعد تو آٹے روز روزاڑی بننے لگیں اور ملک میں سیاسی فوٹو گرافی کا طوفان بدستیزی در آیا۔

جب بدستھی ہر طرف پھیلی جاتے تو ایسے حالات میں بدستھی عناصر ضرور فائدہ اٹھائے ہیں اور وہی ہو سکتا ہے کہ جبرائیل رواج پائے۔ راتوں رات بدست مہم جوئے کی ہر نے لوگوں کو اندھا کر دیا۔ دوسرے بہت سے جرائم کے علاوہ ان دنوں سنگ لنگ ملک



یوں بھی دیکھا تو میں ان دنوں کون چائے پیتا تھا۔

”مولوی صاحب! اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ میں آپ کو کسی پھر میں ڈالنا نہیں

چاہتا۔ میری بات غور سے کر لینا۔ آپ بال بچوں والے آدمی ہیں۔ یہاں انٹر سے پاس

تک سب ہی موزع کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے آپ کچھ زیادہ ہی دانا لڑا ہیں۔ سو دفعہ

ہوں ہر کلاس سے کیا چارے درخواست تو رہی ہے کہ ہم غریبوں کے پیٹے میں ٹانگے

ڈالنا اور مزے ایسے سُننے کے لگو کر کے کرنا نہ دیکھے گا اور ہاں اگر سنا سب سمجھ تو ہم ہر طرح

کی خدمت کے لیے تیار ہیں مل جل کر کام جو چاہئے وہی بہتر ہوگا۔ وہ بغیر سانس لیے

بولتا چلا جا رہا تھا۔

میرا خوں کھولنے لگا۔ غصے کے مارے میرے منہ سے نہ جانے کیا نکل گیا۔ میں

اٹھا اور وہاں سے چلا دیا۔ مانجھے روکنے کی کوشش نہ کی جرت اس کا مقصد

ہی مانجھے سناٹا دیا۔

میں کیٹ پیرا تو کئی بھی خیر ننگا میں میری طرح اٹھی ہوئی تھیں۔ شاید ان کو علم تھا کہ

آج ماچھا میرے ساتھ بات کرے گا۔ میرے چہرے پر غصے کے آثار کچھ کردہ لوگ بھی سمجھ گئے

کو میں ان کے تمام خیریت میں بندہ آیا۔

یہ میرا اس کیٹ پر تیسرا چہ چاندن تھا رات کو میری کشت ڈیوٹی بدل کر ننگا ٹی اور

مجھے جان بوجھ کر اس علاقے سے دور رکھا گیا۔ جس کے متعلق مشہور تھا اور میرا تجربہ بھی یہی

بتاتا تھا کہ یہاں سے باسانی سو گھلا آ جاسکتے ہیں سمجھ تو گئی۔ لیکن قانونی اور اخلاقی

دونوں طور پر مجبور تھا کہ وہی جاؤں جہاں مجھے بھیجا جا رہا ہے اپنے سروس دفتروں کے مطابق میں

اپنے انفرکٹر ڈیوٹی بدلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنے دوسرا پیرس کے ساتھ کشت پر چلا گیا ہادی ڈیوٹی ایسی ہے کہ کم کچھ کسی

اور حادثہ و مبالغہ نہ ہوتا ہے۔ اندھیرے میں چلائی گئی گولی ہمیں نظر آنے سے رہی کچھ بھی

ہر سکتا ہے ناچا کر کئی سواری ملکر نہیں تھا۔

آئی نائیگر وکیل کے کزن نکالے گا۔

اس نے فوراً براہ راست مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہماری کیٹ کے نزدیک تربیت مانجھے منگور کا گاؤں تھا۔ جہاں سے ہم مزدور یا ستر

زندگی خرید دینے جایا کرتے تھے۔ یوں بھی ہم لوگ دن میں ایک آدھ چکرا گس گاؤں کا

ننگا بھی لیا کرتے تھے۔ میں بھی اس روز رات کی ڈیوٹی ختم کر کے سو گیا اور ظہر کے بعد

جب اٹھا تو گاؤں کی طرف چل دیا میرا پورا گرام بھی تھا عصر گاؤں کی مسجد میں پڑھ

لوں گا۔

میں ایک دکان سے صابن خرید رہا تھا۔ جب مجھے ایک آدمی نے اکرا لیا۔

”مولوی صاحب آپ کو مانجھے پہلوان نے بلایا ہے“

مجھے تو اس کی بات سن کر ہی غصہ ہو گیا۔ میں حکومت کا نوکر تھا کسی مانجھے سانچے

کا نہیں۔ پھر میرا ایک بہنام منگور کے پاس خود چل کر جانا یوں بھی مشکوک بنا دیتا۔ مجھے

اچھی طرح تو دیا نہیں ہے اسے کیا تھا جس ڈانٹ کو دیکھا دیا تھا سچی بات تو یہ ہے کہ

میرا دل بھی چاہا اس کو جا کر دو چار ٹانگے منگور غاموش رہا میں اس کی شہرت میں چلا

تھا اور اس کے منہ لگنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔

میں دکان دار کو پیسے دے کر واپس ٹران ایک لمبا تر ننگا اور بڑے مضبوط جوتے

کا آدمی مجھے اپنی طرف تانکھائی دیا اس نے میرے قریب پہنچ کر مجھے سلام کیا اور مجھ سے

ہاتھ ملا کر بڑی بے تکلفی سے بولا۔

”آئیے بیٹھ کر دو چار ٹانگے کرتے ہیں۔“

”کیا بات کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔ میں تو ستر کو

چاہتا بھی نہیں۔“

”مولوی صاحب میں آپ کا مسلمان بھائی ہوں کوئی دشمن نہیں۔“

میں مزید کچھ کہنے لگے اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے دہلی ایک چائے کی دکان پر

لے کر بیٹھ گیا اور چائے کا رٹور دیا اس دکان پر میرے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں



میری آنکھیں اندھیرے میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھیں تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس طرف میرا سپاہی اکلم گیا تھا۔ چنانچہ اس طرف سے بلند ہوئی تھی۔ میری نظریں اندھیرے میں اسی طرف گڑھی ہوئی تھیں۔ جب ایک منظر نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔  
 مجھ سے لمبائی بندرہ میں گزرتی نظر اُٹھائی ایک دیا جلتا ہوا نظر آیا یوں لگتا تھا جیسے یہ دیا ہوا میں تیرتا ہوا ہو۔ میری آنکھیں گڑھ گیا۔ میری اطلاعات کے مطابق یہاں دودھ و درت تک آباد تھی کہ تھیں تان و غیرہ کا نام و نشان بھی نہیں تھا کہ کوئی اگر کسی قبر میں دیا رکھ گیا ہو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ خوف سے میری تخیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں۔  
 دل ہی دل میں میں نے آیت بکرمی پڑھنی شروع کر دی اور اس دے پر نظریں جما کر سوچنے لگا کہ یہ مجھوں ہی کی کوئی سازش نہ ہو اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور پریشانی بھی لاحق ہوئی کہ ابھی تک میرے دونوں ہاتھوں نے ملاپ نہیں کیا تھا۔

الحق غیر میرے دل سے دعا تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک سمت سے ٹارچ جل کر بھیجی میں نے فوراً دوسری طرف دیکھا لیکن اس طرف سے کوئی ٹنگلی وصول نہیں ہوا تھا۔ دوبارہ اسی سپاہی نے ملاپ کی کوشش کی لیکن اب بھی جواب نہ آیا۔ جس طرف اکلم گیا تھا۔ اس طرف سے کوئی اشارہ موصول نہیں ہوا تھا۔ تھوٹے تھوٹے لاش ہوئی ہیں نے اللہ کو یاد کیا اور خود اس کی تلاش میں جانے لگا۔ تیار ہوا اکلم اسی سمت میں چلا گیا تھا۔ جہر سے دیا فضا میں تیرتا ہوا تھا۔ میں بھی داخل چھٹیا گئے اسی طرف چلا یا میری جیت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دینے نے بھی جلتا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے میں اس کی طرف بڑھتا اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو میں نے گھبرا کر اس پر فائر کرنے کی بھی سوچی۔ لیکن پھر یک لایا کہ اگر میرے خیال کے مطابق یہ کسی زندہ شخص کی تخیلی پیر ہو تو میں فائرنگ کے لیے کیسے جواب دہی کروں گا۔

میری آنکھیں اسی دے پر لگی تھیں۔ جب اب ایک میل پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور میں منہ کے بل اسی پر گر پڑا گھبراہٹ سے میری پانچ انگلیاں نکلتے رہ گئی۔ مجھے کہتے ہوئے

بے عزتی کی اس کے بعد کچھ بھی وقوع نہ پڑ سکتا تھا۔ میں نے ذرا بھی طور پر اس کی طرف سے ہونے والے کسی بھی وار کو مستثنیٰ کیا تیار کر لی تھی۔ میں نے ڈیوٹی پر دراندازی کے وقت اللہ تبارک سے دعا کی تھی کہ وہ میری نیت کا حال بہتر بناتا ہے۔ وہی میری حفاظت بھی کرے گا۔

ہم لوگ اس مخصوص علاقے میں پہنچے تو میں ایک درخت کے نزدیک بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو دو مختلف اطراف میں روانہ کر دیا ان کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ کس خاص مقام پہنچ کر انہوں نے والیں مڑنا اور ایک دوسرے سے ملاپ کرنا تھا۔

ملاپ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص مقام پہنچ کر ایک پہرے دار دوسرے کی طرف ٹارچ سے ٹنگلی دیتا ہے تاکہ دونوں اپنی سمت کا اندازہ لگا لیں اور رات کو ٹھیک کر سرحد کے دوسری طرف نکل جانے کے امکانات بھی نہ رہیں۔

خود میں ایک راستے پر درخت کے نزدیک تاک لگا کر بیٹھ گیا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے ایک دلدزدہ چیخ سنائی دی یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کسی کا گلہ دیا ہوا ہے یہی چوں ہوں گی۔ کان آواز کی طرف لگا دیے۔

ایک ہی چیخ کے بعد پھر سننا ملا ہوا ہو گیا۔ میں بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ چونکہ ایک ہی چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس لیے سمت کا اندازہ بھی نہ کر سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہی تو ممکن تھا یہ حال میرے ہی لیے پھیلایا جا رہا ہو۔

میں اپنی جگہ جم کر بیٹھا ہوا۔ بطور احتیاط میں نے اپنی رائفل کو نائٹنگل کے لیے تیار کر لیا تھا لیکن کسی بھی واقعے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ انتظار کی شدت سے میرے اعصاب زخرفے لگے لیکن دوسری طرف وہی سننا ملا رہا۔

چند منٹ مزید گزرنے کے بعد میں بیٹھ بیٹھ اپنی جگہ سے کھسکے لگا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کسی کو میرے یہاں بیٹھنے کا علم ہو گیا ہو اسی پوزیشن میں میں کچس پوزیشن میں لگی آیا لیکن کچھ نہ ہوا۔



مارنے کی سب کو خبر ہو رہی تھی۔ میں نے اس کو سمجھا یا کہ یہ اسلام کا دم جوٹکا۔ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں لیکن وہ قسمیں کھا کر کہہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوا۔

جمعہ کے ایک بڑے کھوکھلے جو قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا الگ الگ جاکر بیٹا کر

یہ ایسی پہلی واردات نہیں ہے۔ اس علاقے میں دو تین مرتبہ پہلے ایسے واقعات ہو چکے ہیں اس نے مجھے اچھا دہی لیتے ہوئے کہا۔

”مردوں کا صاحب جس نے بھی آپ کی ڈیوٹی ادا نہ کرنا ہے۔ اس نے آپ سے

کوئی بدلہ چاہا ہے“

میں نے اس کی بات کو کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا کئی مرتبہ جی بھی چاہا کہ جو واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے وہ بھی ان لوگوں کو سنا دیا لیکن میں خاموش رہا۔ اگلی رات پھر میری ڈیوٹی اس طرف لگ گئی۔ اس مرتبہ دونوں سپاہی نئے تھے۔ میں نے ایک لفظ بھی نہ سنے نہ کہا اور اندازہ لگا کر دیکر کہے چل پڑا۔ صوفیوں میں اتنی دعا کی کہ مولا کو تو سب کے دلوں کا حال بہتر جانتا ہے اگر کوئی سازش ہے تو بھی مجھے اس کا شکلا رس لیے بتایا جائے۔ کہیں تیرے بتائے ہوئے سیرے اسے پر عمل نہ ہوں۔ اس مقام پر اگر میں تاک نہ لگا کر بیٹھ گیا اور دونوں سپاہیوں کو گشت پر بھیج دیا اچانک ایک خیال نے میرے ذہن میں سر اٹھا یا کہ میں خود اپنی جگہ تبدیل کر لوں یہ سوچ کر کراچی میں اٹھنے کا ارادہ بھی کر رہا تھا کہ وہی دیکھے اس مقام پر جتنا نظر آیا... لیکن آج نہ جانے کیوں مجھے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور دوسری سمت چل پڑا ابھی مشکل سے چند قدم اٹھائے تھے کہ کے بعد ویکرے میں جا کر گویا فائر ہوئی میں فوراً زمین پر گر پڑا اور پوزیشن میں آ گیا۔ میں نے زائل کو فائرنگ کے لیے تیار کر لیا لیکن گولی نہ چلائی۔

میں نے سوچا کہ اگرچہ یہ گویا فائر چلائی گئیں ہیں تو میں فائرنگ کر کے اپنی موجودہ پوزیشن چھوڑ دوں کہ کیوں معلوم ہونے دوں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ شخص اپنی گولی ختم کرے اس کے بعد میں اپنا کاک اس کے سر پہنچ کر اس کو کوپڑ لوں گا۔ یہ ارادہ کرتے ہی میں

یہ احساس فرو نہ ہوا کہ میں کس انسان کی جسم پر گرا ہوں گرتے ہی میں نے سمجھ لیا اور بڑا زور لگا کر اپنے حلق سے ”ہاٹ“ کی آواز نکالی۔

اس کے ساتھ ہی کاپیتے ہاتھوں سے ٹاپیج روکشن کی نو میری جیت کی انتہا نہ رہی یہ میرا چاہی اسلام تھا وہ بے ہوش تھا۔ میں نے آفر اتفری نہیں اس کو ہوش میں لانے کی عمر میری شروع کر دی۔

اسلم ہوش میں آیا تو خوف سے کانپنے لگا۔ میں نے خطرات سے بے نیاز ٹاپیج جلد نے رکھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔

”ادھر ادھر...“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اس سمت اشارہ کیا۔ جہڑھے دیکھا اس کا نظریہ اسلام تھا اور کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور وہ کانپنے لگا میں سمجھ گیا کہ خوف سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ خود بھی سمجھا ہوا تھا لیکن ابھی اس کی طرح میرے اور سامان خلا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا ہی دل میں آیا تفرائی کا درد شروع کر دیا اور اس کو کمر لاکر کرکٹ کی طرف جانے لگا۔

اس دوران نہ جانتے ہوئے بھی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دیا غائب ہو چکا تھا۔ میں اس کو سہارا دے کر کرکٹ میں لے آیا اور ایک چار پاٹی پر ٹکڑیا۔ اس نے ابھی تک مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ یوں لگا جیسے اس کی زبان گنگ ہو چکی ہو۔ کپٹ پر موجود سپاہی بھی دہی لگے۔ میں نے جو کچھ بھی یاد تھا پڑھ کر اسلام پر پھینکا اس کے اوسان بحال ہوئے لگے اس نے ہوش میں آنے پر بتایا کہ کسی ناویدہ طاقت نے اس کا ٹکڑا کھونٹنے کی کوشش کی تھی۔

میں کسی بزدلی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس کو کپٹ والوں کی ٹھکانے میں سے کر والیں لگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے دوسرا سپاہی بھی مل گیا۔ جسے ان واقعات میں کسی کا بھی علم نہ تھا وہ بالکل ناراض تھا۔ ہم نے ڈیوٹی کا وقت اکٹھے گزارا اور اس کو میری نے بتا دیا کہ اسلام کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اپنے متعلق اس کو کچھ نہ بتایا۔

آدھی رات کو ڈیوٹی ختم کر کے ہم کپٹ میں آکر سو رہے تھے تب تک اسلام والے



لیکن یہ میرا ان دیکھا محسن کون تھا؟ اس دیے کا راز کیا تھا اور وہ میرے  
 علاوہ کسی اور کو کیوں نظر نہ آیا؟ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ بس ایک ہی  
 بات میرے ذہن میں آئی کہ میں نے اللہ سے مدد مانگی تھی اور اس نے میری  
 مدد کی۔

فاخرنگ کی سمت چلے نکلا۔ اچانک ہی فضلاء بچوں سے لڑ گئی لڑائی لگا جیسے کوئی کسی کو زبرد  
 کر رہا ہے۔ مجھے کل والا واقعہ یاد آگیا۔ کسی غیر انتہائی عمل کے تحت میں آواز کی سمت آگیا  
 کر رہا تھا۔

یہ بھاگنے کا طریقہ میری تریبیت کے اصولوں کے بالکل خلاف تھا لیکن میں اس لئے مجھے  
 خود پر اقتدار نہیں رہا تھا اپنے علاوہ مجھے اور بھی بھاگتے قدموں کا آواز ہی سنائی دیا۔  
 شاید میرے دونوں سپاہی بھی اسی سمت بھاگتے آرہے تھے۔ میں نے مارچ چلائی۔  
 بچوں کی آواز بند ہو چکی تھی، جلد ہی میری ٹاریچ کی دشمنی ایک انسانی ڈھیر پر پڑے  
 لگی۔ میں اس کے نزدیک جا کر گر گیا۔ اس دوران دونوں سپاہی بھی بھاگتے ہوئے وہاں  
 پہنچ چکے تھے۔ افسوس اس کے ہاتھوں سے بالکل کر دوزخ جا کر تھی اور خود وہاں لوہڑے  
 منہ گر رہا تھا۔ دونوں سپاہیوں نے مل کر اس کو سیدھا کیا۔ میں نے مارچ چلا کر دیکھی۔ خدا  
 کی پناہ! بیوقوفانہ سہل گھڑتا۔ اس کی آنکھیں بال بال باہر آنے لگی تھیں اور گردن پر سخت  
 گرفت کے آثار بخوبی دکھائی دیتے تھے ہم نے جھک کر اس کی نبضیں ٹپو لیں۔

ماہر سہل گھڑ چلا تھا۔

اس کی لاش کیٹ پڑا گئی، جسم پر خراشیں تک نہیں آئی تھیں، لیکن گلہ دارانے  
 کے دبانے کے نشانات بڑے واضح تھے یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اس  
 نے ہی مجھ پر فاخرنگ کی تھی۔ کسی نے اس کو بتا دیا تھا کہ میں کسی جگہ ناکر نکلا کر  
 بیٹھنا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی اس کو لائی تھی کہ میں نے کیٹ پر سمیٹتے  
 ہی کمپنی کا بلڈ کر اس کے مستحق پر لٹ دے دی تھی۔ یہ بڑی خفیہ کارروائی تھی لیکن  
 اس کو اس کے ایجنٹوں نے مطلع کر دیا۔

ماہر تھا تو عمومی عقل کا بہرہ شاہ وہ سینچ پا ہو کر مجھے مارنے پر تل گیا اس کو یہ  
 اطلاع تو مل چکی کہ مخالفت علاقوں میں نہا کے کہاں لگتے ہیں۔ میرے وہاں پہنچنے پہلے  
 ہی وہ اپنی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی اس نے چار گولیاں ہی پھلائی تھیں کہ کسی نادیدہ طاقت  
 نے اس کا گلہ دار کو اس کو جہان سے مار ڈالا۔



لگا تھا۔

”فرمائیے۔“ دکھاندار نے کہا۔

”میں شریف آدمی ہوں۔ دوسرے شہر سے بچی کو علاج کروانے یہاں لایا تھا۔ معلوم نہیں تھا۔ اتنا زیادہ خرچ ہو جائے گا۔ کچھ عزیز زبیر شہر دار بھی یہاں ہیں لیکن کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرم آتی ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو یہ گھڑی رکھ لیں۔“

”بھائی صاحب!“ زبیر شہر دار تو آج کل کے ہونے نہ ہونے کے بلکہ بڑے ہی۔ کیا بڑا زمانہ آگیا ہے۔“ اچھا دکھائیے تو گھڑی۔“ دکھاندار کا لہجہ بڑا نرم آمیز ہے۔ دیہاتی اس دوران خاموش ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات ہیں۔ دکھان دار نے گھڑی کو الٹ پلٹ کر سرسری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ ”گھڑی تو پانچ سو سے کم کی نہیں ہے جناب؟“ دکھاندار نے کہا، ”لیکن میں معافی چاہوں گا۔ حالات آج کل خفا سے خراب ہیں۔ ہم لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے پولیس بھانٹے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ میں آپ پر شک نہیں کر رہا لیکن...“

”خدارا صرت اڑھائی سو روپے ہی دے دیں۔ میں کیا بٹاؤں خدا کسی کو اس طرح جوہر دکرے۔“ اس مرتبہ قاعدہ آس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے تھے۔

”گھڑی تو ٹھیک ہے نا؟“ دیہاتی نے پوچھا۔

”بظاہر تو ٹھیک ہی نظر آ رہی ہے نا؟“ دکھاندار نے کہا۔ میں نے اس کے اندر گھس کر تو دیکھا نہیں۔“

”آپ گھڑی مجھے دے دیں۔“ دیہاتی نے جو صلہ کر کے بالآخر اس سے کہہ دیا۔

”اللہ تمہارے بھلا کرے“ زبیر شہر دار نے گھڑی اتار کر دیہاتی کی طرف بڑھادی اور اڑھائی سو روپے بغیر گنے جیب میں ڈال دیے۔ آنسو بہتہ ویرا کس کی آنکھوں میں بھی جملا رہے تھے۔

## حمید البوری والی

پاکستان کے ایک مشہور شہر کا پر رونق بازار، زندگی کی گلیاں بھی یہاں عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ایک دیہاتی باؤ چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں جابا تھا۔ اس کی خواہش ہے کوئی تھوڑا خرید کر گھر لے جائے۔ ایک گھڑی سازی کی دکان پر کھڑا وہ ایک گھڑی کی سودا بازی میں مصروف ہے۔ اس دکان سے کچھ فاصلے پر اڑھ ہلا سگریٹ انگلیوں میں پھینٹا ہے، باوجود شہریت کا مالک، خوش لباس، انگلی میں جمی سونے زرورڈ لگاؤ کی انگوٹھی پہنے درمیانی عمر کا ایک شخص دکھاندار پر نظریں جمائے کھڑا ہے۔ دیہاتی کے دکان پر پہنچے ہی اس کی تیرمیر نظریں اسی جانب لگ گئی ہیں، جیسے کھڑا کھڑا وہ اکٹا گیا ہے۔

ایک چمک اس سوز شہر کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے جیسے بھیڑیے نے پناہ گاہ دیکھ لیا ہو۔ دکھاندار نے اسے مخصوص سنگل دے دیا ہے۔ ہاتھ میں سٹگنٹ کو پاؤں تلے مسل کر وہ بڑا گھبرا ہوا دکان کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی حرکات و کائنات سے یہی اندازہ ہو رہا ہے۔ جیسے بے چارے پر چاٹک کوئی بیتا آن پڑی ہو۔

”بھائی صاحب! دودھ منٹ ذرا میری بات سن لیجیے۔“ وہ دیہاتی اور دکھاندار کی گفتگو میں مداخلت کرتا ہے۔

دکاندار متوجہ ہوتا ہے۔ ”میں ایک صیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اگر آپ براہ کرم میری مدد فرمائیں۔“ اس کی آواز پراگئی اور وہ چپ ہو گیا۔

”اللہ رحم کرے۔“ دیہاتی کو اس کی شریفانہ وضع قطع دیکھ کر ترس آنے لگا۔



دے اُسے اٹھایا اور برآمدے میں لٹا کر اُسے ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ بڑی جان توڑ کر کشتوں سے قریب پانچ چھ منٹ بعد اُسے ہوش آیا۔ بے ہوشی کے دوران اس کی قیامت کی جیب سے شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کے لکھے ہوئے دو نسخے باہر آن پڑے تھے۔ جن پر مختلف دوائیاں لکھی تھیں۔ ایک میڈیکل سٹور کی سبب بھی اس کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ جن پر دوائیوں کی قیمت کا ٹوٹل سات سو اور کچھ روپے لکھے تھے۔

سالہ سالہ ان لوگوں کی بچھڑی آئی۔ یہ بیچارے غریب پریش تھا اور قیمتی دوائیاں خریدنے کی استطاعت اُس میں نہیں تھی۔ یہ گھوڑا زاپتی سو تلخ خدمات کے لیے کچھ زیادہ ہی شہرت رکھتا تھا۔ ایک نوجوان لوط کے نے بڑی ہمدردی سے اس سے پوچھا کہ اُسے کیا تعلیم ہے؟

”اگر کسی کی قیمت خراب نہ کرے۔“ جیل بائیں نے کراہتے ہوئے کہا ”جبار جو ان بیٹوں کا باپ ہوں“ پھر اُس نے رو ہانسی ادا میں ایک دردناک کہاں نہ مادی کر کس طرح بیوی کے مرنے پر اُس نے اولاد کی خاطر دوسری شادی نہ کی اور آج جب وہ کمانے کے قابل ہو گئے ہیں تو اُسے کوئی سونگھانے کو بھی تیار نہیں۔ اُس کا اندازہ گفتگو ٹریفک اور پڑھے لکھوں کا سا تھا۔ سننے والوں کے دل پھل گئے۔ وہ اپنی کہاں نہ سکا اور ان کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کو مڑا۔ لیکن انہوں نے اُسے روک لیا اور اُس کے انکار کے باوجود زبردستی ایک ہزار روپے اس کی جیب میں ڈال دیے۔

چند روز بعد جیب انہوں نے اجاڑی ایک نو سو بائز کی گرفتاری کی خبر اور اُس کے کارناموں کی تفصیل پڑھی اور تصویر بھی دیکھی تو سرپیٹ کر رہ گئے۔ یہ وہی ”ذات شریف“ تھے جن کی مدد انہوں نے زبردستی کی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ بیچارے خود ہی شرمندہ ہو کر چھپ ہو رہے کہ اپنی بے وقوفی کا قصہ پولیس کو کیسے سنائیں۔

غلام علی کا باپ حال ہی میں کافی جائیداد چھوڑ کر امیر تھا۔ غلام علی آوارہ لوگوں

دیہاتی باؤ بخوشی سے جھومتا ہواں سے روانہ ہوا۔ اب وہ گاؤں کا ہر کسی پر عجیب کاغظ رکھتا تھا۔ گھڑی واقعی بڑی قیمتی اور شاندار تھی۔

دیہاتی کے دواں سے ملتے ہی وہ ”شریعت آدمی“ دوبارہ دکان پر گیا۔ تنو کا ایک نوٹ دکاندار کی طرف بڑھایا اور اپنی راہ لی۔ دوسری طرف دیہاتی بیچارہ اٹھی گاؤں پہنچا ہی تھا کہ گھڑی نے کام کرنا بند کر دیا۔ گاؤں کے ایک دو گھڑی سازوں کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ سوائے گھڑی کے ڈال کے باقی سب کچھ نقلی ہے اور اس کی مشینری کو اتنا ہی چھنا تھا جتنا چل سکتا ہے۔

دیہاتی بے چارہ ایک موم بوم سی امید کے سہارے پھٹیاں گزارنے کے بعد دکاندار کے ہاں پہنچ گیا۔ دکان دار نے پیٹے تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ پھر دیہاتی کے یاد کرنے پر اسے یاد آ گیا۔

”میں نے تو پہلے ہی تمہیں منع کیا تھا۔“ دکاندار نے اُس سے کہا۔ ”تم پیٹیدو لوگ ہوتے ہی لالچی ہو۔ اب بھگتو۔“ اور دیہاتی بے چارہ اپنا سامان لے کر واپس آ گیا۔

لاہور کی ایک ماڈرن آبادی کا شاندار منظر:

گھر کے مین گیٹ کے سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈالے خوش گھسیں میں بیٹھ رہتے تھے۔ اپنا ٹاک ایک خاتون نے گھبرا کر کھلے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک سفید پوش درمیانی عمر کا باریش شخص دل پر ہاتھ رکھ کر لکھوڑا اس طرف آ رہا تھا۔ سب حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ برآمدے کے نزدیک وہ کسی نہ کسی طرح لکھوڑا ہوا پہنچ ہی گیا۔

”پہ..... پہ..... پانی۔“ اس کے منہ سے بمثل نکلا وہ دھڑام سے گر پڑا۔

گھر کے مین گھبرا کر اُس کی طرف بڑھے۔ دو نوجوانوں نے اس کی لمبوں میں ہاتھ



اور "آغا صاحب" آغا صاحب "ہونے لگی۔ وہ چادروں فلم ہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے آغا صاحب کی تعریفوں کے وہ پلی باندھے کہ غلام علی جو تماشا دیکھنے والے میں گلیا تھا تو ہوا گیا۔ آغا صاحب نے آؤ میروں کو چائیں دیتے ہیں۔

اُسے پہلے ہی ایسے مہربان کی تلاش تھی۔ غلام علی نے چاکر بڑھ کر ان سے دعا سلام لے لیکن بہت پرچی اور آغا صاحب اب گے بڑھ گئے۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب؟ منا چاہتے ہیں آغا صاحب سے؟ ایک خوش پوش نوجوان نے ہمدردی کے چوہے ہیں پوچھا۔

"جی ہاں؟" غلام علی نے بخوش نکل کر کہا۔

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟" نوجوان نے کہا: "یہ کوئی فانی ٹریڈر نہیں انکار کیا کہ بندہ اس ٹان میں لگا ہوا ہے۔ در نہ یہاں تو ایک سے ایک بڑھ کر زعموں کی اولاد ہے۔ آغا صاحب کی مہربانی سے مجھے سبک و دست دین فیموں میں کام لینا ہے۔ در نہ میری نو جو تیاں لگھیں گی تھیں، سٹوڈنٹ کے پیکر کھٹے کاٹتے۔" نوجوان نے آغا صاحب کی سخاوت اور شرافت کے پانچ چھ قہقہے بیان کر ڈالے۔ غلام علی اس کی باتوں کے طلسم کا اسیر ہوتا چلا گیا۔

دس بارہ منٹ کے بعد وہ دونوں بہترین دوست بن چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک بوتل میں بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی اپنی درد بھری کہانی سنا رہے تھے۔ اس نوجوان کی کہانی بھی غلام علی سے بالکل اپنی جاتی تھی۔ وہ کبھی کھانے کا درکار تھا ایک ٹکٹ کے شوق میں ہزاروں روپے برباد کرنے کے بعد پالا خوشا صاحب کی مہربانی سے کسی قابل ہوا تھا۔ اس نوجوان کا نام مظفر تھا۔ اس کی گفتگو بڑی مٹھوس اور مدلل تھی۔ غلام علی کو نظرا پینے کرانے کے مکان میں لے گیا اور اگلے روز آغا صاحب سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا۔

وہ سات غلام علی نے سمجھتے جاگتے گزار دی۔ خوشی کے مارے اس کی توفیق ہوئی کہ گڑبڑ تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور بدولت میں ہوا کہ آغا صاحب کے درمیان گئے

میں گھر سے پھرنے اور شہر جا کر نہیں دیکھنے لگا۔ والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے روپے پیسے کی کمی کبھی محسوس نہ ہوئی۔ نہیں دیکھتے دیکھتے شو بڑنگ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور سٹوڈنٹ کا رخ کیا۔ باپ کی زندگی ہی میں صاحبزادے نے ایک درسوں سے باقاعدہ عشق بھی فرما کر شروع کر دیا تھا۔

بات آگے بڑھی تو سٹوڈنٹ سے کوٹھے پر آمد و رفت شروع ہو گئی۔ غلام علی نے اپنے مختصر تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ یہ ایک پسینہ سوائے فنانسروں کے کسی عیش نہیں فرماتیں۔ لاکھوں کی جائیداد کا اکلوتا مالک ہونے کے ناطے اس کے دل میں خواہش انکڑیاں لینے لگی کہ وہ بھی سارن جاٹے اور نہ صرف دوست میں ہاتھ لگے بلکہ راجہ اندر بن کر بیٹھا ہے۔

باپ کی زندگی میں ایک مرتبہ جب اس نے ماں کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو ماں نے صاف صاف کہہ دیا کہ والدین کی زندگی میں یہ بات سبک دین نہیں، اس وقت تو غلام علی چیب ہا تھا۔ لیکن یہ خواہش اس کے دل سے نکلی نہیں تھی۔ باپ کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ اس نے زمین کا سودا اودھنے پونے داموں کیا۔ کرنسی سے برہیت کلیں بھرا اور سٹوڈنٹ کے شہر کا رخ کیا۔

ٹیکسی میٹر کے ایک کونے میں پان سکرپٹ کی دکان سے، اس نے ایک فنی دفتر کا پتہ پوچھا اور دکان میں لگے بیٹھے۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھ کر "آغا صاحب" نے جو بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے وہیں کھڑے تھے۔ آنکھوں پہ آنکھوں میں نہ صرف غلام علی کو تولیہ، بلکہ اس کی قیمت کا انڈاز بھی لگا گیا۔

غلام علی کو شاید اس کی ایک دفتر کا نام یاد تھا۔ دکاندار کے بتائے ہوئے راستے پر وہ اس بلاگنگ تک پہنچ گیا۔ وہ یہ پھر ہیاں پڑھنے لگا تو اس نے ایک باعجب شخصیت کو سکرپٹ کے مرغولے بناتے وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا۔

آغا صاحب تھے۔  
فلم ڈائریکٹر آغا صاحب کو دیکھتے ہی تہن پان آدھی ایک کران کے نذر یک پہنچ گئے



فلم کی تیاری اور غلام علی کی شہرت اور مدد لہندی کا فتنہ انہوں نے ایسا پیش کیا کہ غلام علی جھوٹا اٹھا۔ اگر کوئی کسروں کی تو وہ رات کو پوری ہو گئی۔

رات کو آغا صاحب اور ظفر کی معیت میں غلام علی کو بازار حسن کے ایک کوٹھے پر لے جایا گیا اور اس کی ملاقات ایک نوخیز اور مستحیل کی آنحضرتی جونی فنکارہ سے کروائی گئی۔ جس کی من موہنی اداؤں نے غلام علی کو مری طرح متاثر کیا۔ اس رات غلام علی واقعی خود کو راجا اندر محسوس کر رہا تھا۔ عازر جو اس کی فلم کی ہیروئن تھی۔ اس پر جان پھرک رہی تھی۔

غلام علی کے حکم پر وہاں کرنا ہی کٹر منگوا لیا گیا اور جیب رات کو ناؤ نوش کا ہنگامہ گرم ہوا تو ظفر نے ہیرو اور ہیروئن کو آرام کرنے کے لیے الگ کر دیے۔ صبح بھج دیا۔ وہ رات غلام علی کی قسمت کے نابوت میں پہلا کیل ٹھونکتی گئی۔ صبح غلام علی نے دس ہزار روپیہ بطور ایڈوانس ہیروئن کی مال کو تحفہ دیا اور دس ہزار روپیہ انجام الگ دے دیا۔ آغا صاحب کا پانچ ہزار تو رات ہی ظفر نے انہیں دیں دلا دیا تھا۔

صبح عازر اور غلام علی کو سٹوڈیو لے جایا گیا۔ ان کا سکرین ٹیسٹ ہوا اور ریڈیٹ پر جو تجربہ سب ہی بلوں نے انہیں سے قبل کا کامیاب ترین جوڑا قرار دیا۔ انہاں صاحب نے اپنے دفتر ہی میں غلام علی کی فلم کا بلورڈ لشکا دیا۔ مارگم کی پہلی ہی سے موجود تھی۔ دوسرے تیسہرے روز کافی کجی کے سامنے غلام علی سے الٹی سیدھی حرکتیں کروائی جانے لگیں۔ کچھ آغا صاحب پانچ ہزار میوزک ڈائریکٹ کے لیے ایڈوانس مانگ رہے تھے تو کچھ تین ہزار کیریئر بین کے لیے اور کچھ کئی کے لیے۔ ہر روز آغا صاحب عازر اور اس کی مال کی معیت میں دعوتیں ملائی جاتیں۔ ہیروئن غلام علی کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لیے نکل جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ستر ہزار روپیہ مارگم کی طرح اڑ گیا پھر دس ہزار روپیہ اور پھر دس ہزار روپیہ۔ اس کے بعد غلام علی کی بیوہ مال کو ہوش آیا اور اس نے باقی پونجی پرشتہ داروں کی مدد سے آخری عمر کے لیے لو کر لی۔

پندرہ بیس منٹ بعد آغا صاحب تشریف لے آئے۔ ظفر اور غلام علی نے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی۔ آغا صاحب سلام کا جواب دے کر بیٹھے۔ سب سے پہلے انہوں نے چٹاڑی کو ہدایت کی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے کیونکہ آج وہ معروف ہیں اور ان کا منہ بولا بیٹا ظفر آیا ہوا ہے۔

ظفر نے غلام علی کا تعارف اپنے ایک عزیز کی حیثیت سے کرایا اور آغا صاحب سے درخواست کی کہ جس طرح انہوں نے ظفر کا ہاتھ تھا تھا اسی طرح وہ غلام علی کو بھی سہارا دیں۔ آغا صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے ظفر کو بے بھاؤ کی سنا دی کہ اس نے فلم انڈسٹری کو کھیل تماشہ سمجھ رکھا ہے۔ جس کا دل چاہتا تھا کہ ہیرو بننے کے لیے آگیا۔ لیکن اس صورت حال کے لیے ظفر نے غلام علی کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ منت سماجت کر کے اس نے آغا صاحب کو ٹھنڈا کر لیا۔

آغا صاحب نے پہلے تو غلام علی کو سمجھایا بھجایا کہ ہر خوراد تیر تمام ہے بس کا روگ نہیں۔ اب بھج وقت ہے والیں لوٹ جاؤ۔ بڑے بڑے جی داروں نے اس میدان میں پہنچ کر کاناں کو ہاتھ لگا کر قورہ کی اور بھاگ گئے۔ لیکن انہوں نے غلام علی کو ادا دے کا پکاؤ کچھ تو غفلتو کارغ بدل گیا اور انہوں نے ان لوگوں کی کہانیاں سنانی شروع کیں جو بالکل ٹشٹ پونجی تھے اور آج وہ آسمان شہرت پر چلے گئے ہیں۔ دولت ان کی باندھی ہے۔

غلام علی نے بتایا کہ اس کے پاس ستر ہزار روپے ہیں۔ آغا صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے پچاس ہزار میں فلم تیار کر دی جس کا ہیرو غلام علی تھا اور ہیروئن سے ملنے اسے رات کو رہا تھا۔ پچاس ہزار میں فلم بنانا ممکن تھا۔ لیکن آغا صاحب کے اثر و رسوخ کے سامنے ہر چیز ممکن تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ صرف بیس ہزار روپیہ ایڈوانس ایکٹروں اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کریں گے۔ باقی بیس فلم پزیر ہونے کے بعد ادا کئے جائیں گے۔ تیس ہزار روپے شوٹنگ اور باقی ساٹھ چھپے گا اور کوئی اور بھی فلم مکمل ہوئی وہ پانچویں سے ایڈوانس پر لو کر باقی کام بھی چلا دیں گے۔



انہری اگر رضانت، مقتدرے کے پیکر میں پرگے توڑ دے تو عمر گزار جائے گی۔

اللہ دین سیدنا سادہ بندہ، عدل و انصاف اور صبر و سزا کی اس دنیا کے ارباب میں صورت یہ جانتا تھا کہ یہاں ٹائڈ ٹھہرتے ہیں جو بے دے کر معطل رہنے دینے کر دیتے ہیں۔ ملک صاحب، کو بھیجیں اس نے ایسی ہی کوئی جہتی جان لیا۔ منشی آگے لے کر ملک صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ ملک صاحب کے تو انداز ہی نہ تھے۔ وہ اللہ دین کی سوچ سے مختلف تھی اور ہی قسم کی ہستی تھی۔ دروازے پر اس جیسے تین جاندار اور ضرورت مند کھڑے تھے۔ جن کے کام حال ہی میں انجام پائے تھے۔ منشی نے لے کر اندر داخل ہوا تو ملک صاحب نے بغیر آن کی طرف نگاہ اٹائی سلام اجواب دے کر سامنے رکے ایک ٹیلیفون کا نمبر گھبراہٹ پھر انہوں نے فون پر پوچھا کہ یہ فلاں تھا نہ ہے؟ جواب ملنے پر حکم ہوا کہ الیہا یا بیچہ او کو بلاؤ۔ اس کے بعد انہوں نے قتلانیدار کو رہنمائیں جیسے وہ ملک صاحب کا زرخیز غلام ہو۔

فون رکھنے کے بعد بھی وہ گالیاں دیتے ہوئے منشی سے مخاطب ہوئے یہاں کیا مصیبت آگئی ہے؟ انہوں نے پچھا ڈھانے والے لمبے میں پوچھا۔

جواب میں منشی نے اللہ دین کی کہانی سن کر وہ دم کی دیر خواست کر رہی۔ منشی کی بات ابھی ناقص ہی تھی کہ ملک صاحب کے کمرے سے منکلمات کا طوفان ابل پڑا۔

بالآخر منشی کی رستہ سمجھتا ہے ان کا دل تسکین گیا۔ انہوں نے اللہ دین کو لوگ روز کچھ پھر آئے کو کہا۔ اگلے روز اللہ دین خوش خوش کچھ ہی پہنچا۔ ملک صاحب سے ملاقات ہوئی اور علم ہوا کہ ”سچ صاحب“ ریٹائرنگ بدامین آرام فرما رہے ہیں۔ اللہ دین کی آنکھوں کے سامنے ملک صاحب سیرھے ریٹائرنگ بدامین جا گھٹے۔ ”قریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ برآمد ہوئے اور ”سچ صاحب“ کے در پر گئے۔ گفتگو کرنے لگے۔ پھر انہوں نے اللہ دین اور منشی کو چھپے آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ ہی کی کٹھن میں بیٹھے اللہ دین نے ان کے لیے پیر تھلک چائے منگوائی۔

اب کو بھیر اور کو بھیر ٹرن، لٹو ختم ہونے تو دیا نے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر فلک نے عجیب نظارہ کیا کہ گاؤں کے چوہ بڑی کا میٹا ورد کا محتاج ہو گیا اور آج چوہ بڑی غلام علی ”گالماں لائٹ مار“ کے نام سے ایک سٹوڈیو میں ٹین کی چمکتی ہوئی سیٹ باغوں میں کھڑے بڑا دبی حالات کا ردنا دہا ہے۔ اس چمکتی سیٹ پر اس کی بدستی کی داستان بھی جلی رونق میں کھلی نظر آتی ہے۔

خدا کی کو کچھ ہی کا منہ نہ دکھائے۔ مین گردن حالات اچھے اچھوں کو کیا ہے یا دکھاتی ہے۔ تقدیر کے سامنے بندہ مجبور محض ہوتا ہے۔ اللہ دین بھی گردن حالات کا شکار ہو کر کھڑی نہ جا پہنچا تھا۔ شریف آدمی بے چارہ پانچوں وقت کا نمازی، نس گھر، مسجد اور دکان کی ٹکون ہی میں اس کی زندگی بھر رہی تھی کہ ایک روز لالاح ملی کر صابروانہ خٹانے میں بیٹھے والد کو یاد فرما رہے ہیں۔

اللہ دین گھبرا گیا۔ اس نے بزرگوں سے شن رکھا تھا کہ پولیس کی گاڑی اور کھڑا دی دروازہ ہی ٹری ہیں۔ بچہ بھی شریف تھا پھر یہ آخر بیٹھے بھٹائے کیا مصیبت آن پڑی۔ تھانے پہنچ کر علم ہوا کہ راج کے لوگ بس نیکیر کو تنگ کر رہے تھے۔ جب وہ زنج ہو کر ان سے جھگڑا پڑا تو باقی سب بھاگ گئے اور اللہ دین کا بیٹا دھریا گیا۔ پولیس کو گھر سے گھر پڑے سے کوئی عرض نہیں۔ کوئی شریف ہے یا بدعاش۔ اس بات سے بھی انہیں کوئی علاقہ نہیں۔ وہاں تو جو عھن گئی بھن گئی۔

پانچ چھ سو روپیہ قتلے میں اٹھ گیا اور رضانت نہ ہو سکی۔ بیٹا جو ملشیل بلانڈ پڑ چلا گیا۔ اللہ دین شریف آدمی، عدالت، پھر کی ڈی دنیا سے بالکل نادان تھا۔ اگلے روز حبیب متعلقہ عدالت کے باہر پہنچا تو ایک دیل کا منشی اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے بڑی درد مندی سے اللہ دین کی کہانی سنی پھر عدالت کے اسرار و رموز سے آگاہ کر کے بعد براہ ریت کی کر و دیوں کے چکر میں نہ پڑے۔ یہاں سیدی انگریزوں گھنہیں نکلا کر کہا۔ اس نے اللہ دین کو ”ملک صاحب“ کے ہاں جانے کو کہا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور ملک صاحب مدبر راضی ہو گئے تو وہ مل لاکر ٹائی گئی غائب کر دیاں گے نرسے کا بانس نہ بچے گی



”اس اٹھی کا منظر بٹھا ہوا۔“

کاٹھیلیوں کے خریچ پانی اور لہریجات پر ڈیڑھ دو سو روپے مرزا ملاحظہ کئے  
پلٹا تو اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ دفتر تھا کہاں۔ جب مختلف نشانیوں کی مدد سے ایک  
اڑ میں پہنچے تو وہاں ملک صاحب کی بجائے کوئی چھٹی صاحب فوج تھے۔

الٹو دینے نے اپنی دامستان الماسی اور اس ملک زادے کا بجز افریقہ یا تو چھٹی صاحب  
ارے اس طرح کی شکل و شبہات کا متشی انہوں نے دو ماہ قبل ملازم رکھا تھا۔ یہ بھی ٹھیک  
ہے کہ دفتر میں زیادہ تر وہی بٹھا کرتا تھا۔ لیکن وہ تو پیروں ہی آٹھ دس دن کی چھٹی اور ایک ماہ  
کی اڈاؤں سے تنخواہ لے کر بیٹھا ہے۔ کیونکہ گاؤں سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کی بیوی مرے  
کی والی ہے۔

ایڈریس پر تفتیش کی گئی تو اس جیسے اور نام کے آدمی کا در در ملک کوئی نشان مل سکا  
میں بیٹھا تھا۔ پولیس نے پراپیروٹی ڈیلر سے ضمانت ایک چھٹی طلب کر لی اور کیس داخل  
درج ہو گیا۔

مظلوم گھڑی فروش، دل کا مرین دکھایا، اپنی دنی کا آغا صاحب اور پھر  
کی دنیا کا ملک صاحب چار شخصیتیں ہیں بلکہ ایک ہی ذات ثریعت ہے جس کو لوگ  
میرا پوری والا کے نام سے جانتے ہیں۔

جیسا اس کا اصلی نام ہے؟ یہ بھی کوئی یقینی بات نہیں وہ ایک وقت چوہدری،  
بھٹی، ملک، خان، پراچی، باجوہ، آغا اور مزاج نے کیا کیا کرتا ہے۔ میری اور اس کی  
بلی ملاقات ایک دہائی صاحب کے ہاں ہوئی تھی۔ جہاں وہ اپنے دس پندرہ مقدمات  
میں سے کسی ایک کے متعلق جانکاری حاصل کر لیا تھا۔

مصلحتی سر، سرخ و سفید رنگت، اس پر ہندی لگی۔ چھوٹی چھوٹی دائرہ، سر پر چاقو لٹی  
نلوار نہیں پہنے وہ کسی محلے کی مسجد کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بھی سر لے کر  
دلیل و دست سے پوچھ لیا تھا کہ ایسے شریف لوگ بھی اس کے پاس جھین جاتے ہیں؟ اور  
جب اس نے مجھے اس ”شرعی آدمی“ کے کارنامے بتائے شروع کیے تو مجھے یقین ہو گیا

ملک صاحب نے کہا، ”اچھی کیسے کام نہ کرتا میرا۔ میں نے ہی تو اسے فلاں پکڑ  
سے نکالا تھا۔“

انہوں نے الٹو دین کو بتایا کہ پیروں اس کا بیٹا رہا ہو گھر پہنچ جائے گا۔ اور  
دو ہزار روپے ہتھیالیے۔ جن میں سے ان کے لیے ایک بیوٹی کوڑی بھی حرام تھی  
وہ الٹو دین کو لے کر عدالت کے ”ریڈر“ کے پاس پہنچے۔ جس کے گرد ارد گرد لوگوں کا  
اس قدر جھگڑنا تھا کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ملک نے آگے بڑھ کر  
الٹو دین کا اس سے تعارف کروایا۔

”ٹھیک ہے بزرگو“۔ ریڈر نے کہا۔ ”پرسوں آپ گیارہ بجے آجائیں  
کام ہو جائے گا۔“

دو ہزار روپے میں جان کی غلامی ہونے پر الٹو دین نے سونفل سکرانے کے  
گزراؤں اور دو روز بعد جیب وہ متعلقہ عدالت میں پہنچا تو اس کا کام ادا ہو چکا  
تھا۔ ریڈر نے مقدمات کے کاغذات کی نقیبیں تیار کر داری تھیں۔

”لیکن ملک صاحب کو کچھ اور...“ الٹو دین نے گھبراتے ہوئے لہجے  
میں کہا:

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ ریڈر نے انھیں نہیں سنا دی۔“  
جواب میں الٹو دین نے ساری کہا فی سادہ۔

”تمہارا داغ تو ٹھیک ہے بڑھے؟“ ریڈر نے کہا۔ ”مجھے تو اس شخص نے  
میت سے صحت اتنی بات تھی کہ تم خرم لینا اور ان پڑھ آدمی ہو۔ میں تمہارے کاغذات  
کی نقیبیں تیار کر دے دوں۔ میں نے خدا خوفی سے یہ کام کر دیا۔ اندر خانے کیا کر ہے۔  
مجھے اس کا علم نہیں۔“

الٹو دین بے چارہ روتا پیدھا پوٹا لیسٹیکٹیشن بن گیا۔ تھا بیدار رہے اس کی کہانی سن کر دو  
چار کامیاب اسے اور دس پندرہ اس فراڈیے کو دی، جس نے اس کے ساتھ یہ ہاتھ کیا تھا  
اور وہ کاٹھیلی اس کے ہمراہ کر رہے کہ وہ اور فوراً اس نوکر کو قتل کر کے لادے۔ جیسے



واقعہ آپ کو کتنا دیر نہیں۔ ان واقعات میں اس نے کمال احسان سے کام لیتے ہوئے اپنی دنیا کے کئی رازوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

حمید کی پیدائش مشرقی پنجاب کے ایک شہر میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ انگریزوں کی فوج میں ملازم تھا۔ اس لیے گھر سے دور دار بڑا تھا۔ یہ وہ دور تھا۔ چپ ہندوؤں کی فوج میں شری کا آغاز ہوا تھا اور لوگ اس طرف کھینچے جا رہے تھے۔ حمید کو فلیپ دیکھنے کی سہولت کے زمانے سے بچ گئی اور ایک روز جب وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اپنے ایک دوست کے درغلا نے پوچھتے قرار ہو گیا۔

اس کا دوست حمید سے قریب دس سال بڑا تھا۔ اور ایک مجرم گروہ کا ایک منٹ۔ اس نے حمید کو بہتی میں سیدھا اپنے گروہ کے ہاں بیٹھا دیا۔ گروہ نے دیکھا کہ لڑکا سچا لڑکا ہے اور بہت سوچ بوجھ رکھنے والا اور سرخ و سید رنگت کا لاک ہے تو اس نے بچے کا نام فتح کا حمید کترا بنانے کے اس کے متعلق کچھ اور بھی منسوب بنایا اور اس پر عمل پیرا ہو گیا۔

یہ گروہ اپنے زمانے کا مشہور گھٹک ہوا تھا اور اپنا سلسلہ وہ مشہور زمانہ امیر علی گھٹک سے ملاتا اور اس پر بلاخر کیا کرتا تھا۔ اس نے حمید کی تربیت — ”سٹڈینٹس“ بنیادوں پر کی۔ اسے اپنے ذریعے پر رکھنے کے بجائے اپنے گھٹک بن کر رکھ لیا۔

حمید بتاتا ہے کہ بہتی میں اس نے جی بھر کے عیاشی کی مٹی سے نئی فلم، گھونٹا پھینکا، سیریاٹے، کھانا پینا۔ یہی تھی اس کی زندگی۔ اس نے بچے لیے برقعے، تنگ مال باپ کو بھولنے رکھا۔ کہو گروہ گروہ نے اس کا ہر دوسری طرف لگا دیا تھا۔ اسے آپ بہتی وائٹنگ ”کرسٹین“ کہہ سکتے ہیں۔

وہ حمید کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ عمر صرف پندرہ سال تھی۔ وہ جیپ تراشے، چاقو چلانے کا ماہر اور نوروز باند بن گیا۔ اس نے اپنی گھنٹا دنی زنگی کا آغاز چھوٹی چھوٹی داروالاتوں سے کیا۔ پہلے پہل تو گروہ ہر فائدہ دانت پر اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ پھر

گروہ شریفیت کم اور ”ذات شریفیت“ زیادہ ہے۔ اس کی عمر ساٹھ بیسٹھ سال ہو چکی تھی میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے کھیلے تین بار سال سے مکمل تو کر کر لی ہے اور کوئی داروالات نہیں کرتا۔ لیکن اس پر اسے لگے ہیں بن چکے ہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ داروالات کے پکے کارٹا رہے تو بھی نہ نہٹ سکیں گے۔

یہ نورمناز حمید بوسہ والی کے نام سے پولیس کے حلقوں میں مشہور تھا۔ میرا واسطہ نہ لگ گیا میں بڑے اچھے اور بہت بڑے قسم کے لوگوں سے ملتا ہے۔ کئی لوگوں نے مجھے اپنی باتوں سے، عادات سے، کارناموں سے متاثر کیا۔ لیکن حمید بوسہ والی ایک ایسی شخصیت تھی۔ جو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی اور میں اسے شاید کبھی بھلا پاؤں۔

میں نے پولیس دوست سے درخواست کی کہ وہ میرا تعارف اس سے کر دے پہلے تو اس نے مجھے منع کیا۔ کیونکہ اسے اب بھی دھڑلکا ہوا تھا کہ اگر کبھی اس کی فطری جبلت اس پر غالب آئی تو میں ممکن ہے کہ حمید مجھ سے بھی کوئی ہاتھ کر جائے۔

ویل صاحب نے اگلے ہی روز جاری ملاقات کروادی اور میرا تعارف ایک جرنلسٹ دوست کی حیثیت سے کروایا۔

”اسے ماہ پھر تو اپنے ہی گھر کے بندے ہوئے۔“ لفظ جرنلسٹ پر اس نے قہقہہ لگایا۔

حمید نے لگا لگاٹ کا پانی بیاتھا۔ بچو بچو گھوما تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے فاصلہ قری ہو گیا۔ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک ہوٹل میں چلے گئے، جہاں اس نے مانی کی گر دھڑاٹے ہوئے اپنی کتاب زندگی کے مختلف ادراقات میرے سامنے کھولی دیے۔

اس کی داستان طلسم ہوئی مابے زیادہ دلچسپ، سنسنی خیز اور طویل ہے۔ اتنی طویل کہ اسے لکھنے کے لیے بھی عمر خضر درکار ہوگی۔ میں نے اس کے جدید چہرہ



سے بھی پڑی تھی۔ انہوں نے جلد ہی ہمارا سراغ پایا۔ یہاں وال گلی نہ دیکھ کر ہم بال بال نواکسٹر دہلی چلے گئے۔ دہلی میں میرے استاد نے ایک نیا دھندہ شروع کر دیا۔ جس نے بعد میں ”پٹر“ کا نام اختیار کیا۔ ہمارا طریق کار سٹینک اور کھنڈر تھا۔ ہم اپنے شکار کو ٹاٹ لیتے۔ پھر اس کے راستے میں ایک پوٹلی بھینک دیتے۔ جس میں نقلی سونے کے زیورات ہوتے تھے۔ لیکن یہ نقل اتنی مہارت سے تیار کی جاتی تھی کہ مہل کا گمان ہوتا تھا۔ یوں بھی جیب آدمی لالچی ہو رہا ہو تو اسے نقل اصل نظر آتی ہے۔ میرا گورو علم نفسیات پڑھے بغیر بہت بڑا ماہر نفسیات تھا۔ وہ انسانی فطرت کے گہرے پہلوؤں پر نظر رکھتا تھا اور اسے استعمال کرنے کا فن بھی خوب جانتا تھا.....“

”آپ ذرا تصور کریں کہ ایک شخص ملتا ہوا سرک پر جا رہا ہے اچانک اس کی نظر ایک پلرے کی پتیلی پر پڑتی ہے وہ بڑی بے قراری اور تجسس سے بڑھ کر قبلی اٹھا لیتا ہے۔ جس میں سونے کے زیورات رکھے ہیں۔ ابھی وہ پتیلی کو بھینکے کی فکر ہی کر رہا ہوتا ہے کہ ہالایک ساتھی وہاں اچانک ایک کونے سے نمودار ہو کر پیچے جا رہا ہے۔ وہ اسے ایک طرح سے ہاتھوں میں لٹا لیتا ہے۔ اب یہ ہالایک شکار ہے۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ ہالایک ساتھی سونے کی قیمت لگا کر اس کا چوتھا حصہ اس سے طلب کرتا ہے۔ اگر وہ شخص اس پکڑ میں نہ پھنستے اور کہے کہ وہ تو زیورات تھا نے میں جمع کروائے گا۔ تو وہاں فوراً دوسرا ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہالایک سارے ساتھی ایک بڑھری صورت سمیت آ جاتا ہے اور اس پر جبری کا الزام لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی کچھ دے کر ہی اس کی جان بچتی ہے.....“

”یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک ماہر میں ”پٹر“ پڑ جائے وہ اس سے بچ کر نکل جائے اس بیلکیم میں ہم نے نئی اختراعیں کیں اور ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ آپ کی عقل حیران رہ جائے۔ اسی سلسلے کا ایک واقعہ سننا ہوا۔“

”یو۔ پی کے ایک نواب صاحب کو شکار کا شوق تھا۔ ایک رات وہ اپنے دو بکوں

آہستہ آہستہ اُستے اُستے ہوتا شروع ہو گیا تو اس نے حمید کو اکیلے اپنی اُصلی ہتھیار لگانے اور چوہر دکھانے کے لیے چھوڑ دیا۔

اس نے بتایا کہ پہلے پہلی اس کا گورو اور وہ دونوں جھگڑا یوں کا بھیس بدل کر بمبئی کی امیر اور حضور اینگلو اڈرین اور مرغی آباد یوں میں چوبیاں کرتے رہے۔ اس کے لیے انہوں نے بڑا سیرھا طریقہ اپنایا تھا۔ دونوں سادھوؤں کا روپ دھار کر بھینک مانگنے نکل جاتے۔ اکثر وہ ماڈرن آباد یوں ہی کا رخ کیا کرتے تھے۔ بھینک مانگتے ہوئے وہ اس بات کا اندازہ لگا لیتے کہ گھر کے افراد کی تعداد کتنی ہے۔ اکثر ایسے گھروں میں ان کا واسطہ آگاہ کاٹیم صاحبان یا ان کے خاندانوں ہی سے پڑا کرتا تھا جنہیں جلی دے کر وہ گھر میں داخل ہو جاتے اور دن کے آجائے میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر حیرت ہو جاتے۔

بمبئی کو ٹی جھوٹا سا شہر تو نہیں تھا لیکن کب تک۔ بالآخر بھینک کھل گیا اور پولیس کو اطلاع ملی کہ چور دی دو پیرا سرار سادھو ہیں جو خود کو کاشی اور متھرا کے پجاری بتا کر بھینک مانگنے نکلے ہیں اور صفایا کر کے جھگڑ جاتے ہیں۔ پولیس نے اپنا جال ان کے گرد بننا شروع کیا اور آہستہ آہستہ وہ گورو کے ڈیرے تک آگئے۔

یہ گورو پہلے ہی ایک ریاست سے غور و خفا اور یہاں آشرم کھولے بیٹھا تھا۔ اس آشرم کا اکثر یہ وہ اپنا دھندہ بھی چلا رہا تھا۔ حمید نے بتایا:

”وہ اس رات جب انگریز پولیس کپتان اپنی وائسٹ میں بڑی چالاکی سے آشرم کے گرد گھیر ڈالے ہوئے تھے اچانک دھواں بول کر اپنے جوائن سمیت ہمارے آشرم میں داخل ہوا ہم ایک ٹرک میں کے آرام وہ کیمپاؤنٹ میں بیٹھے، بڑے امیرانہ طحٹ سے سحر کر رہے تھے۔ ہمارے نمونہ کلکتہ تھی۔ دو عینے تک تو گورو چیلنے کے لیے گر گلچرے ڈالے۔ جب نگال ہونے لگے تو ان کے کی فکر دامن گیر ہوئی اور ہم نے وہی بمبئی والا چکر یہاں بھی شروع کر دیا لیکن کلکتہ کی پولیس قریب آدھے سے زیادہ سالکان اور انگریز افسروں



”جس شخص نے یہ تحریر لکھی وہ راجہ کا دیوان تھا۔ یہ اُنہی کی ذاتی ڈائری تھی۔ اب  
ای بات نواب اور اُس کے ساتھیوں کی کچھ میں آگئی کہ اصل معاملہ اُس دُفعے کا ہے  
”کہ جس کا ذکر اس ڈائری میں موجود تھا۔ یہاں سے بمشکل بیس بائیس میل  
اور تھی۔“

”نواب اور اس کے ساتھیوں نے اس خزانے کی تلاش کالامہ کر لیا۔ ابھی آدھی  
ات باقی تھی۔ انہوں نے محل کا انتظام بھی مناسب نہ سمجھا اور خزانہ محکم کے سرے میں دیے  
ڈائری کے مطابق ٹوٹا پھٹا مندر بھی مل گیا۔ وہ محفل نشانیوں بھی وہاں موجود تھیں۔ جن  
کا ذکر ڈائری میں کیا گیا تھا۔ ایک مخصوص مقام پر جس کی نشاندہی ڈائری نے کی۔ انہوں  
نے کھدائی شروع کر دی۔ اُن کی توقعات کے مطابق جلد ہی وہاں سے چاندی کے  
پائے پائے دستیاب ہوئے گئے۔ اس کے بعد کچھ پائے برتن لکے اور دو گھنٹے کی  
بان بول کھدائی کے بعد کوہِ مقصود بھی پاؤں لگ گیا۔ یہ سگوان کی کھدائی کے تاہرست  
میں رکھی ہوئی سمونے کی ایک مورد تھی جس پر پائیں بیرون کا جھڑا دیکھا  
گیا تھا۔۔۔۔۔“

”عین اُس لمحے جب وہ مورد کی کوہکھڑا ہوتے تھے۔ گور کے مسلح ساتھی آرہے تھے  
اور انہیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ انہوں نے نواب کے ساتھیوں کو دھکی دیتے ہوئے  
ہوئے بتا کر وہ توان کا مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں شک تھا کہ ڈائری  
میں موجود ہے۔۔۔ مختصر یہ کہ بات یہاں پر ختم ہوئی کہ مورد کے بعض نواب اور  
اُس کے ساتھی ملیں۔ ہر تیار دیکھ دیں گئے۔ جو اُس زمانے میں بہت بڑی بات تھی  
لیکن یہ بھی مدِ نظر ہے کہ مورد کی بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم کی نہیں تھی۔ راتوں رات  
خفیہ طور پر لوہے کے تلوے کھل گئے اور ان لوگوں نے آپس میں مل کر ۲۰ ہزار روپیہ ملیں  
فرار کر دیا۔ صبح جب انہوں نے کسی سار یا جوہری کو بلا کر مورد کی کیفیت معلوم  
کرائی تو انہیں یہی جواب ملا کہ یہ سب مال اُنھی ہے۔ اس واقعے نے بہت  
شہرت حاصل کی اور کئی روز تک زبان زدِ فاضل اور عام رہا۔۔۔۔۔“

کے ساتھ خوش گیلوں میں بہ مشغول تھے۔ وہ لوگ جس علاقے میں مقیم تھے۔ اس کے قریب  
اتنا قریب تھے۔ ان کھنڈرات میں سے اکثر لوگوں کو سمونے کے لئے اور دیگر لوازمات  
ملے تھے اور ان واقعات نے فاضلی شہرت پائی تھی۔ ہمارے گورونے اسی شہرت سے  
فائدہ اٹھانے کے لیے ایک طریقہ سوچ لیا جو کسی انگریزی ناول کے پلاٹ سے کم  
نشاندہ نہیں۔۔۔۔۔“

”رات کا دوسرا پر تھا۔ نواب صاحب اور ان کے ساتھی شغل سے نوٹھی میں صرف  
تھے کہ اچانک ایک آدمی جو خاصا زخمی تھا وہاں آگھسا۔ نواب اور اُس کے ساتھی گھبرا گئے  
کر یہ کیا مصیبت آگئی۔ صورت حال اتنی سنگین ہو گئی کہ وہ فوریہ ہو گئے۔ زخمی نے  
ان سے درخواست کی کہ اُس کے تعاقب میں کچھ لوگ ہیں جو قلیٹا اسے مار ڈالیں گے  
اُس کے پاس ایک بوسیدہ سی ڈائری تھی۔ جو اُس نے نواب کے ساتھیوں کو دے کر  
کہا۔ اگر زندگی باقی رہی جس کی نظر نہیں آتی وہ اُن سے ڈائری واپس لے لے گا اور  
وہ باہر نکل گیا۔“

”ابھی اُسے گئے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ تین جہاز مسلح آدمی وہاں آگئے  
انہوں نے نواب اور اُس کے ساتھیوں کو دھکیلا شروع کر دیا اور غور کو انہوں نے  
چھپا کر رکھا ہے۔ انہوں نے ساری حویلی کا کوہکھڑا شروع کر دیا اور غور کو انہوں نے  
دیتے چلے گئے۔ وہ گورے کی طرح آئے اور گورے کی طرح چلے گئے۔ کوئی کچھ نہ سمجھ  
سکا شہر کا اثر بھی تھا۔ اُن کے جانے کے بعد نواب کو خیال آیا کہ وہ لوگ اس زخمی  
کا تعاقب کیوں کر رہتے تھے پھر ان کا خیال ڈائری کی طرف گیا۔ اس کے اوراق پر سیدہ  
اور تحریک سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے ڈائری کا مطالعہ کیا۔ اس میں اس علاقے کے ایک  
قدیم مندر سے متعلق پورا پورا بیان دینے والی بات لکھی تھی کہ مندر کی فلاں جگہ سے کھائی  
کر کے پورے سار ہو گا۔ یہ خزانہ دورانِ غدر چنگا آزادی ۱۸۵۷ء میں ایک سیاست  
کے ہمالا جھانے میں کھپا دیا تھا۔ اُسے دوبارہ نکالنے کی مصلحت نہ مل سکی کیونکہ وہ  
خود ملیں مارا گیا تھا۔۔۔۔۔“



کر دیا۔۔۔

اب میں تھا اور میرا گورو۔۔۔ ایک روز بڑا عجیب حادثہ گزرا۔ گورو نے ایک بازار میں ایک انگریز کو تارا۔ جس نے اپنی پتیلوں کی کچھلی جیب میں پیر رکھا ہوا تھا۔ ہمارا طریقہ واردات یہ تھا کہ ایک شخص سائیکل پر تیار ہوتا۔ دوسرا واردا کرتا۔ خطرے کی صورت میں وہ سائیکل کی طرف بھاگتا۔ سائیکل چلانے کے ہم ہمارے وہ سائیکلوں کا دور تھا۔

میرے استاد کے ہاتھ بڑے کچے تھے۔ لیکن اس روز اس نے انٹریوں کی طرح کچا ہاتھ ڈالا۔ انگریز جبردار ہو گیا۔ استاد کے ہاتھ بڑے تھوڑے لگے تھے۔ لیکن اس نے انگریز کو چوکا ہوتے دیکھا تو فوراً چاقو نکال لیا۔ یہ انگریز کوئی عام آدمی نہیں بلکہ علاقہ کا ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ ہم چونکہ یہاں نئے آئے تھے۔ اس لیے اسے نہیں جانتے تھے۔۔۔

”پولیس کپتان پہلے بھا اور پٹا تو اس کے ہاتھ میں سرکاری ریلوے دکان کی دیا استاد نے ایک لمحہ حائل کیے بغیر چاقو نکھڑوں کے مخصوص انداز سے گھس کر اس پر پھینکا۔ نشانہ چوگا گیا اور بچائے دل میں پیوست ہونے کے چاقو اس کے کندھے میں لگا۔ پولیس کپتان نے فوراً ریلوے فائر کر دیا۔ آپ اسٹاپ کے لیے سوائے فرار کے اور کوئی راستہ باقی نہ رہا تھا۔ وہ بھاگا اور دو گولیاں اس کی پشت میں گئیں۔ کسی کوئی طرح وہ بچھڑ گیا۔

”میرے تو پہلے ہی ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے اسے سائیکل پر بٹھایا اور سائیکل دوڑا دیا۔ پولیس کپتان کو زخم کاری لگا تھا۔ وہ گر پڑا اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس حالت سے ہم نے فائدہ اٹھایا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک محفوظ جگہ نہ رکے نہ اسے سمیٹ کر لے سکتا کی سانس کھڑے تھی۔ اس نے مجھے سائیکل روکنے کے لیے کہا۔ میں نے استاء کو زمین پر ٹپا دیا اور جا کر اہم کے بڑھ کر اس کے منہ میں پانی ڈالوں لیکن گورو نے ہاتھ کے اشارے سے رُک جانے

میرے گورو نے ایسی بے شمار وارداتیں کی تھیں۔ وہ بتایا کرتا تھا کہ یہ پیشتر اسے دسے میں ملا ہے اور اس کی قریباً اسی طرح زندگی بنارس کی ٹھکڑوں کے ساتھ گزری ہے۔ ان دنوں اسے عام نہیں تھے۔ پولیس جرم کو پکڑ کر دم لیتی تھی۔ سزا اتنی سخت کہ جو ایک مرتبہ جیل میں چلا گیا۔ وہ ساری عمر جیل کے تصور ہی سے کانپتا رہا۔ جیلوں میں آج کل جیسے سموتیں نہیں ملتی تھیں۔۔۔ خزانے والی واردات شاید اس دور کا سب سے بڑا وار تھا۔ جس نے پولیس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بڑے بڑے ہوشیار پولیس فاسر اس کیس پر کام کرتے گئے۔ لیکن ہم اسی روز وہ شہر چھوڑ گئے تھے۔ ہمارے گروہ کا ایک آدمی اس واردات کے تقریباً ایک سال بعد کسی اور واردات میں گرفتار ہوا تو اس نے پولیس کو اس واردات کی تفصیل بتا دی۔ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی پکڑے گئے۔ لیکن میں اور گورو محفوظ رہے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک تھا۔ لیکن جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ یہ ہندوستان ہی کم از کم اتنے بڑے پائے پر واردات کرنے کا موقع پھر نہ مل سکا۔

”یہ غالباً ۱۹۴۷ء کا دو سو پانچویں مہینہ تھا۔ میں اب کوئل جوان بن چکا تھا۔ گھر سے فز ہوئے ایک عرصہ گزری تھا۔ اس دوران میں نے کبھی کبھی گھر آنا جانا بھی شروع کر دیا۔ لیکن میرے گھروالے جو اب میری حقیقت جان چکے تھے۔ مجھ سے کھینچ لے۔ ایک روز فالڈر نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر راولپنڈی میں رہنا چاہو تو ہم اگلے درجہ جہاں جی چاہتا ہے چلے جاؤ۔ ٹھکی اور نوٹس بازی میری سرپرست میں داخل ہو چکی تھی۔ میں اپنے شہر بھی آتا تو کاٹا کاٹا واردات کر دیتا۔ ایک مرتبہ پولیس میرے گھر کے دروازے تک آکر واپس گئی۔ اس کے بعد میں نے منہ سب بوجھا کہ دوبارہ یہ فوجیت آئے۔ میں نے ایسا نڈاری سے اپنے حالات پر غور کیا۔ میں برائی کی دلدل میں اس قدر گہرا دھنسی چکا تھا کہ لیکن ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو فکرم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ میرے مال باپ اور بہن بھائی بھی میری وجہ سے بدنام ہو رہے تھے، لیکن برائی جیت گئی اور میں مار گیا۔ دوستوں نے مجھے گھر سے بھاگ چلنے پر مجبور



ان دونوں کی آنکری ملاقات ہوئی تھی۔

”میں نے جہاں سے کہا کہ وہ میرے اُستاد کا پیر بھی لائی ہے۔ اس زمانے میں آس

کا بھی شاگرد نہیں تھا۔ پیر روز کی بک بک جھک جھک ٹھیک نہیں۔ کوئی سیدھا

سادا شخص تیار کر باقی زندگی آرام سے گزر جائے۔ جہاں پہلے تو خاموش رہا۔

پھر اگلے روز کچھ بتانے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے روز بھاری ملاقات ہوئی تو ہم دونوں

اپنی اپنی مشقت سے فارغ ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ جہاں پہلے تو چپ چاپ گہری

نظروں سے پیر کا ہارہ مینا ہا پھر لولا ”پیر بھگے ہ... مزے کرو گے بیٹا! میرے

پیر بھائی کے شاگرد ہو دو وہ یہ راز تو قہر میں میرے ساتھ چلا...“

”ضرور بخوں گا۔“ میں نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

”جا پڑے مروج کر۔ اب ساری زندگی کوئی دھندہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے

گی۔“ اس نے میری پیٹھی پر ہتھ پکڑ لی اور میری ٹریفک شروع ہو گئی۔

”میری سزا پھر ادا تھی۔ ایک مہینہ صفائی کا باقی پانچ ماہیں جہاں سے ٹریفک

لیتا رہا۔ اس دوران میں نے ڈاڑھی بڑھائی تھی اور اس لئے تھالی اچھے معائنہ کرے۔

لازیر پر بیٹھا بھی شروع کر دیں۔ آخری ایک ماہ میں نے بغیر نہانے گزارا اور جلی

سے رہا ہو کر باہر نکلا تو میرے سر کے اچھے ہونے اور ڈاڑھی کے سبب ترتیب بالوں نے

مجھے کوئی اور بھی ہر چپ دے دیا تھا۔

”باہر کر رہیں نے اپنے دوستوں کی اختیادہ ساتھی تلاش کیے اور ایک عورت کو عمر

لا جو بارہ دھندے میں چارے لیے اکثر کھانے کرتی رہتی تھی۔ سبز رنگ کا ایک لباس

پورا جس میں بے شمار جھبیس لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ترتیب تن کر لیا۔ اس کی مختلف

بیروں میں کیا انکم عظم موجود تھا۔ اس کا علم میرے اور خدا کی ذات کے سوا اور کسی کو

میں تھا۔ پختاب کے ایک ڈور دروازے اور چارے جالی علاقے کو ہم نے اپنی سرگرمیوں کا

کرز بنانے کا فیصلہ کیا اور چارے جالیوں کے ایک گاڑی کا انتخاب کر لیا۔

”گاڑی کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے میں نے ڈیرے ڈال دیے اور درخت

کو کہا۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس نے سر تے مرتے پہلی فیصلہ کر لیا۔ ”ایسا تو اس

دھندے سے تو سیر کر لو۔ اگر جان ہی رکھنا ہے تو کبھی کی کو سامنے نہ بنانا۔“

”میں نے اس کے بعد ساری زندگی اس اصول پر عمل کیا اور کبھی کوئی باقاعدہ گروہ

بنایا نہ کسی اور گروہ میں شامل ہوا۔ وقتی طور پر لوگ آتے جاتے رہے اور دھندہ چلا رہا

اُستاد کی موت نے مجھے تو پھر ڈر ڈالا۔

لیکن گورو کی موت کا مدد مجھے کراچی لے گیا۔ کراچی بڑا شہر، بڑے لوگ، بڑے

بھنگے، شہر کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میرے دھندے کے لیے یہ شہر

موزوں تھا۔ میں نے دھندہ شروع کر دیا اور ایک باجیل جانا پڑا۔ اس قید کے دوران

ایک پرانے ساتھی سے ملاقات ہو گئی۔ یہاں وہ جہاں لوگ نام سے مشہور تھا۔ جہاں کو

میں نے اپنے گورو کے ہاں آئے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن گورو نے اس کا تعارف میرے

ساتھ نہیں کر دیا تھا۔ اس میں بھی یقیناً کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ میرا استاد بڑا گرا

آدمی تھا۔ اس کو مکمل طور پر خدا کی ذات ہی سمجھ سکتی تھی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے

کہ اس کی موت تک میں اسے ہندو سمجھتا رہا۔ مرنے کے بعد اس کے مسلمان

ہونے کا علم ہوا اور اس بات کا بھی کردہ پختاب کے ایک علاقے کا رہنے

والا تھا۔...

”جو شخص میرے استاد کا ساتھی رہا ہو وہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ پتہ

چلا کہ جہاں لو پر جمعی سونا فروخت کرنے کا ارادہ ہے۔ جمعی سونا فروخت کرنا بچوں کا

کھیل نہیں ہوتا۔ ہمارے پیشے کے بڑے پیرا نے گئے ہی اس میں بیان میں پاؤں

رکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔ جہاں دوسری بار میں بند تھا۔ ہماری ملاقات جیل کے

اعطے میں ہوئی۔ اس نے مجھے پہچاننے سے دعاں انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے اسے

یقین دلایا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ گورو کے ذکر نے اسے کچھ سوچا اور دیا تھا۔ بہت

دیر تک میرے استاد کی باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں کس زمانے میں بڑے گئے یا۔

رہے تھے۔ پھر استاد کو اس سے الگ ہونا پڑا اور اس کی موت سے پانچ چھ ماہ پہلے



اس کے خاندان نے باہر کھڑے ہو کر انتہا کی کرکچے کے حال پر ترس رکھا مگر اس کے لیے دعا کر دیں۔ میں دوا دے کر آیا پیچھے چلا تے بچہ نظر ڈال کر اندر چلا گیا۔ اندر بیٹھ کر میں نے انہوں کی سیاحت سے تعویذ لکھا اور اسے دے دیا۔ میرے خاندان خاص نے وہ تعویذ پانی میں گھول کر بچے کو پلا دیا۔ چند منٹ کے بعد ہی بچہ گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے ماں باپ میرے پاؤں میں بیٹے پر مشغول رہے۔

”اس علاقے میں جو بیڑے شہر تھے اور مچھروں کی بہنا ت سے ملیر یا پھیل رہا تھا۔ میرے گروہ کے لوگ کوئین کا سفوف تجھے پہنچا دیتے اور میں چینی میں ملا کر اس پر جوتہ منتر پڑھ کر بھیجتا تھا اور مریض کو پانی میں گھول کر مرنے کی ہدایت کرتا۔ چینی کا ڈالہ کوئین غلے سے کھڑا ہو جاتا۔ جسے میرے خاص لوگ میری جی کے کلام کا اثر بتاتے۔ یہ سفوف ملی چینی پیتے ہی مریض کو خوب سیدھا آتا اور بخار اتر جاتا۔

”اسی طرح مختلف امراض کا علاج ہونے لگا۔ سرور و دانت درد و دودھ کرنے کا تو میں اسپیشلسٹ بن گیا۔ دودھ دار کے کھانے سے لوگ علاج کروا نے میرے پاس آنے لگے۔ میں سادہ دین میں صحت دے دیتے۔ ”فیض“ ”سچا پانی“ باقی تمام وقت چکرے میں لیٹا رہتا۔ جہاں میرے قریبی میری خاطر مہارت میں مصروف رہتے۔ رفتہ رفتہ میرا چہرہ طوط جھونے لگا۔ نہرانے کے نام پر دولت کے ڈھیر لگنے لگے۔ میرے لیے خصوصی کھانے کی کمراتے لوگوں کی شدید خواہش ہوئی کہ میں ان پر خصوصی مہربانی فرماتے ہوں ان کے ہاں کچھ دن کے لیے قیام کروں لیکن میں تنہا میں سے پیشہ کل پانچ خوش متعلقہ کو شرفت یا بیانی پختا کرتا ....

”ان لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر میں نے دونوں ہاتھوں سے انہیں خوب دلا۔ میری ایکٹ عورت لوگوں کے گھروں میں چلی جاتی اور لکھنے کے کسی کوئی نہیں جو چاہے تو میرا سر کے بال اور اسی طرح کی کچھ چیزیں چھپاتی۔ اس کے بعد بڑی استادی دے وہ ان لوگوں کو وہ ہم میں مبتلا کرتی کہ ان پر وہ شیخ نے جادو کر دیا ہے۔ انہیں میرے پاس لایا جاتا اور میری جگہ کاٹ کر اگلے روز حقیقت حال بتانے کا وعدہ کرتا۔ اگلے روز

سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ علی صبح جب گاؤں کے کچھ لوگوں نے وہاں ایک فقیر خداسست کو دیکھا تو میرے نزدیک آئے اور ایک گھنڈ بچے بلانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میں خاموش رہا۔ بلکہ ان سے بالکل بے نیاز منہ ہی منہ میں کچھ بیڑے پڑا آ رہا۔ وہ بے چارے بھاگے بھاگے گاؤں میں گئے اور ایک پیر فقیر کی مریجوگی کی دھوم مچا دی۔ گاؤں کے لوگ اس طرح اٹھتے چلے آئے۔ ... تین روز تک وہ لوگ مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دنیا بھر کے لوازمات کا ڈھیر انہوں نے میرے سامنے لگا دیا لیکن میں نے ان کی طوط نظر بھی نہ کی اور اپنے حال میں مگن رہا۔ یہ تین دن اور راتیں میں نے جاگ کر گزار دی تھیں اور اس کے لیے پہلے سے کافی پیش کش کر رکھی تھی۔ چوتھے روز میری طوط سے پہلی درخواست ”کاغظا ہو جا۔“

”میرا ایک ساتھی ایک بچے کو لیے آیا ہے بھرنے کا اٹھا اور بچہ مری طرح رہ رہا تھا۔ میں نے اس کے ڈک پر ہاتھ پھیرا۔ بچہ ترسکوں ہو گیا۔ اس کو سوجھ بھی نہ ہوئی اور آرام گیا۔ جانگل کی روک ڈرا میرے گن گانے لگے۔ یہ بالکل معمولی سی بات ہے۔ اگر آپ بھی چاہیں تو یہ قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ سادہ بھادوں سے پہلے انہوں پر بوجہ آجاتا ہے۔ اگر آپ آرام کے ٹور کو دیر تک ہاتھوں میں مسکتے رہیں اور یہ عمل تین بار روز جاری رکھیں تو وہ اڑھائی ماہ تک آپ کو بھی یہ قوت حاصل ہو جائے گی کہ بوجہ کے کاٹے پہ ہاتھ پھیر دینے سے سوجھ نہیں رہے گی۔ اس کے بعد تو وہاں بھڑے کاٹے ہوئے لوگوں کا اتنا بندھ گیا۔

”دوسری درخواست کا مظاہرہ بھی تھوڑی ہی مدت کے بعد ہو گیا۔ ایک عورت درد سے بے حال پیچھے چلا تے بچے کو لے کر آئی۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے ایک کمرہ بنا دیا تھا۔ میں اس میں بند پڑا۔ الٹی میں مصروف رہتا اور وہ باہر جگمگاٹا لگاٹے بیٹھے رہتے۔ دن میں ایک دو مرتبہ میں باہر آ کر کان کراٹنے دیکھ کر واپس مہارت ایک شخص کو اندر جا کر مجھ سے ملنے کی اجازت تھی اور وہ میرا خاص آدمی تھا۔

”یہ مدت ہوا درد سے بے حال بچہ ہمارے گروہ کی اسی عورت نے وہاں پہنچایا تھا



اس کے بعد میں نے دوسرے شہر کا رخ کیا اور پڑی کامیابی سے یہ ناکس وہاں بھی کھلیتا رہا۔

”پانچ چھ سال میرا یہ دھندا جاری رہا۔ لیکن ایک روز ایک گاؤں کے لوگوں کو مجھ پر شک گنوارا۔ انہوں نے مجھے کسی کی بیوی کے ساتھ پکڑ لیا۔ میرا منہ کالا کر کے گھر سے پرچھا اور سارے گاؤں میں گھمایا اس کے بعد ان لوگوں نے میری اچھی خاصی ٹھکانی کی اور مجھے حوالہ پولیس کر دیا۔

اُس جرم میں وہ سال قید جھگڑا کر میں رہا ہوا تو پھر بھی یہ سوانگ نہ بھرا ایک اور شہر کا رخ کیا اور چھوٹی موٹی وارداتیں شروع کر دیں۔ اس دوران کئی مرتبہ جی میں آئی کہ اسے اسے اگر یہ کے قانون کی برکتیں چودہ مہینا چھوڑ گیا ہے۔ اس ملک میں جس شخص نام ایک دفعہ پولیس کی لسٹ میں آگیا۔ وہ پھر بھی شریفانہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس کے لیے زندہ رہنے کا صحت اور صحت ایک ہی راستہ رہ جانا ہے کہ چپ چاپ پولیس کو اس کا جھوٹا بیٹا رہے اور اپنے کام میں مبتلا رہے۔ جب کبھی میں نے غلوں میں سے اس بات کی کوشش کی کہ میں یہ ذیلی پیشہ چھوڑ دوں۔ مجھے کسی دوسرا اندام میں گرفتار کر کے جالات میں بند کر دیا گیا۔

”ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ یہ میرے عروج کا زمانہ تھا۔ ان دنوں میں ہاتھ ڈالا بیسے ہی کا کرتا تھا۔ میرے علم میں بالو صدیق نام کا ایک آدمی آیا۔ جسے راتوں رات امیر بننے کا شوق تھا۔ ایسے لوگ جو لالچ اور بھوک کے مارے ہوئے ہوں۔ ہمارے غاصر شکار بننے میں۔ میں نے ایک تیار کی ٹوڑیا بلو صدیق سے ہم لے کر ہمارے آدمی اٹھایا سے پوری لے کر آئے ہیں جو ہم سے دواوتے آتے ہو یا کر سکتے ہیں۔

”بالو صدیق کے تعلقات ایک سنار سے تھے۔ اس نے سنار سے ۱۰۰ سو روپے ادھار پکڑے اور اپنی زندگی بھر کی جمع شدہ پونجی بھی اس میں شامل کر کے یکے بڑا پکڑ

میں بڑے جلال میں آکر انہیں حکم دینا کہ فرماں جگہ سے توبہ یا فلاں شے زمین کھود کر پکڑ کر لو۔ اس کے بعد وہ میرے لیے مریہ ہو جاتے۔

”ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ میں نے ایک اور گھنٹا ڈنا دھندا بھی شروع کر دیا اسٹانی ہوئی اسے کیا لڑا سمجھاتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ بھی مجھے یہ مذہب دھارے کے بعد ہوا تھا۔ دیہات کی عورتیں مجھ سے ختم نہ کر دیں پوری کرانے آ کر تکی پھیر کہ کو وہ جھگڑا اس کی ساسی نے اس کے خاندان پر پیر کر دیا اسے قبضے میں کیا ہوا تو کوئی اپنے خاندان کو بندہ بے دام بنانے کی فکر میں ہلکان رہتی تھی۔ کوئی عورت کسی کے ساتھ خواب تھی تو کوئی کسی غیر مرد کو حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

میں ایسی عورتوں کو میں کیلے کیلے اپنے تجربے میں بلایا کرتا تھا۔ ایک روز ایک انتہائی حسین لڑکی قسم کی لڑکی میرے پاس آئی۔ اس کی عورت کی سولہ سترہ برس تھیں اور اس کا خاندان جو اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ بلا بہانہ اس کے پاس سے زیادہ عورتوں کو لے کر اس کے مال باپ نے اسے زمیندار کے ہاتھ فروخت کر کے اس کا بیوا کیا تھا۔ اس نے رد کر دیا کہ مجھے بتایا کہ اس کے جذبات کا یہ مشہور ہوا ہے۔ اس شوکر کی عورتیں لو پڑھوں کی نوجوان بیویاں میری خاص مرید بنیں یا نہ جاتی تھیں۔ میں بے اولاد عورتوں کو اولاد بھی دیا کرتا تھا۔ میرے گودہ کے دوسرے لوگ بھی اس گھنٹے کھیل میں مہم اور اولاد سا خدے رہتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی اندھی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ ساری رات کے لیے اپنی بیٹیوں کو میرے ہاں چھوڑ جاتے کہ یہ صاحب رات کو ان کے لیے پلہ کھا کر ان پر پونجی ملے دیتے ہیں۔۔۔۔

”دوسرا ایک میرا یہ کھیل جاری رہا ایک روز ایک خیال میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ میں نے کہا کہ سو دن پورا کر اور ایک دن سادھ کا۔ تو کبھی نہ کبھی تو یہ بھی کھیلے گا۔ یہ چاگلگی لوگ ہمارا مردہ بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔ قتل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی۔ راتوں رات میں نے وہ رقم سنبھال لی۔ اپنے اس بہروپ سے نجات حاصل کی یا وہاں سے جان بچا کر نکل آیا۔



میرے لایے دیا۔ پولیس نے بتا کر کہنے کے تمام حریف آزمائے۔ اٹل کا احسان ہے کہ میں ثابت قدم رہا اور اٹل اٹل سر سے دم تک کوئی جرم نہیں کر دیا۔  
 "ثابت قدم رہا اور اٹل اٹل سر سے دم تک کوئی جرم نہیں کر دیا۔"  
 جمیل پوری والا کی کہانی ختم ہو گئی۔ میری اور اس کی ملاقات تین چار سال قبل ہوئی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو اپنا ٹھکانہ نہیں بتایا۔ مجھے بھی نہیں حالانکہ میں شاید دنیا میں وہ واحد آدمی ہوں جسے اس نے اپنی کہانی سنائی ہے۔ میرے وہیل دست کے پاس وہ اپنے مقدمات کے خاتمے تک آ کر رہا۔ پھر یکایک غائب ہو گیا۔  
 وہ اب کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اس کا علم تو مجھے نہیں۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ دوبارہ کبھی اپنی پرائیویٹ دنیا میں واپس نہیں جائے گا۔ کیونکہ نیکی کا جذبہ اس میں زندہ تھا۔ جو بصورت غالب آ کر رہا۔



کابند و بست کر لیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ دادا گھر سے آنے والی ٹرین میں جا کر آدمی مار لے کر لے آئے۔ تم اس سے مال وصول کرنے کے بعد اسے رقم ادا کر دو گے۔ دس ہزار روپیہ ہم نے ایڈوائس اس سے حاصل کر لیا۔ ڈرامہ تیار تھا۔ بالو صدیقی چالیس ہزار روپیہ بیگ میں لیے سفر پر مقام پر جانے کا منتظر تھا۔ بالآخر ٹرین آئی اور دارا مستحق آدمی جانے کا پورا بیگ لیے اس طرف آ گیا۔ ہم نے بالو صدیقی کو قیدی دلا رکھا تھا کہ کسٹم دالے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔  
 "جاندارائی، بیگ کے اوپر کے پچھلے جیکٹ میں چمکا ہوا سورا رکھا تھا۔ جسے ہم نے چاندنی کی شکل سے رکھی تھی، ابھی وہ لوگ سہانے میں صوف ہی تھے کہ "ٹیلی فون" کا بجلی چھاپہ پڑ گیا۔ باقاعدہ دردیوں میں بل بوتوں "اسپیشل ڈیوٹی" کے لوگوں نے چھاپہ مارا تھا۔ انہوں نے چاندنی اور چالیس ہزار روپیہ قبضہ میں لے لیا اور ہمارے "سمنٹ ساجت" کرنے پر بالو صدیقی کو رہا کر دیا۔

"یہ سب کچھ پہلے سے تیار کر ڈالنے کا حصہ تھا۔ سنگھو، چاندنی، انٹی سگنگلک، سپیشل سٹاف سب کچھ صحیح تھا۔ بالو صدیقی عورت دار آدمی تھا۔ اس نے راتوں رات کھڑے رہنے کے لالچے میں دم اکٹھا کی تھی گھر میں جوان بیٹی ہاتھ پیچے کرنے کے لیے تیار تھی۔ لوگے والوں کا اتفاقاً رخصتی کے لیے بڑھتا جا رہا تھا۔ فوجت میں تان تک پہنچ گئی کہ انہوں نے دودھ میں بیہوشی کا پیچہ کر دیا۔ کیونکہ بلو کے کوہاں جانا تھا۔ ان سارے عوامل نے مل کر اثر دکھایا۔ ایک روز یہ بخوشی خیر ٹکڑے بالو صدیقی نے خود کشی کر لی ہے۔ میں لا کھ بڑا سہی۔ لیکن ابھی میرا ضمیر شاید زندہ تھا کہ میں نے اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور خود کو اس کی موت کا ذمہ دار گردانا۔ میرا آنا جانا بالو صدیقی کے گھر تھا۔ اس کی موت نے ایک مجرب انسان کو شک کی کا لاسٹر دکھا دیا۔ میں نے اس کے گھر والوں کو قیدی دلایا کہ میں انہیں کبھی بالو صدیقی مرحوم کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا اور ان کی خدمت میں جت گئی۔ جیسے بالو صدیقی کا روح کو خوش کرنے کے لیے نہ موت اس کا قرض ادا کیا بلکہ اس کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر ڈولی میں بٹھایا اور رخصت کیا۔ ممکن ہے اس عمل سے میرے گناہوں کا کچھ ازالہ ہو جائے۔ اس کے بعد میرے پرانے ساتھیوں نے کئی



سے تعلیم مزید تعلیم دلانے کا متحن نہیں ہو سکتا۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ تمہاری دوسرا جوان بہنوں کو چھوڑ کر اب تجھی تمام سے چاؤ چوٹے پورے کرتا رہوں۔ لیکن کیا کروں؟ میں مجبور ہوں۔ خدا نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے اور اس کی تربیت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال دی ہے۔ اگر کوئی ہی کرتا ہوں تو دنیا لے گی۔ حاکم دین نے بیٹوں کی خاطر واحد والد فریہ کو چھوڑ دیا۔ کاش خدا نے مجھے تمہاری جگہ بھی بیٹی ہی حصہ دی ہوتی کہ از کم مجھے اس طرح سکس کر کر تو زندگی کے دن پورے نہ کرنے پڑتے۔“

میں نے اپنے والد کی تقریر اس کان سے سنی اور اس کان سے نکال دی۔ اب میں ایسی تقریروں کا عادی ہو چکا تھا۔ باپ مجھے ڈانٹتا تو میں میرا سا تھوڑی تھوڑی لاشعور میں بھی یہ بات سمجھ چکی تھی کہ میں والدین کی واحد والد فریہ ہوں۔ شاید ان کی اسی کمزوری کو میرے اندر بیٹا شیطاں آپسلا کر رہا تھا۔

پانچ چھ میل کو دور تھا اور جس علاقے کے ہم رہتے وہاں سے۔ وہاں یہ پانچ چھ میل پانچ چھ ہزار میل کے برابر ہوتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں بھی آسے تین چار سال ہوئے تھے۔ کیونکہ ہمارا گاؤں سرک کے نزدیک تھا۔ یہاں کے بیشتر دیہاتوں میں تو بجلی بھی نہیں تھی۔ والد صاحب نے اپنا واحد اثاثہ جو بھیک کی شکل میں محفوظ رکھا تھا مجھے منتقل کر دیا۔ میں سائیکل پر سوئی سکول آنے جانے لگا۔ اس گاؤں کا میں واحد لڑکا تھا جو گاؤں میں سکول جاتا تھا۔ یہاں تو لوگ بچوں کو پرائمری تعلیم دلانا بھی مصیبت سمجھتے تھے۔ میرے والد صاحب کی لاکھ کوشش پر بھی پرائمری سکول میں کبھی ساٹھ ستر سے زیادہ بچوں کی تعداد نہیں ہو سکی تھی۔

گائی سکول میں آٹھویں جماعت تک تو والد کی خصوصی توجہ اور متحن سے میں پڑھائی کی طرف راغب رہا۔ آٹھویں کے بعد میں بھی دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی تعلیم نہ کیا۔ گھر سے سکول جاتا اور راستے میں گلی ڈیڑھ گلی کیسے لگتا۔ دسویں جماعت تک

## یادیں

مجھے حال ہی میں عداوت نے میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے دس سال قید باشتفت کی سزا دی ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حج کے دل میں خدا نے میرے لیے رحم کے جذبات پیدا کر دیے۔ در نہ مجھے ہی اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح ساری عمر جیل میں سڑنے کے لیے چھینک دیا جاتا۔ آج میں سوچ رہا ہوں۔ جن کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا۔ انہیں میرا نام لگایا نہ رہا ہے یا نہیں؟ میرے خیال سے انہوں نے میرا نام بھی جھلایا ہو گا۔ یوں بھی اب میری حیثیت چلے ہوئے کار توں سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

خوشنہ اچھا کہ میرا مقدمہ ملک کی مختلف عدالتوں میں چلتا رہا۔ لیکن میں نے کوئی شائبہ نہیں دیکھا۔ میری مدد کوئی نہیں آیا۔ سوائے میرے بگناہ بوڑھے والدین کے یا پھر میری بیوہ بن جردن رات بچوں کو یوشن پڑھا کر میرے مقدمات کا خوب چلائی رہی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ عالیہ مجھے اتنی جلدی بھول جائے گی۔ جس کے لیے میں نے زندگی کی سیدھی سادی شاہراہ کو چھوڑ کر مرغا مارا دھنکا دینے والے راستوں کا انتخاب کیا۔

مجھے ابھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان سیکل ڈوریشن میں پاس کیا تو میرے والد نے ہمارے گاؤں کے پرائمری سکول میں میٹرک سطر تھے۔ مجھے لگا تھا۔

”بیٹا! تمہارے نمبر اتنے کم اور کڑوت اتنے بچے ہیں کہ میں اپنی صلاحی لمانی



لینے کا وعدہ کر لیا اور میں نے جیسے تیسے میٹر کر کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس درمیان میری بڑی بہن بیہ کرا اپنے سرال لاہور جا چکی تھی۔ لاہور ہمارے گاؤں کے نزدیک نہیں تھا۔ راستے میں کئی اور کالج آجاتے تھے۔ والد صاحب مجھے یہاں داخلہ دلائے۔

پہلے تیار نہیں تھے لیکن ماں کا منہ کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہمارا تھوڑا بہت زمین تھی۔ جس سے گھر کا خرچ چل جاتا تھا۔ دیہاتوں میں زندگی کے ایسے مسائل بھی نہیں ہوتے۔ والد صاحب کی تنخواہ کافی عرصے سے بینک میں ہی جمع ہو رہی تھی۔ وہ شاہد سٹیوں کی ٹرک کرتے تھے اور ان کے لیے ہی پیسے جمع کروا رہے تھے۔

جب والد صاحب مجھے لاہور کے ایک کالج میں جیسے تیسے داخل کروا کر گئے انہوں نے مجھے کہا :

”عبادیدیشا، میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں لیکن تمہاری ماں کی ضد کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ خدا کرے میرے غمناک غلط بات ہوں اور تمہیں عقل آجائے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تمہارے مامی کے ایک ایک پل کی خبر مجھے ہے لیکن میں تمہاری ماں کو کچھ بتا کر اسے دکھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے بدتمی سے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ خدا کرے تم اس کی امیدوں پر لوہے سے اترو۔ بیٹا ؛ لاہور بڑا شہر ہے۔ میں سیکٹر ویں میں دور سے یہاں آکر تمہاری خیرگی رہی نہیں کر سکتا۔ اس بات کا احساس کرنا کہ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر قدم اٹھایا ہے۔

میرے لیے والد کی نصیحتیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بس یہی دل چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہ یہاں سے چلے جائیں۔ دیہاتی ہونے کے ناطے میرے لیے لاہور جیسا بڑا شہر بظاہر تو اجنبی اور پوچھا دینے والا سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں رہ جانے اور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی ایسی خوشی اور دھن دل میں آگئی کہ میں خود کو یہاں اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔

مجھے نوجوانوں والی تمام بری عاداتیں پر حکمی تھیں۔ میرے والد دو تین ماہ بعد جب کبھی سکول جاتے اور میرے متعلق انہیں صحیح روپ ملتی تو مجھے پہلے ایک اُدھ پھیر لگا دیتے پھر ڈانٹتے اور آخر میں نصیحتوں کے انبار کے ساتھ کلام ختم ہو جاتا۔

میری نوجوان بہنیں تھیں۔ جنہوں نے مقامی روایات کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی یا پھر مل سے سینے پر نہ لگا کر سیکھ لیا تھا۔ لیکن میری بڑی بہن کو والد صاحب نے اُس کا رجمان دیکھتے ہوئے خصوصی تجربے میٹر کر کا امتحان پاس کروانے کے بعد سی ٹی کا کورس بھی پاس کروا دیا تھا۔ جب میں نے میٹر کر کا امتحان پاس کیا تو وہ مزید ایک کے ایک گاؤں میں قائم ٹرک کیوں کے پرائمری سکول میں اسے تائی لگا چکی تھی۔ چھوٹی بہن گھر پہنچ کر قرآن پڑھاتی تھی۔ بس ایک میں تھا جو والدین کی توہین پر کبھی پورا نہ آتا۔

میٹر کر پاس کرنے تک مقامی نوعیت کے بیشتر جرائم میں مورخ نام دے چکا تھا۔ اب دل میں ایک ہی فہمیش تھی کہ جلد از جلد شہر طرح بھی ہو میں لاہور کے کسی کالج میں داخل ہو جاؤں اور دہلاں خوب موبجہ سیکھ کر دوں۔

میں نے لاہور زندگی میں دو مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک دفعہ جب ہم سب گھر والے دانا صاحب کے مولد پر ملازم کرنے آئے تھے۔ دوسری مرتبہ جب میری ماں کے ایک دوست کے رشتے داروں کے ہاں اپنی بہن کا رشتہ دیکھنے آئے بعد میں اس گھر میں میری ماں کی شادی بھی ہو گئی تھی۔

میں نے میٹر کر کا امتحان سیکٹر ڈیڑیٹن میں بھی جس طرح پاس کیا وہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔ اگر والد صاحب کو علم ہو جاتا تو وہ کبھی ایک پھر ٹی کوڑی بھی پھر خرچ نہ کرتے۔ میں نے امتحانی شیور کے سپرنٹنڈنٹ سے دو روز پہلے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملاقات کر کے اسے کہہ دیا تھا کہ ہم اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ وہ ہمارے چھٹے میں ٹانگ مارا جائے۔

سپرینٹنڈنٹ کھانے پینے والا آدمی تھا۔ اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر



میں سے ایک نوکر سے لڑکے کے ساتھ اپنی با۔ بائی جو لٹا تھا میرے اندر آئے پر بھی اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کے باقی ساتھیوں نے چوروں سے جو بے سگریٹ سلگائے ہوئے تھے اور بے بیس کش لے رہے تھے۔

”کیوں ابھی چیدے کے پیا پروگرام چہ۔“ ملک عارف نے اپنے کو روہ کام سے

خارج ہو کر مجھے مخاطب کیا۔

ایک مرتبہ تو میں سو کر رہ گیا۔ لیکن جوں جوں کہ میں نے سو دیا۔ ”میںیں ملک ہی، بھیکھی سی۔“

”میںی تمہاری مرضی بھئی۔“ ملک نے مقدمہ لگایا۔

اس وقت میں وہ امر اور اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ شام تھے۔ میں نے

ملک عارف کے اشارے پر میز پر کیا نے بیٹے کی اشیاء رکھ دیں۔ باقی ۳۰۰ روپے اسے واپس کر کے لئے چاہے۔ تو اس نے زبردستی میری قبضی کی جیب میں ڈال دیا۔

اور سنس کی کر بولا۔

”یاد چیدے: تم پانچ سو روپے کسی شے کی گھر کرنا۔“

”یہ کس جی: آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کھر کس بات کی؟ میں نے نہ میرے بھائی

کی طرح دانست نہ لکھ لے اور اسی کے باقی چوروں کے ساتھ مل کر کہیں نے بیٹے کی اشیاء

پر ٹوٹ پٹا۔

کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے نزدیکی کٹھن سے چائے منگوائی۔ میں اس کے

ملازموں کی طرح عارف کے جھک کر کی تمہارا کر پٹھا۔ جیسے میں چائے لے کر واپس

آیا تو ایک اور ڈاکو اسی طرح کے کے ساتھ ملک عارف کے ساتھ شام میں مصروف تھا۔

دونوں فارغ ہو کر کے بعد ایک دوسرے سے بے مورد ملائی کرتے رہتے ہیں

نے اندازہ لگا کر یہ لوگ اس گنہگارے فعلی کے، دی ہیں۔ چائے چینی کے بعد انہوں

نے وہاں جو اکھیاں شروع کر دیا اور شام ڈھلے۔ تب چور اکھیاں میں مصروف رہے۔

اسی دوران میں نے ایک خاص بات نوٹ کی کہ یہاں جتن بھی ہوا تو اس میں ایک

مجھے جس کا لٹے ہیں ڈاکو ملا۔ وہ ہونکا مر آرائی کے لیے خاص ہی شہرت رکھتا تھا۔

کا لٹے کے جو کٹیل میں جو کر مجھے لالٹ ہوا۔ اس میں پہلے ہی سے عارف بہتیم تھا عارف

بگڑا ہوا امیر زادہ تھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا۔

لیکن آٹھ ویں ماہ تک ہم ایک دوسرے سے فری نہ ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ تو تین ماہ

کی چھٹیاں تھیں۔ اس کے بعد مستقل ہنگاموں کی وجہ سے کچھ کچھ رہے۔ پھر آپس میں کھائے

کھانے پر دس ہزار روپے تو رقم ایک دوسرے سے کچھ کچھ رہے۔ پھر آپس میں کھائے

اس نے مجھے کرید کرید کر میرے ماتھی کے متعلق کافی چھچھان لیا تھا اور شاید اندازہ

بھی اسی کو بخوبی ہو گیا تھا کہ میں اس کے کام کا آدمی ہوں۔

ایک روز اس نے کھل کر کہہ دی دیا۔ ”جیرے یا تم بندے تو کام کے نظر کرتے ہو

لیکن ہر روز بار بار بولے۔“

”ملک صاحب: اندر مجھے مذاق میں بھی کبھی یہ بات نہ کہنا۔ جب جی چاہے

میری روٹائی کو آواز ملے۔“ میں نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”اچھا: اچھا: وقت

آیا تو کچھ لیں گے۔“

یہ وقت اگلے ہی روز آگیا۔

چھٹی کا دن تھا۔ جو کٹیل میں خامی ہے وہ نقلی تھی۔ اس روز ایک کار میں کچھ لوگ

بیٹھ کر گئے۔ انہوں نے خود کو ملک عارف کا رشتے دار بتایا اور اسی کے کمرے میں

آگئے۔ لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اس کے رشتے دار نہیں بلکہ اسی کی قاتل

کے دوست ہیں۔ عارف نے مجھے سو روپیہ کا نوٹ بٹھاتے ہوئے نزدیک زین میں سے

کچھ لالٹے کو لے لیا۔ میں نے فوراً سو کا نوٹ کپڑا دیا۔ وہ اسی طرح پہلے بھی مختلف باتوں سے

اپنی مالیت کا عیب چھ پڑا ڈال چکا تھا۔

جب میں کھانے پیچھے کی اشیاء کے لفافے لے کر وہاں پہنچا تو کمرے کو اندر سے

کدڑی لگی ہوئی تھی۔ میری کارواز پہنچنے پر عارف نے وہ دواڑہ کھلی دیا۔ دواڑہ کھلتے ہی

میری نگاہوں نے جو منظر دیکھا وہ بڑا مکروہ اور ناقابل بیان ہے۔ ملک عارف آئینوں



ناراض ملک عارف لاہوتا تھا۔ جتنی رقم بھی کوئی بیٹیا اس کا پور حصہ ملک عارف کی جیب میں چلاجاتا۔ اسے یہ لوگ اپنی زبان میں "تعل" کہتے تھے۔

شام ڈھلنے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگے تو ملک عارف نے اس بلکے کی طرف اشارہ کر کے پھر میری نشا در یافت کی۔ لیکن ابھی شاید میری جھجک سا تھا۔ یا پھر کوئی لاشعوری خوف، دامن گیر تھا کہ میں نے پھر انکار کر دیا۔ لیکن انکار کرتے ہوئے بڑی گول مول سی زبان استعمال کی۔ ملک عارف نے یہی سوچا ہو گا کہ میں شاید زیادہ لوگوں کی موجودگی میں جھجک شعری کرتا ہوں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر مجھے تنہا۔

"یہ کیا ملک جی؟" میں نے پھر انگی سے پوچھا۔

"تمہارا حصہ"، ملک عارف نے بڑی تجحیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جید سے؟" ہم یاروں کے پاس میں ہمارا ساتھ دو گئے۔ اس میں میری ضرورت طے پا گئی۔

میرے تمام دوستوں کے ساتھ میری جیب جی "خدا جانے" ایسا غلیظ اور مٹی جی کا لٹرازیہ میرے زبان میں کیے اس کے سامنے بولتا سا میری حالت تو اپنے گاؤں کے ان میر لڑکیوں بھی بدتر تھی۔ جو چور لڑکیوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ واقعی ملک عارف نے مجھے اپنا "گاما" بنا لیا تھا۔

مجھے "انجور میٹھی" پڑھتے۔ وہ سال جو نے کوئے تھے۔ اس دوران وہ دوسرے تہ میرے ہمنوئی مجھے لانا میں ملنے آئے اور زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ ہمارا پیری بن مجھے ایک ہی بات سمجھا کر تکی کہ میں اپنے والدین کا اکوٹا بیٹا اور ان کے مستقبل کی دوا حاصل میری ہوں اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو ان کے لیے باعث دکھ ہو۔ یہی حسب عادت ہیں "ہوں ہاں" کر کے واپس لوٹ آتا، والد صاحب کا خط باقاعدگی سے آتا اور میری بھی انہیں جواب لکھ کر سلطنتی کر دیتا۔

اس واقعے کے اگلے ہی روز ملک عارف مجھے لاہور کے اس بازار میں لے گئے۔



میں کوٹھے پر گئے۔ وہ لوگ اسے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اس کی آمد پر انہوں نے  
فیوضی کا اظہار کیا۔ جیسے اُن کے آہٹے ہوئے چمن میں بہار آگئی ہو۔ وہ لوگ  
اس عادت کے ساتھ ساتھ میرے بھی صدقے داری جارہے تھے۔ میں تھا تو گیا رھیں  
ماعت کا ملا۔ علم لیکن میرا قدر کا ٹھ او۔ جمافی ساخت دیکھ کر اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے  
تھے۔ یہاں عادت نے میری ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے کروائی اس کی عمر تو مجھ سے  
بڑی تھی۔ لیکن پہلی ہی نظر میں اسے میں دل سے بیٹھا۔ اس لڑکی کا نام عالیہ تھا۔  
ہم رات دیر گئے ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل واپس آ گئے۔

عالیہ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور میں اس کی خاطر اس  
کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ پانچ چھ روز اس کی جدائی میں جس طرح میں نے کاٹے وہ کچھ  
میں ہی جان سکتا ہوں۔ اس دوران ہمارے کمرے میں قریباً روزانہ جوا اور دوسرے  
غلط کام کیے جاتے۔ عادت مجھے باقاعدگی سے میرا ہمدرد بنا رہا۔ ایک مرتبہ اس کے  
سنے پر اس کی موٹر سائیکل پر میں اس کے لیے ایک خفیہ ڈسے سے شراب کی بوتل بھی  
لے کر آیا۔ میں سگریٹ تو سکول کے زمانے سے ہی پینے لگا تھا۔ لیکن ابھی کوئی اور  
نشر نہیں کیا تھا۔ ایک روز عادت نے مجھے بھی زبردستی ایک پیگ لگا دیا۔ میرے لیے  
تو یہی کافی تھا۔ خدا جانے میں شراب کی کیا اویا فول کیا رہا۔

صبح دیر گئے تک میں سو رہا۔ آنکھ کھلی تو سورج سر پر آگیا تھا۔ عادت اور اس  
کا ایک دوست چرس سے بھرے سگریٹ پی رہے تھے۔ میرا سر ابھی تک گھوم رہا تھا  
ہاتھ کرنا نے چاگیا۔ نہا کر واپس آیا تو قدرے ناراض ہوا۔

عادت نے دہل کر جو نوجوان کا تعارف ظاہر کے نام سے کرایا میں نے اس کا نام  
نرسن رکھا تھا۔ یہ ہمارے کالج کی یونین کا صدر تھا۔ عادت نے میرے لیے ناشتہ  
دہی منگوا لیا اور طاہر کے سامنے میری تعویضوں کے لیے بھی بانہ دے دیے۔ اس نے  
بتایا کہ کالج کے ایکشن زونیک آگئے ہیں اور مخالفت تنظیم کی طرف سے غمزدہ گردی کا  
خطہ ہے۔ عادت نے بتایا کہ ہوٹل میں وہ جوا خانہ اور دیگر برسرِ شانیاں یونین کے



ان کے سادھی وصول کر لی۔

”کسی روز انہیں رات کو لایئے گاں ملک جی؟“ عالیہ نے سیری طرح اشارہ کر کے عارف سے کہا۔

”اتنی بے صبری ابھی نہیں عالیہ سیکھ لے آئیں گے کسی روز“ ملک نے کہا اور دونوں قطعہ لگا کر سنس دیے۔

میں جو نقول کی طرح ان کا منہ دیکھتا ہوں یہ جاننے بجیر کر وقت سیر میری ہنسی اڑا رہا ہے۔

والہی پر مجھے عارف ملک ذہنی طور پر تیار کرتا آیا کر کہیں پیسے حاصل کرنے کے لیے کوئی بڑا کام کرنا چاہیے۔ لیکن ابھی تک اس نے مجھے کام کی نوعیت سے اگلا نہیں کیا تھا۔

تین چار روز بعد طاہر کی بیعتوں استعمال کرنے کا موقع بھی آ ہی گیا۔ آج کالج کے میدان میں مخالفت طلباء تنظیم کا جلسہ تھا۔ ہم نے جلسے کو نا کام بنانا تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں طاہر والی طلباء تنظیم کے اور لوگ بھی آئے۔ ”کار خیر“ میں حصہ ڈالنے کو موجود تھے۔ وہ تھے تو طلباء برادری طلباء تنظیم کے ممبرین ان ہاں اس کالج سے کیا کسی بھی کالج سے مدد و درکار علاقہ نہیں تھا اور تمام شکل سے بچے ہوئے فیلڈ سے دکھائی دے رہے تھے۔ بیسٹ ہاں دوسری تنظیم کی طرف سے سمدار قیامیدار نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ میدان کے ایک کونے سے کسی نے بیسٹ پر موجود ساتھیوں نے فائرنگ لگ بھی شاید تیار ہو کر آئے تھے۔ ان کے بیسٹ پر موجود ساتھیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اب ہاں کام شروع ہو گیا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لکھا پتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب سے پیرا ہوا ریلو لور باہر نکالا اور بیسٹ کی ہمت و وقار فائر کر دیے۔ یہی بیسٹ کے قریب سے قریب کھڑا تھا اور اس طرف کوئی متوجہ بھی نہیں تھا۔ خمد جانے بیسٹ پر فائر کی کسی کی گولی لگی۔ لیکن میں یہ سمجھا کہ اسے پیر کی چلائی ہوئی گولی ہی لگی ہے۔ بیسٹ پر فائر بلند ہوئی اور مجھ میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا بعد ہر منظر اٹھا

صدر کی مدر سے ہی چلا رہا ہے اور آج وقت آگیا ہے کہ وہ بھی طاہر کے کام آئے گی کیا اسی کی وجہ سے آج تک کسی نے ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔

”بہیں کرنا کیا ہے ملک جی؟“ میں نے مرنے کی طرح گڑ گڑا کر پوچھا۔

”یار جیسے ہمیں ذرا دو چار فائر کرنے ہیں۔ یہ شہر کا پولیس ان کے لیے انتہائی کافی ہوگا۔“ عارف نے میری پیٹھ پیچھے ہونے کہا۔

”بے فکر ہو جاؤ جناب کوئی آپ کی طرف ہمارے ہوتے ہوئے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ میں نے پیشہ وں پر معاشوں کی طرح آج سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہاں ہائی سکول میں نہیں نے ڈانک سوٹا اور چاقو وغیرہ تو چھاپا تھا۔ لیکن بیسٹوں کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں طاہر نے مجھے ایک ریلو لور اور چند گولیاں دے دیں اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں کالج کی حدود میں ہوجی چاہتا کہ سکتا ہوں یہاں کسی کی جوازت نہیں کہ مجھ سے آنکھ ٹاکر بات بھی کرے۔

پستول اور گولیاں ہم نے سنبھال لی ہیں۔ طاہر چلایا گیا۔ اس روز دوسری مرتبہ ملک عارف مجھے پھر بازو جسٹس لے گیا۔ میں نے اسے تباہ کیا تھا کہ میں عالیہ کو کولہ مے بیٹھا ہوں۔

”جیسے یار یہ کبوتر لوگ نمود و نمائش کے بھوکے ہوتے ہیں اگر اس کا دل جیتنا چاہتا ہو تو مال خرچ کرو۔ اسے سونے کی زنجیروں سے اس طرح جکڑ دو کہ پھر وہ تمہارے جال سے کبھی نکل نہ سکے۔“ ملک عارف نے مجھے سمجھایا۔

”لیکن اتنا مال لے گا کہاں سے؟“ میں نے بے اختیار پوچھ لیا۔

”یاد رہے اس معاملے کی فکر نہ کیا کرو۔ یہ مسئلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم یاروں کے یار ہیں آخر کسی روز تو تمہارے کام آئیں گے۔“

بیرسے پاکس عارف کے دیے ہوئے جو پانچ چار سو روپے جمع تھے۔ ان کی میں نے اس کے کھٹے پر ایک پیش قدمی اور ہم عالیہ کے ڈیرے کی طرف پہنچ دیے۔ میں نے عارف کے کہنے کے مطابق اس سے ساڑھی پیش کی تو عالیہ کھلی اٹھی اور شکر یہ



”بیک صاحب یہ ہے اپنا پار چا دیڑی حال جس نے آج کل کا نامساخام دیا ہے۔“

اور جیسے یہ بیک صاحب بیہ تم جانتے ہی ہو گے۔ ان کے تعارف کی تو کوئی ضرورت میرے خیال سے نہیں ہے۔“ ملک عارف نے مجھے مخاطب کیا۔

”شاباش بھوان۔ واقعی ہمیں تم جیسے بہادر دلوں کی ضرورت ہے۔ ملک عارف یا تم نے آج تک یہ بہرہ لہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا، اس نے میرے بازوؤں کی فحشیں کو ٹوٹاتے ہوئے ملک عارف کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

”بیک صاحب ہم وقت آنے پر ہی مال باہر نکالتے ہیں،“ ملک عارف نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”واہ بھئی واہ۔ کہاں کر دو اقامت۔ پرہا نہیں وہ سالہ بھی جانے تو پرہا نہیں کوئی تنہا ری طرف مبتلا آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ بیک صاحب نے میری پیٹھ پر ٹھکی دے کر کہا۔

وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ اس ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ایک دفعہ تو میں بھونچو ہوا رہ گیا۔ میں نے ایسے کرے قدموں میں تو دیکھے تھے۔ عملی زندگی میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ بیک صاحب نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور چند منٹ بعد ہی ہمارے سامنے پرتکلف چائے دیگروں کا تسمیست موجود تھی۔ اس دوران ملک عارف میری جھوٹی بچی تعریف کرتا رہا۔ اس نے پیٹھے پیٹھے جانے کتنے کارنامے میری ذات سے منسوب کر دیے اور میں گدھوں کی طرح سر ہلاتا رہا۔ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ میں اپنی مخصوصیت کے ہاتھوں کس طرح آہستہ آہستہ اپنی جھکھور رہا ہوں۔ میں قدرم بقدر کمزوری دلدار میں دھنستا چلا جا رہا تھا اور اپنے انعام سے بے خبر پڑی خوشی سے قربانی کا کپڑا بنا ہوا تھا۔

اس انعام میں بیک صاحب کے سامنے رکے فون کی گھنٹی بجی اور انہیں مطلع کیا گیا کہ جس لڑکے کو کوئی گئی ہے اس کی حالت نازک ہے۔ مختلطہ فریق نے ہمارے بیڑین پر پہنچ کر دیا تھا۔ لیکن اس میں کوئی نام شامل نہیں تھا۔ اس بات کی گنجائش بہر حال محدود

وہ بھاگنے لگا۔ جس نے مزید خبر نہ ماننے کے لیے دھڑ دھڑ گولیاں چلائی شروع کر دیں اور چند منٹوں میں تمام گولیاں ختم کر دیں۔

اچانک ہی کسی نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ میں نے دیکھا یہ ملک عارف تھا۔

”چلو، چلو، بھاگ چلیں، اسے تمہاری گولی لگی ہے۔“ اس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ میں گدھوں کا طرح اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

کالچ کی پھکی دیا دیا چلا کر ہم باہر نکلے جہاں ملک عارف کا ایک اور ساتھی اس کی موٹر سائیکل سمیت موجود تھا۔ اس نے ہمارے شکل پر نظر پڑتے ہی موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ عارف نے گدی ہتھکالی میں اس کے پیچھے بیٹھا اور موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ملک عارف موٹر سائیکل چلاتے ہوئے مجھے مسلسل داد دیتا رہا۔ میں نے بڑی جوا نوزی دکھائی ہے۔ خدا جانے اس رولے کو کوئی کس نے مارا تھی۔ کم از کم میرا بازو ہرگز نہیں تھا۔ لیکن ملک عارف نے میری جی انداز سے تعریف شروع کی تھی۔ اس سے مجھے یوں لگا۔ جیسے واقعی یہ کارنامہ میں نے انجام دیا ہو۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک مارڈن آیا دھڑکی شنکار کو کھڑی پڑھوا۔ جس کے باہر ایک مستحق کھار ڈکھڑا تھا۔ عارف کی شکل پر نظر پڑے ہی اس نے وہ اندازہ کھول دیا۔ وہ سائیکل وہ سیٹی کو کھڑکی کے لائن تک لے آیا۔ شاید موٹر سائیکل کی آواز سن کر ہی ایک ڈھکی عورت کلا گئے سر والا موٹا سا آدمی باہر آیا۔ اس کی شکل پر نظر پڑنے ہی مجھے احساس ہوا کہ اس شخص کو میں نے پہلے بھی ضرور کہیں دیکھا ہو گا۔

”ویل ڈن ملک، ویل ڈن،“ اس نے موٹر سائیکل رکھتے ہی تالی بجاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کو کھڑکی کے سر آدے میں پہنچ چکے تھے۔ اس نے گرم چوتھی سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔



بھی نہ آنے دیا تو کئی ایک نوجوان لوگوں نے مار مارا کر کہا کہ اس کے آگے کا دھوا  
 دیا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی ماں کے مستقبل کی ایسی امید بھی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ مگر یہ تو یہ  
 ایک لمحے کے لیے نہیں نے سوچا اور کر کے رہ گیا۔

”او بھئی نہیں تمہارا کروڑھ دیں تم آرام کرو۔ مجھے ایک میٹلک میں جا نہ پے“  
 بیگ نے مجھے ایک کمرے کی طرف سے جاتے ہوئے کہا۔

کمرہ کسی رئیس کی خواہجہ دکھائی دیتا تھا۔ جس کے ایک کمرے میں دی سی اور  
 ٹی وی نصب تھا اور تمام وہ بید کے کنارے ایک چھوٹا فرنیچر دھرا تھا۔

”تم ذرا آرام کرو۔ رات کا کھانا اکٹھے کیئیں گے۔ مجھے ایک سیای میٹلک  
 میں جانا ہے۔“ بیگ نے مجھے بلوائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور وہاں  
 کے چلا گیا۔

آج کب کہاں نے کر کے کہ نہیں کیا اور کچھ کسی دوست کے گھر دی سی آر دیکھیں تھا۔  
 آج سب کچھ میرے سامنے تھا۔ شاید بیگ نے یہ سارا حال مجھے بیان کرنے کے لیے کہا  
 رکھا تھا۔ اس کے کرنے سے پہلے ہی میں نے نہ پرے پھرنے کی طرح وقت آ کر کے نزدیک  
 رکھی فلموں میں سے ایک فلم نکال کر چلا دی۔ کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

”آٹ میرے خدا یا۔“

بیٹے جیسے فلم چل رہی تھی، میرے اعصاب تن رہے تھے۔ یہ فلم فلم کی سی ایک  
 فلم کی جھلک میں نے ایک مرتبہ دیکھی تھی۔ اور اکثر ایک عارف سے گفتگو کیا تھا کہ  
 مجھے ایسی فلم دکھائے۔ ملک عارف نے وعدہ تو کیا لیکن اتفاق سے حالات ایسے نہ  
 بنے۔ آج وہ دیکھنے کی سلسل فلم میرے سامنے چل رہی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے  
 بے خبر فلم میں غرق تھا۔ کسی نے میرے کمرے کی طرف آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ شاید  
 یہ اس کو بھی کی اگلی تھی۔ میں نے اس دوران فرنیچ میں سے دو قدیمیں نکال کر  
 بنائی تھیں۔ لیکن ایک آگ سی مسلسل میرے اندر بردھکنے لگی تھی۔ فلم، بھی چلی جا رہی تھی  
 جب اچانک دروازہ کھلا میں تو گھبرا گئی گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے سامنے

تھی کہ پولیس تفتیش کے لیڈر کو بھی شام کی رکھی تھی۔  
 ”تم دو تہی روز یہاں نہ ہو جیسے بیگ صاحب کے پاس۔ ابھی تمہارا کالج ہوا  
 ٹھیک نہیں۔“ عارف نے مجھے ضحکت کی۔

”ہاں! ہاں! ابھی! ہم اپنے بندے کو ایسے تو جانتے نہیں دیں گے ناں۔“  
 بیگ صاحب نے معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”جیسی آپ کی مرضی مناسب۔“ میں نے ہونٹوں کی طرح گردن ہلا دی۔

دونوں دوسرے کمرے میں خوشوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر بیٹھے اور آپس میں کچھ  
 پرائیویٹ می گفتگو کرتے رہے۔ شاید اناراز لگا رہے ہوں گے کہ یہ کچھ کسی عارف۔  
 کام کھاتا ہے۔ پھر بیگ تو دایں آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ملک عارف نے مجھے اشارہ  
 سے بلایا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر سو سو کے کئی نوٹ میرے ہاتھوں میں  
 چھوڑ دیے۔

”پانچ سو روپے ہیں جیسے ظان! تمہارا انعام۔ بس اب سمجھو تمہاری قسمت ک  
 گئی۔ عالیہ تمہاری مٹھی میں آگئی۔“ اس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر تھوڑا جھنجھو  
 ہوئے کہا۔ اچھا میں چلتا ہوں، بیگ صاحب کا خیال رکھنا پڑے کام کے آری ہیں ایسے  
 آدمی کو تو آخر سے نکلنے نہ دینا۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں  
 مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

مجھے اس کی بات تو کیا خاک پلے پڑتی بس یوں ہی سر ہلا دیا۔ ہاں ملک جی  
 بے فکر ہو۔ تمہیں شکایت کا تو نہیں ملے گا۔“

”اچھا خدا حافظ۔“ کہہ کر ملک عارف چلا گیا۔

میں بیگ صاحب کے پاس جا بسا گیا۔ جیسوں میں پانچ سو روپے کے نوٹ ہلا دیے  
 ہوئے ہیں خود کو آسمان پر تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ اب عالیہ کو مجھ سے کوں الگا کر سکا  
 تھا۔ یہی ہوتی وہ واحد سوچ جو میرے دل میں جاگزیں تھی۔ مجھے اپنے تعلیمی گریڈ  
 اپنے والدین کی اپنے ہمنوی کی بالکل فکر نہ تھی۔ میرے دل میں شیدان نے یہ خیال



بیگ صاحب کوڑے سکرا رہے تھے۔ مجھے دو ڈھائی گھنٹے گزارنے کا احساس ہی نہ ہوا۔  
 ”کیسا مال ہے؟“ انہوں نے گفتگوں کی طرح آدھ دبا کر پوچھا۔

میں نے دانست نکال دیے۔

مجھے جل رہا احساس ہو گیا کہ بیگ اور عارف میں کوئی فرق نہیں۔ یہ شخص یوں تو ملک کی مقتدر سرمایہ شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا لیکن ذہنی طور پر جنتی اور نفسیاتی مریض تھا۔ اس نے میرے کمرے میں ہی ملازم سے شراب منگوائی اور میرے کان میں کرنے کیے یاد ہو کر ایک دو بیگ مجھے بھی ملا دیے۔ پھر تمام دونوں نے کھا لکھایا اور اسی کمرے میں آگئے۔ اسے پیرا داماد مانتی گھومنے لگا تھا۔ اس مرتبہ بیگ نے ایک فنار فلم چلا دی۔ یہ فلم کیا تھی؟ شہوت اور درندگی کا ایک طوفان بدترین تھی۔ جوں جوں نظم چلا رہی تھی۔ میری گروں میں خون کے بیائے انگارے دوڑ رہے تھے۔ اچانک میں نے عجیب سی حرکت محسوس کی بیگ میرے ماتھے لگا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے بڑی گھٹیا فرمائش کر دی۔ وہ مجھ سے ایسی ہی حرکت کا تقاضا کر رہا تھا جو ملک عارف اپنے کمرے میں کیا کرتا تھا۔ میرے نوپچے بکھنے کی قوتیں منطوق ہو چکی تھیں۔ بس نہ جرات میں آپس بات سنا گئی تھی کہ میں ایک مشہور ملازم ہوں جو اس درندہ سے کی پناہ میں ہے اور ملک عارف کا وہ معنی غیر فخر کر بیگ صاحب کو راضی نہ کرنا۔ اس نے مجھے کہا تھا۔

”جھوٹے بیٹے خطا کا لگ جوتے ہیں۔ اگر نا راض ہو جاؤ گے تو زندگی کو جہنم بنانے کی سکت رکھتے ہیں۔ خوش رہیں تو پو بارہ۔“

بیگ نے میری جمالی مافقت کو اپنے گھناؤنے عزائم کی جینٹ پڑھا دیا۔ صبح میں دیر تک سوتا ہوا۔ جب سو کر اٹھا تو بیگ غائب تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا ہوا۔ ایک مہذب ملازم موجود تھا۔ اس نے مجھے ایک پرچی بخادی جس پر ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا اور دو پاؤں فرار کرے کو کہا۔ میں نے فحش کیا دوسری طرف ملک عارف خطہ اس نے میرا حال پال دیا فست کیا۔



”چند سے خالی بیوقوف مست بنو۔ وہ لوگ جیسے تمہاری گولی لگی تھی زندگی موت کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ تمہیں ایک دو لوگوں نے اُسے گولی مار دے دیکھ لیا تھا۔ اگر پلیس سے نہ گئے تو مخالفت تنظیم والے مار ڈالیں گے۔ بہیرا اس مصیبت سے مرثیہ ہی بچا سکتا ہے۔ اگر تم نے کسی بات نرمائی تو میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یا کہیوں مرے جا رہے ہو۔ ایک آدھ دن کی تو بات ہے۔ پھر تم ہو گے اور عالم ہو گے اور..... آہ اس نے فون پر ہی سکار لی۔“

اب مجھے حقیقت حال کا مشاہدہ تھا۔ اہم اس ہونے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میں  
سری طرح پھنس چکا ہوں اور مجھے اس حوالی کی جاننا جانا تو خواہش پوری کر رہی  
ہے۔ وہ منہوش کھوڑی دیر بعد ایک سوٹ سینے وہاں آگیا۔ اُس کے  
بہرے پر رات والے واقعات کا نام و نشان کسی معمولی تاش کی شکل میں بھی دکھائی نہیں  
دے رہا تھا۔ اُس نے مجھے اہم اس ہی نہ ہونے دیا کہ رات وہ گیکٹا ڈانسل انجام  
دے چکا ہے۔ میں نے کمرے سے لمحہ باخبر دو درمیں نما وضو کر اُس کے فراخ کمرہ  
بڑے تبدیلی کیے اور ناشہ کرنے لگا۔ یہ ایک کھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ جانے سے  
میں نے اپنے نوکر کو میرا طرح خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اس کی روایت کے  
مرد و گھنے بعد ملک مارا گیا۔ یہ وقت میں نے اخبارات پڑھ کر گزارا  
تھام اخبارات کل کے واقعات سے بھرے تھے۔ واقعی مضروب کی حالت ابھی  
سہ سطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اگلے ہفتے میرے ایذا اسے کے امتحانات شروع  
ہونے والے تھے۔ میں اس صورت حال سے گڑ بڑا کر رہ گیا۔  
دیکھنا نے ڈاکو کی بات نہیں سمجھ سکا، ملک عارف نے اپنے مخصوص لمحے  
میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تم سمجھو کہ امتحان میں تم فسط ڈوئیرن حاصل کر چکے ہو۔ تم جانتے  
ہیں جدید سے ایک صاحب کے ہاتھ لگتے لمبے ہیں۔ ان سے ملاقات کو تو لوگ ترستے ہیں۔“



خصوصی انتہا کیا تھا۔ میرے ایک کے امتحان کی طرح اس مرتبہ بھی سپرنٹنڈنٹ نے میری طرف سے آگے نہیں بند رکھیں اور میں امتحان سے اپنے پرچے حل کرنا رہا۔ امتحان ختم ہونے تو پولیس نے ہوٹل خانہ کی کمرے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ ہوٹل سر آٹھ بج کر پھر شروع ہوئی تھی۔ جس رنڈ پولیس نے رات کو چھپا مارا۔ میری خوش قسمتی کہ ظاہر والا لیو اور ملک عارف کے پاس تھا جو اس نے اپنی موٹر سائیکل کے ڈال کس میں چھپا رکھا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ہم بچ گئے۔

میں پولیس کی طرف سے اگلے رنڈ ہوٹل خانہ کی رینے کو کہا گیا تھا میں امتحان سے فارغ ہو چکا تھا۔ لیکن میرا دل لگاؤں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ شہر کا ایسا حسینہ لگا گیا تھا کہ میں نے والدین کو یکسر فراموش کر دیا جو بے چارے جانے دلیں کتنی آرزوئیں جگانے میرے منتظر تھے۔

میرے پاس اس دوران جوئے کے جمع ہونے والے پانچ چھ موردے موجود تھے۔ ملک عارف نے مجھے کہا کہ پانچ چھ روز اپنے گھر گزارو۔ پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔ میں نے عالیہ سے ملنے کی ہمدردی، تو اس نے کہا۔

”جیدہ بیوٹھ مست ہو۔ اگر تم وہاں خالی ہاتھ گئے تو کچھل تمہارے ہاتھوں سے پھسل جائے گی۔“

”لیکن پیسے کہاں سے آئیں گے۔“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ ذرا صبر کرو۔“ اس نے معنی خیر مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

بالکل خفاستہ میں گھر چلا آیا۔ جہاں والد کی نصیحتیں میرے استقبال کو موجود تھیں۔ وہ اس بات پر ناراض تھے کہ میں نے کبھی بہن کے گھر جانے کا تکلم نہیں کیا تھا حالانکہ میرا بہنوئی ہسپتال میں داخل رہا۔ اس بے چارے کو اچانک گردن کی تحلیل شروع ہوئی تھی۔ یہاں اگر مجھے علم ہوا کہ میری بڑی بہن نے گھر پر بیوی سنا رکھو یا تھا کیونکہ اس کے خاوند کی بیوی طویل عرصے سے بیمار تھی اور اب وہ نوکری سے بھی اس

اگر اس نے تمہیں ”دوستی“ کے لیے جان لیا ہے تو تمہارا خوش قسمتی ہے۔“ اس نے بڑی سکڑی سے حالات کی ایسی تصویر میرے سامنے پیش کی کہ میرے لیے سوا گئے ”جوں ہوں“ کے اور کوئی چارہ ہی باقی نہ رہا۔

شام تک ملک عارف میرے پاس رہا۔ یہ وقت ہم نے بیوہ فلمیں دیکھ کر اور ٹیلی فون کر کے گزارا۔ دوپہر کو پرنکھنٹ کھانا ہمارے لیے آگیا تھا۔ شام کے لیے دن شیطانی بھی لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی مجھ پر حسان بتا دیا کہ بڑی مشکل سے ان لڑکوں نے مجھے پرچے میں سے نکالا ہے۔ اب میں بظاہر تو محفوظ ہوں۔ لیکن مجھے محتاط رہنا پڑے گا۔ رات ہونے سے پہلے عارف چلا گیا۔ اس غیبت نے پھر وہی شیطانی عمل دہرانے کے لیے مجھے مجبور کیا اگلے رنڈ صبح کو عارف مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لے آیا۔

ہوٹل میں پولیس والوں نے میرا استقبال ایسے کیا جیسے کسی مورہ ملکوت کیا جاتا ہے۔ ظاہر اور دو تین دوسرے لوگ میرے کمرے میں میرے منتظر تھے میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس سارے ڈرامے کے پس پردہ ملک عارف کی شامل شخصیت کا فرما ہے۔ وہ میرے خیال سے میں اتنی ہما بھر دینا چاہتا تھا کہ پھر حسب چاہے سوئی کی نوک سے مجھے دھماکے کی طرح اڑا کر رکھ دے۔

اسی روز رات کو ہم عالیہ کا گانا سننے گئے۔ میں نے جس طرح حرام کی دوست ملی تھی اسی طرح عالیہ پر ملا دی۔ مجرے کے فائقے پر عالیہ نے بڑے ناز و آواز سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس نے بازار سے میرے لیے کھانا منگو کر خاص طور سے

میرے ساتھ کھانا کھایا اور یہ صراحتی کر دی کہ میں روزانہ اس سے ملنے آیا کروں گا۔ مجھ گھر سے کو اس نے احساس دلایا کہ جیسے وہ مجھ پر مڑی ہے، لیکن ابھی نہ بیان سے باقاعدہ اقرار نہیں کرنا چاہتی۔ دوسری رات میں بیوٹھ سوچا۔ ہاتھ کو کسب تک بچے کی آخر ایک روز اسے میری محبت کے سامنے بھٹا ہی پڑے گا۔

ایف نے کے امتحانات شروع ہو گئے۔ ظاہر اور اس کے ساتھیوں نے میرے لیے



اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبا کر کہا۔

”جہد سے خان! ہم یادوں کے پار ہیں۔ تم رہ بندے ہو۔ ہم مردوں کی قدر کرنا چاہتے ہیں!“

ساری رات ہم دونوں اس لوہی کی بوٹیاں کٹوں کی طرح فرختے رہے۔ علی الصبح ملک عارف کا خصوصی مزارع اس کی جیب پر لٹکی کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ہم لاہور گئے۔

لاہور ہم سیدھے طاہر کے گھر آئے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے ایک خط لک کر پروگرام بنایا۔ کیونکہ بیگم آئن وڈا کے دست باہر گیا ہوا تھا اور مجھے عالیہ کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے اس پر صاف کر دیا۔ اس پر دو گرام میں طاہر اور اس کا ایک اور ساتھی بھی ہمارے ساتھ شامل تھے۔ ہم چاندی دو موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر شہر کے ماڈرن علاقے کے ایک پٹرول پمپ پر گئے۔ طاہر ہمیں موقع دیکھنے لایا تھا۔ پھر ہم واپس آ گئے۔ اور یہاں بیٹھ کر پٹرول پمپ کو لوٹنے کا پروگرام بنانے لگے۔ سارا پلان طاہر نے تیار کیا تھا۔ لیکن اس میں قرضائی کا کچرا بھی بنا گیا۔ طے یہ پایا کہ وہ دونوں موٹر سائیکلوں پر بیٹھے رہیں گے۔ میں اور طاہر کا ساتھی لیٹول کی زور پر قائم تھیں کر لائیں گے۔ وہ ہمیں جھگڑنے چاہیں گے۔ مہنگی حالت میں ہم چاندی کے پاس بھرے ہوئے دیوا لوہو موجود تھے۔ واردات کے لیے رات دس بجے کا وقت طے پایا۔ طاہر کی اطلاع کے مطابق رات دس بجے کے بعد اس پٹرول پمپ کا مالک کدیش گھر لے جا کر صبح بینک میں جمع کر دیا کرتا تھا۔

پلان کے مطابق ہم پٹرول پمپ پر پہنچے۔ دونوں نے موٹر سائیکل قدرے اندھیرے میں کھڑے کر لیے۔ دودھ دوز مک کسی ذی ہوش کا نام پر نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم دونوں قرضائی کے کپڑوں نے اپنی چھبوں میں موجود نقاب سمجھ پر اوڑھے اور پٹرول پمپ کے کمرے میں جا گئے۔ جہاں ایک محنتی ساتھی بیٹھا کدیش گھر لے رہا تھا۔

ناز اور بیکاری کے ہاتھوں ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ بہن کے ساتھ پوڑھی سا مٹی یا پھر ایک دلیر اور دیوانہ۔ بے چاری کو اتان تینوں کا پوچھ بھی اٹھانا پڑا۔ اس کا دلیر بھری ہری بھی قبیل کا تھا جو کما آڑا دیتا۔ خدا جانے میرے ضمیر کو ملک عارف نے کون سی گولی کھلا کر اتنی گہری پینڈ سلا دیا کہ وہ اب بیدار ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن کا زرخیاں نہ آئیں۔ بس میرے دل و دماغ پر تصرف عالیہ۔ کا قبضہ تھا۔

پانچ سات روز میں نے گاؤں میں جیسے تیسے گزارے پھر لاہور میں اپنے بہنوئی کی تیہار داری کا بہانہ کر کے لاہور آ گیا۔ پہلے میں بہن کے گھر گیا۔ بے چاری میرے گلے لگے کہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے دھچھوٹے بچے حیرت سے اپنے ماموں کی شکل دیکھ کر استہ پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہنوئی کی تیہار داری کر کے میں نے اپنی دانست میں گویا والدین کا قرض ادا کر دیا۔

اگلے ہی بعد بہن کے امور کے باوجود میں ملک عارف کے گاؤں کی طرف حاتم سفر تھا۔ اس کا گاؤں لاہور سے ساٹھ ستر میل دور تھا۔ ملک عارف نے مجھے دیکھا تو اس کی پانچھیں کھل گئیں۔

”وہ بھٹی واہ یار جوں تو آئیے۔“ اس نے مجھ سے بھنگی ہوتے ہوئے کہا۔

وہ اس علاقے کے بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ میں تو یہاں اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ ملک عارف مجھے اپنی زمینوں پر جو ملی میں لے آیا۔ یہ جو ملی بالکل الگ تھلک تھی اور میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے صرف عیاشی کے لیے ہی بنائی ہوئی تھی۔ جو ملی کے ایک بڑے کمرے کو جدید شہری سموتوں سے مٹین کیا گیا تھا۔ اس کا ایک خاص مزارع ہمارے لیے جانے کماں سے مروج سیلے کا سامان لے آیا تھا۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ تھی جو رات کی تاریکی میں شراب کی بوتلی سمیت اس جو ملی میں پہنچائی گئی تھی۔ ملک عارف نے مجھ پر احسان بجالاتے ہوئے کہا کہ یہ خصوصی اہتمام اس نے میرے لیے کیا ہے کیونکہ میں پہلی مرتبہ اس کے گھر مکان آیا ہوں۔ یہاں پھر اس نے



بولی: "آپ نے اتنے دن کہاں لگا ہے؟"

میں نے سمجھ لیا کہ بس اب اس پر پیر، بخت کا حادثہ چل گیا ہے۔ ملک عارث، ہمیں کسی بہانے کیلئے چھوڑ کر دو سرے کو رہیں چلا گیا۔ عالیہ نے مجھے اپنے ہاتھوں سے پان لکھایا۔ پھر میری چالانی کارڈ ماروئے گی۔ ملک عارث کی دالچی چند منٹ بعد عالیہ کی ناگواریاں کے ساتھ جوئی۔ عالیہ پائے لائے کے بہانے اٹھ کر چلی گئی۔ ملک عارث نے اس ناگواری سے میرا تعارض کیا۔ اسیر زادے کی حیثیت سے کروایا۔ ناگواری اپنی تربیت کے مطابق مجھ پر صدقہ واری ہوئے گی۔ ملک عارث نے اسے ایک ہزار روپے میری طرف سے "سلام" کا دیا۔ وہ مجھے ساری سیکیم سمجھا کر لایا تھا کہ یہیں یہاں کیا کرنا ہے۔ معاذ آس نے ناگواری سے طے کر لیا تھا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے عالیہ کی گود میں دس ہزار روپے ڈال دیے۔ دونوں ماں بیٹی کی ہاتھیں کھلی گئیں۔ ناگواری نے صدقہ واری کی کسرت سے روپیہ سنبھالے اور بارہر چلی گئی۔

"تم آج اپنی عالیہ کے ناز و خروشے اٹھاؤ۔ میں کل آؤں گا۔" کمرہ ملک عارث کے دروازے سے رخصت ہو گیا۔ شام ڈھلے ملک ناگواری نے سگریٹ اکبھی پان، اکبھی کھانا، اور اکبھی چائے کے بہانے مجھ سے ہزار بارہ سو روپے اور سنبھال لیے۔ پھر ہم دونوں کو اکبھی اچھا چھوڑ کر چلی گئی۔

اس رات عالیہ نے مجھ کو نہیں کیا۔ ساری رات وہ میری ناز پر داری کرتی رہی۔ اس نے مجھے جہانی لذت کے ان اُن جہانوں کی سیر کروائی۔ جو کبھی میرے دہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ اُس نے مجھے بایا کر وہ لوگ جسم فروشی کا پیشہ نہیں کرتے۔ لیکن جو نہ کہہ سکتے ہیں دن اُس نے مجھ اپنے خاوند کی حیثیت سے قبول کیا تھا، اراہے وہ اس کام کو تیار ہوئی۔ اُس نے مجھ سے کہا۔

"جاوید صاحب! خدا کے لیے جہانی جلدی نہ کریں۔ مجھے اس دنیا سے نکال کر

لے جائیے۔"

"اسی کی کیا صورت ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

اُس نے اپنے طوط دروہا لو روڈ کو لے کر اُس کی گھنگی بندھ گئی۔ بھیری ناز و جھٹ کے ہم نے سارے کرنسی نوٹ اپنے پاس موجود خفیہ میں منتقل کر لیے اور اُسے دھکی دی کر اگر اُس نے ہمارے جانے کے بعد شورو مچا تو ہم اُسے پڑوں پسپ سمیت دھکا سے اڑا دیں گے۔ اُس کے دو ملازم اندر موجود صورت حال سے بالکل بے خبر باہر سروری میں ٹھکڑے رہے۔

جانے سے پہلے میں نے سارے کے سارے کے مطابق یہ بلیغیوں کے تار چھٹکے سے توڑ دیے۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ ہمیں باہر آتے دیکھ کر دونوں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر لیے۔ نوٹوں والا خفیہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ملک عارث کے پیچھے جا بیٹھا۔ ہمیں اس طرح جھانکے دیکھ کر ملازموں کو شک گزرا اور انہوں نے شور مچا دیا۔ لیکن اب ہم ان کی دسترس سے باہر تھے۔ ظاہر کے تعاقب میں ہم نے اس ملازم کی امدادی کی مختلف گلیوں میں اس طرح موٹر سائیکل گھمیں کہ کسی کو ان کا نشان خبر نہ ہو سکی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم دوبارہ ظاہر کے گھر پہنچ چکے تھے۔

"ویل ڈن" ظاہر نے کمرے میں پہنچتے ہی مجھے شاباش دی۔

انہوں نے اپنے گھر سے چھپانے کے لیے سوروں پر سائیکل ڈال رکھے تھے۔ سب کے سامنے ملک عارث نے بیٹھے گئے۔ ہماری توقعات سے بڑھ کر یہ ساٹھ ہزار سے زیادہ کی رقم تھی۔ رقم ہم نے آپس میں تقسیم کر لی۔ مجھے انہوں نے پانچ ہزار زیادہ دیے تھے۔

میں اُن کو حاکم علیہ کیس میں چاہتا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے سبر کی تلقین کی۔

وہ رات ہم نے اسی کمرے میں گزار دی اور اگلی صبح وہاں سے نکل گئے۔ اس مرتبہ ہم ملک عارث کے ایک دوست کے گھر پہنچے۔ جہاں ہم نے پڑے دفتر تبدیل کیے اور ناؤ شکر کے عالیہ کے ڈیرے کی طرف چل دیے۔

عالیہ نے مجھے اور ملک عارث کو دیکھا تو غور جانے ملک نے اُسے کیا اشارہ کیا کہ وہ جہاں کرنا چھوڑے لیٹ گئی اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں۔ وہ وہاں سے لیے لیے



میں بیٹھیں گے۔ مجھے اہل گھر کو کہہ کر قسم والا دیکھنا تھا۔ ماحولیت کی صورت میں پستول میرے پاس بھی موجود تھا اور کلکتہ رقبہ کی صورت میں دونوں مسلح اہل گھر کے میرے مددگار ہوتے۔ پھیلاہم نے کار میں پھینک دینا تھا۔ وہ لوگ الگ راستے سے فرار ہوتے اور میں ملک عارف کے ساتھ دوسرے راستے سے۔ ہم نے فرار ہو کر کہاں جانا تھا۔ اس کا علم طاہر یا ملک عارف کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔

مجموعہ اسی اثنا میں فاضی مشن بھی کر رہا تھا۔ راسطہ سے دوائے دن منصوبہ کے مطابق ہم نے کام شروع کیا۔ خاصہ پتہ رشتہ ملا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے منصوبہ پر تیار کرنے سے نہ اس بات کو ذہن میں رکھا ہو گا۔ وہ شخص کلکتہ سے کربنک سے اپنی کار کی طرف چلا جو بنگلہ کے دروازے کے سامنے ہی پارک کی گئی تھی جیسے ہی وہ بنگلہ سے برآمد ہوا ملک عارف نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کلام شروع کرنے کو کہا۔ میں نے منہ پر نقاب لگایا اور اس کی طرف پستول تان کر اسے بنگلہ دیکھنے کو کہا۔

اودی کوئی اتنا بہادر نہیں تھا۔ لیکن مضبوط قوت ارادی کا مالک نظر آتا تھا اس نے اپنی گرفت بنگلہ پر مضبوط کر لی اور بنگلہ کی طرف داییں بھاگ جایا اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ چکر بارگہ مدد حاصل کر سکے گا۔

”جیسے جالے تو دینا،“ ملک عارف نے مجھے ملکارا۔

میں نے آؤ دیکھا تو آؤ جھپٹ سے گولی داغ دی جو خوش قسمتی سے اس کی کمر میں لگی اور وہ گر پڑا۔ اس اثنا میں میرے ہوا میں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میں نے بنگلہ اٹھایا اور کار میں پھینک دیا۔ خود پھرتی سے ملک عارف کے پیچھے جا بیٹھا۔ اس دوران ملک عارف نے بھی دو فائر کر دیے تھے۔ لوگ فوراً فرار ہو جانے کی طرح ادھر اُدھر پھرتے پھرتے چھپ چھپ کر رہ گئے۔ جیت تو مجھے اس بات پر تھی کہ بنگلہ کا چکر بارگہ کسی کمر اندر بھی لٹھا ہوا۔ حالانکہ اگر کوئی جیت کرتا تو ہم شاید کامیاب نہ ہوتے۔

”اس کی مرثیہ ایک ہی صورت سے جاوید صاحب کی میری ماں کا منہ ہوتے کے نوالوں سے بھر دیکھیے۔ وہ جو بنگلہ کی میری کل قیمت وصول نہیں کر سکی۔ مجھے اس گناہ کی دلدل سے نکلنے نہیں دے گی۔“ اس نے وہ بانسی آواز میں کہا۔

میں نے کہا، ”عالیہ تم مطمئن رہو۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگانے لگا۔“

عالیہ صبر کر رہی تھی۔ اس منگڑ طوالت نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس نے مجھے اچھی طرح شیخ میں آ کر لیا ہے اور اب میں یہی کر کہیں نہیں جا سکتا۔

صبح میں رکتہ نہیں کر سکا۔ عارف کے ٹھکانے پر آ گیا۔ اب میرا خوف اثر چلا تھا۔ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ بس مجھے دولت چاہیے تھی۔ ملک عارف نے مجھے کہا کہ انہوں نے آپ کی مرثیہ ذرا لمبا ہاتھ مارنے کا ارادہ ہے۔

”کیا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”اس مرثیہ خزانہ کو لٹا ہے۔ ایک آدمی پندرہ بیس لاکھ روپے لے کر بنگلہ سے باہر نکلے گا۔ ہم نے اس سے پیسے چھیننے ہیں۔“ ملک عارف نے بتایا۔

”وہاں ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ رات کو بنگلہ بند ہو جاتے ہیں۔“

ہم دونوں تہہ تیہ کر کر منتیں دیں۔ اس بات کا اندازہ مجھے ہو چلا تھا کہ عارف اس میدان کا کچھ انکاٹا نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے گروہ میں تبدیلیاں کرتے دھبے تھے۔ اس مرثیہ خزانہ کا کام ذرا زیادہ ہی سخت تھا۔ اس میں میرے علاوہ طاہر اور دو اور لڑکے شامل تھے گویا ایک طرح سے ہم پانچ آدمی ملی کر یہ کام کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے ایک کار اور ایک موٹر سائیکل استعمال کرنی تھی۔ منصوبہ کچھ اسی طرح تھا کہ کار میں موجود تین لڑکوں میں سے دو پستول سے کارباری مدد کے لیے اہم کوششیں کریں گے۔ ڈرائیور کار کا ڈرائیور ہو گا۔ موٹر سائیکل پر بنگلہ عارف اور



ن لیا۔ والد بشفہ سے کہیں سی ٹی وغیرہ کرلوں۔ لیکن میں نے "اعلیٰ تعلیم" کی صنف  
 شروع کر دی۔

اگلے روز یہ منحوس خبر میرا ہندوئی فوت ہو گیا ہے۔ ہم سب لاہور چلے آئے۔  
 بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن میرے چیلے بے غیرت اور بے ضمیر انسان نے اسے  
 محسوس نہ کیا۔ والدین سات آٹھ روز بعد واپس چلے گئے اور میں کسیدھا عالیہ  
 کے ڈیرے پر۔

جب میں نے اس کے سامنے ۱۰ ہزار کی رقم رکھی تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں  
 اس کی ناک مال نے میرا ہاتھ اور سر و جنوں تر تہہ چوما۔ رقم اپنے قبضہ میں کی اور  
 بیٹی مجھے سونپ دی۔ یہاں چارپائی روز میں مروج میلہ کرتا رہا۔ اس دوران عالیہ  
 نے مجھے سرور ولذت کے بہت سے جہانوں سے آشنا کی بہم پہنچا دی تھی۔ جب  
 حبیب عالی ہونے لگی تو والدین چلا آیا۔

میں نے بی۔ اے میں بھی اسی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ملک عادت ایملے کا طالب علم  
 بن چکا تھا۔ ہمارا حصد اب کچھ زیادہ ہی کھل گیا۔ ہم نے مل کر دو تین پٹرول پمپ  
 لوٹے۔ عالیہ نے مجھے جو بھیہ لگا دیا تھا اس کے لیے میں کچھ بھی کر گزرنے کو تیار  
 تھا۔ اس دوران میں نے بنگلے کے کچھ پردہ بین سیاسی جلسوں میں بھی "خدمات"  
 انجام دیں۔ میں ملک عادت کو اکثر لکھتا تھا کہ یہ کس جنت ہم سے تھہ کہیں لیتا ہے؟  
 ایک روز ہم گئے الگ سے پروگرام بنایا۔ اس منصوبے میں ملک عادت اور اس  
 کا ایک بد معاش ساتھی ہمارے ساتھ شامل تھا۔ ہم نے اس مرتبہ ایک کوچ کو لوٹنے  
 کا پروگرام بنایا تھا۔ منصوبے کے مطابق ہم کوچ کے مسافروں میں شامل ہو گئے اور  
 لاہور سے باہر نکلنے پر ایک ویران جگہ اٹھ کر میں نے ڈاکٹور کی کنبٹی سے پستول  
 نکال دیا۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے رائفلیں تان کر مسافروں کو ڈکٹو شروع کر دیا۔  
 ہندوہ بیس رشتہ بعد ہم اپنے کام سے فوریہ ہو چکے تھے۔ ہم نے مسافروں  
 کو واپس اتار دیا اور کوچ میں قمر ہونے لگے۔ بد قسمتی تھی یا خوش قسمتی کر لیس

ملک عادت کے سفر کا اختتام بنگ صاحب کی کوکھی پر ہوا۔ کار دار نے ساتھی دہاں  
 پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ میں نے ہیرا لگی سے ملک عادت کی لڑت رکھا۔

"جید سے خاں" ہم اس آدمی کے بغیر زبرد ہیں۔ اس کو سر کا ہم میں جیتہ دینا  
 پڑتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ہاتھوں دوسرے آدمی کو گولی لگی ہے  
 اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھنا۔" اس نے مجھے باتوں باتوں میں سب کچھ سمجھا دیا۔  
 تھوڑی دیر بعد ہم بنگ کے سامنے موجود تھے۔ اس نے ہمیں فی کس ۵۰ ہزار

سر پیشہ دیا اور ہم جب چاہا وہاں سے چلے آئے۔ کسی نے معمولی سا احتجاج بھی  
 نہیں کیا۔ بنگ میرے ساتھ اسی طرح پیش آ رہا تھا۔ مجھے مجھے پہلی مرتبہ لاہور میں  
 نے بھی اس بات پر توجہ نہ دی۔ میں ملک عادت کے ساتھ اس کے گاؤں چلا  
 آیا۔ لیکن اس بات پر کہ ہتھار کر ساری رقم وہ کس جنت خود ہستم کر گیا اور  
 ہم جو اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔ ہمیں اس نے گھاس تک نہیں ڈالی۔ جب میں  
 نے عالیہ کی طرف جانے کو کہہ کر ملک عادت نے فی الوقت جانے سے منع کر دیا۔

"بچہ سے خاں فرما دیا کچھ استعمال کرنا سیکھ لو۔ شہر میں اتنی بڑی  
 واردات ہوئی ہے پولیس شکاری کتوں کی طرح ہماری بوسہ گھنٹی پھر رہی ہے۔ اس  
 بانار پر پولیس کی خاص نظر جوتی ہے۔ کیونکہ پولیس والے جانتے ہیں کہ ہم  
 چیلے رول ادھر کا ہی شرح کریں گے۔ ہر ڈیرے پر پولیس کے چڑھو جو دھوتے ہیں  
 اور ہم....." یار تم کہیں ہم سب کو مر وارتہ دینا۔" اس نے اگڑے اگڑے لیے  
 میں کہا۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب جیسا آپ بہتر سمجھیں۔" میں خاموش رہا۔

ملک عادت کے ہاں میں نے پانچ چھ روز خوب ہی کشتی کی چیرا پیچے گاؤں چلا  
 آیا۔ جہاں وہ پندرہ دن تک میں نے کسی کو رقم کی کانوں کان ہونا نہ لگنے  
 دی۔ اس روز میرے ایف اے کے پیچھے کا اعلان ہوا تھا۔ میری اس مرتبہ بھی  
 سیکرٹ ڈویژن ان کی تھی۔ بہر حال میری مل خوش تھی کہ میں نے ایف اے



ابن نے عالیہ کو پیغام بھیجا تھا۔ جس نے مجھے پہنچانے سے انکار کر دیا اور اس کے ڈیرے والوں نے میرے قاصد کی اتنی بے عزتی کی کہ اب جیل کا کوئی لازم میری کوئی بات ہی سننے کو تیار نہیں۔ زندگی کا یہ جہنم میں اب تیسرے درجے کے ایک قیدی کی حیثیت سے جھکتا ہوں۔

کی ایک گشتی جیپ اچانک ادھر آنکلی۔ مسافروں نے دھائی چائی تو وہ لوگ ہمارے تعاقب میں آ گئے۔ انہوں نے وارنٹ لیس پر آگے بھی اطلاع کر دی تھی۔ میں ابھی اتنا سراسر مابین بناتھا کہ پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا۔ نہ ہی میرے ساتھیوں میں کوئی اس قابل تھا۔ ہم نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ پولیس نے الگ الگ ہماری تعقیب شروع کی۔ میرے بھی بڑوں نے قتل نہ نہیں دیکھا تھا۔ میں تو دہ چار چوتے لکھ کر ہی "چالو" ہو گیا۔

قتلے میں پہلے ہی روز جب صبح ہماری تصویریں اخبارات میں چھپیں تو ایک شخص ہماری ملاقات کو آ گیا۔ وہ سیدھا مجھے آکر ملا اور کہا کہ مجھے عالیہ نے بھیجا ہے۔ میرا دل بیٹوں اچھلنے لگا۔ عالیہ نے پیغام بھیجا تھا کہ میں بے فکر رہوں۔ وہ میری ہر طرح مدد کرے گی۔ اس شخص نے مجھے کہا اگر مرد کے بچے ہو تو اپنی مجموعہ کو قتل نہ بلانا۔ میری سوتی غیرت عالیہ نے جگا دی۔ حالانکہ یہ بھی آٹان لوگوں کی چال تھی۔

اس دوران پولیس نے تار لیا تھا کہ میں کنزور آدمی ہوں۔ انہوں نے مجھے سلطانی گواہ بننے کا لالچ دیا اور میں لالچے میں آ گیا۔ میں نے بلا کم و کاست سارے واقعات بیان کر دیے۔ بس عالیہ اور بیگ کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ بیگ کی طاقت کا مجھے اندازہ تھا۔

میں جیو ڈسٹری بیوٹر بہرہیل بھیج دیا گیا۔ والدین کو علم ہوا تو گھر میں صحت نام کچھ گئی۔ مجھے گرفتاری کے بعد احساس ہوا کہ میں نے کس جہنم کی آگ کا خود کو آئندہ سن بنا لیا تھا۔ ستمبر چلا اور تین ماہ بعد ہی ایک خصوصی عدالت نے مجھے دس سال قید کا حکم سنایا۔ میرے ساتھیوں کو بھی سزائیں دی گئیں۔

مجھے تیل میں دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس دوران سوائے بوڑھے والدین اور بیوہ بہن کے اور کوئی مجھے ملنے نہیں آیا۔ ایک خاص آدمی کے ذریعے